

# مرآة الغالب

حضرت قالیب علیہ الرحمۃ کے اردو دیوان کی مکمل

شرح

— (از) —

جناب سید عبدالدین صاحب دیوبند معروف بہ نقشبندی عارف و فاضل

— (ناشر) —


عثمانیہ بک ڈپو، دارالرحمت پور روڈ، کلکتہ

# مرآة الغالب

حضرت غالب علیہ الرحمۃ کے اردو دیوان کی مکمل

شرح

— (از) —

جناب سید وحید الدین صاحب بیخود مرحوم جانشین حضرت 

— (ناشر) —

عثمانیہ بک ڈپو ۱۰۴ الورحیت پور روڈ کلکتہ ۷۳

جملہ حقوق بذریعہ رجسٹری جناب آغا محمد طاہر صاحب  
محفوظ ہیں

بہ اجازت  
جناب آغا طاہر صاحب بنیرہ حقیر آزاد

ناشر  
عثمانیہ بک ڈپو  
بلا لورجیت پور روڈ - کلکتہ ۷۰۰۰۱۷

2000 ء

مطبوعہ

ایم۔ اے۔ پرنٹرس، دہلی

جب زمانے نے حضرت ذوق و موسن سے سند سخن خالی پایا اور نظم کا چراغ گل ہونے لگا تو آسمانی برکتوں کو آخر بار بصد التجا بلایا اور عروس سخن کو بنا سنوار کر فارسی کے ملک الشعراء مرزا نوشہ کے سامنے لا بٹھایا۔ خدا کی قدرت ہے کل تک جس کا کلام گویم مشکل و مگر نہ گویم مشکل تھا، آج اُس کے سامنے زبان بھی سرنگوں ہے۔ محاورہ بھی باتھ باندھے کھڑا ہے۔ وہ اسحٰیج کی غیر مانوس ترکیبیں بھی اُلجھ اُلجھ کر سلجھ گئی ہیں جس کے لئے خود اپنا اُردو کلام باعث تنگ تھا۔ آج باعث فخر ہے۔

حقیقت بھی یوں ہے کہ دہلی کا وہ زمانہ جس میں یہ حضرات جلوہ افروز ہرزم آؤ تھے نظم کی دنیا میں بہترین زمانہ تھا۔ یا یوں کہئے کہ میردستودا نے جو بیوند لگائے تھے اُن پر دوں میں اب چین آرہے تھے۔ ان میں سے ہر شخص بذات خود ایک انجمن اور مشاعرہ تھا۔ ہر ایک کی زبان فرنگ آصفیہ کی کان تھی۔ دہلی کی آخری ادبی بہار کے افسانے میں اکثر ایسے نام نظر آتے ہیں جن کا نظیر ہم اب تک پیدا نہیں کر سکے نہ اُسیدے کہ نظم کی کان سے ایسے لعل بے بہاد و بارہ پیدا ہوں گے۔

اللہ اکبر۔ دہلی نے ایک وہ وقت دیکھا ہے جب کہ تلج ملک الشعراء کی حضرت ذوق کے سر پر چھکتا تھا۔ اور زبان کی صفائی اور محاورہ کی چستی انتہا کو پہنچائی جا رہی تھی اور معنی آفرینی کی اقلیم پر حکیم مومن خاں صاحب موسن کی حکومت تھی



جن کی نازا، مزاجیاں ہمیشہ سے پتھر کو توڑ رہی تھیں، عروس سخن کے دو لہا مختصر  
 ظفر تھے کہ برائیں سخن آرائی پر ایک نیا رنگ اور حاشیہ چڑھا رہے تھے۔  
 مرزا اسد اللہ خاں صاحب غالب اگرچہ فارسی میں ملبھوری اور نظری سے اونچے  
 اڑتے تھے اور ریختہ ان کی آنکھوں میں گرد سے زیادہ وقعت نہ رکھتا تھا مگر اساتذہ  
 بلند پروازیاں۔ احباب کی فرمائشیں زمانے کی رفتار ان کو بھی اس انجمن میں لئے چلی  
 آئی تھی۔ ان کے علاوہ مفتی صدر الدین خاں صاحب آذرہ، حکیم آغا جان عیش غلام علی  
 خاں صاحب وحشت۔ نواب مصطفیٰ خاں صاحب شیوہ۔ نواب ضیاء الدین احمد خاں صاحب  
 نیر، حافظ غلام رسول دیران۔ حافظ غلام رسول صاحب شوق۔ حضرت طاہرہ حضرت  
 انور۔ حضرت مجروح۔ حضرت زین الدین صاحب عارف۔ حضرت معین۔ حضرت شبیر۔  
 حضرت دارغ۔ حضرت سالک۔ مولوی عبدالکریم صاحب سوز۔ مرزا قادر بخش صاحب  
 صابر۔ میاں خورشید۔ میاں مشتق تھے۔ اور ان کے علاوہ سارا شہر ایک برات تھی  
 جو رات دن اردو نظم کے بیاہ رہ جاتی تھی اور نئے سے نیا گل کھلاتی تھی اور زبان بجائے  
 ریختہ اور ریختی کے زبان اردو کھلانے لگی تھی۔

افسوس جب اُن میں سے بہت سے چراغ بجھ گئے تو اردو بے سرپرست کے  
 رہ گئی۔ قدرت کی نظر انتخاب اس شخص پر پڑی جس کو اس زبان میں شعر کہنا اور پڑھنا بھی  
 عار تھا مگر آفریں ہے اس اسطوخن پر جس وقت یہ بوجھ اس کی گردن پر رکھا گیا تو  
 اس طرح ہنسیا لگایا اُن کا اپنا مال تھا اس کی ذاتی دولت تھی جو واپس آگئی اس تئیر  
 کو اگر مجوزہ نہ کہیں تو اور کیا کہیں۔ مگر مرزا کے کلام کو تقسیم کیا جائے اور غدر سے کچھ  
 دنوں پہلے کا کلام الگ کر لیا جائے اس وقت معلوم ہو سکتا ہے کہ مرزا اردو میں شعر کہتے  
 ہیں یا فارسی میں مگر جو ہم ان کے ہمعصر شعراء کے طعن آمیز اشعار مرزا کی نسبت  
 سن کر چونک اُٹھتے ہیں اس کی حقیقت اس وقت معلوم ہو۔ مگر جب اردو کی

لمک الشعرائی اور سرپرستی خود انھیں کے سر پر رکھی گئی تو آنکھیں کھل گئیں۔  
اس وقت زبان میں تیز پیدا ہوا۔ میر و ذوق کی زبان اشعار میں نظر آنے  
لگی۔ معنی آفرینی جو موسیٰ خاں صاحب کے قابو سے بھی نکل جایا کرتی تھی اب صاف  
معاورہ میں کھپ گئی اور شاعرانہ فلسفہ اُردو میں نکلیں کو پہنچا۔

غدر کے کچھ دنوں بعد حبیب مرزا کی شاعری نے اپنا پورا سکہ لوگوں کے دلوں  
پر بٹھایا اور شیرینی زبان، لطیف سخن نے ہر طرف مرزا کا ڈنکا بجایا اور مرزا کے  
اُردو کلام کی بھی ہلک شروع ہوئی تو مرزا کے احباب نے اُردو دیوان چھپوانے کا  
قصد کیا مگر سارا دیوان چھپوانا بہت خطرناک تھا۔ لہذا انتخاب کیا گیا اور یہ سترہ سو  
اشعار کا انتخابی جلد سترہ کٹ چھٹ کر سروہسی بن کر نکلا اور سارے ہندوستان میں  
پسندیدگی سے دیکھا گیا۔

مگر وہ زمانہ ایسا انقلاب خیز تھا کہ اچھے اچھے نقش مٹ گئے۔ فارسی جس نے  
ہندوستان میں آکر سب پر پُرس درست کئے تھے مسلمانوں کی حکومت کے ساتھ  
فنا ہو گئی۔ اُردو و بچہ زبان۔ بازار سی زبان۔ اس میں فلسفہ، حکمت، اخلاق، عشق  
کے انتہائی جند بات کہاں۔ کیونکہ اس کے بولنے والے اور سمجھنے والے عام لوگ جن میں  
یہ باتیں مفقود تھیں مرزا کا دیوان اپنی خصوصیات کی وجہ سے نہیں بلکہ شیرینی زبان  
اور انداز بیان کی وجہ سے پھیلا اور زندہ رہا۔

اس زمانے میں دو قسم کے لوگ مرزا کے اُردو دیوان کو پڑھتے تھے۔ اول  
وہ طبقہ جو مرزا کی فارسی شان سے آشنا تھا اور ہر طرح مرزا کی باتوں اور نکتوں کا عاشق  
تھا۔ دوسرے عام اُردو غزل خواں حضرات جو مرزا کو اُردو کا سب سے بڑا شاعر۔  
مشکل پسند شاعر۔ غزل گو شاعر ہونے کی حیثیت سے دیکھتے رہے۔ آخر پہلا طبقہ فنا  
ہو گیا۔ دوسرے طبقہ نے زیادہ ہاتھ پاؤں پھیلائے اور پڑھنے کے ساتھ سمجھنے کی

بھی کوشش کی جس کے لئے عام طریقہ یہ اختیار کیا گیا کہ جو مرزا کے کلام کا شائق ہوتا وہ پتہ لگاتا کہ اس وقت مرزا کے کلام کا مفسر کون ہے۔ اس سے پڑھتا اور دوسروں کو بھی پڑھاتا۔

مگر جب تعلیم کے چرچے عام ہوئے اور ان چیزوں کی طرف ہر طرف سے نگاہیں ہاتھ بڑھنے لگے تو اس وقت بعض حضرات نے شرح کی ضرورت سمجھی اور نگہیں بھی گئیں جن میں سے مشہور جناب نواب حیدر یار جنگ طباطبائی کی ہے۔ وہ ہماری خوش قسمتی کی وجہ سے ہم میں موجود ہیں۔ ورنہ وہ تو طبقہ اعلیٰ کے انسان ہیں۔ لہذا نئی روشنی کے خیالات کا انہوں نے بہت کم خیال رکھا اور اکثر اجتہاد سے کام لیا۔ دوسری جناب شوکت نیرنگی نے شرح نگہیں مگر وہ شاید دو صدی پہلے کے شاعر تھے، خدا جانے کیا کیا کہہ گئے۔ ان کی شرح خود اپنی ایک شرح چاہتی ہے۔

مولانا حاکمی نے یادگار میں اکثر اشعار کو اس طرح بیان کیا جس طرح حق تھا مگر مکمل شرح نہیں ہے۔ شاعری پر ریویو کرتے کرتے کہہ دیئے ہیں۔ بعد میں فٹ نوٹ کی شان سے جناب نظامی بدایونی حضرت حسرت موہانی حضرت سہیل نے شرحیں نکالیں جنہوں نے بہت کچھ آسانی اور سہولت ہم پہنچائی اور اشتیاق کے جذبہ میں آگ لگائی اور ہر طرف غائب ہی غائب آوازیں آنے لگیں۔

گزشتہ سال مجھے دہلی جانے کا اتفاق ہوا تو ایک جگہ حضرت غائب کا ذکر ہو رہا تھا اور اشعار پر بحث تھی۔ احباب اس کے مختلف معنی بیان کر رہے تھے۔ بعض جگہ دہلی کے خاص محاورے پر تذکرہ تھا۔ اکثر مروجہ شرحوں سے سند لاتے تھے۔ ایک صاحب جناب یحیٰو صاحب کی طرف اپنے منہوں کو منسوب کرتے تھے جو قرین قیاس اور افسوس تھے۔ اس دن مجھے خیال آیا کہ مرزا غائب دہلی کی جان۔ اُردو کی جان پھر اب تک کسی دہلی والے نے شرح نہیں کی۔ اگر ایسا ہو جائے تو ضرور بہتر صورت پیدا

ہو جائے گی اس کا تذکرہ کئی جگہ کیا گیا۔ اکثر اصحاب نے جناب حاجی سید وحید الدین صاحب بخود جانشین حضرت داغ کا نام تجویز کیا اور کہا کہ اس وقت مرزا کے دیوان کے مفسرین۔ شاید ان کے بعد دہلی میں ایسا آدمی میسر نہ آئے۔

اس خیال کے آتے ہی میں آغا حیدر حسن صاحب قدس شاگرد رشید جناب بخود صاحب کو ساتھ لے کر پہنچا اور اپنا نشانہ ظاہر کیا۔ حضرت بخود کی حالت یہ ہے کہ دلی انگریزی حکومت کی ناز آفرینیوں کی جولا نگاہ ہے مگر اردو کے حق میں محرا ہو گئی تو اسی آبڑی بستی میں حضرت بخود سجادہ ادب بچھائے قناعت کے گوشہ میں درس و تدریس کے سلسلہ سے قیام رکھتے ہیں۔ ہاتھوں میں اس قدر رشہ ہے کہ اپنا نام دونوں ہاتھوں سے قلم تمام کر بمشکل تحریر فرماتے ہیں۔ انھوں نے ہر چند ان باتوں کا عذر فرمایا مگر میں نے اور ان کے حلقہ ملازمہ نے آخر ان کو منایا اور ایک کاتب ملازم رکھ کر یہ شرح لکھنی شروع کر دی۔

اس شرح کی اشاعت کے لئے سب سے پہلے خدا کا شکر ادا کرتا ہوں۔ دوسرا حضرت بخود صاحب کا شکر یہ۔ مگر وہ میں کیا ادا کر سکتا ہوں۔ اہل زبان اہل ملک ادا کریں۔ میں تو خود ہمیشہ فخر کیا کروں گا کہ میری ناچیز کوشش سے یہ گراں بہا چیز تیار ہو گئی اس کے ابتدا میں حضرت بخود صاحب کا وعدہ تھا کہ مرزا کی اردو شاعری پر ایک مقدمہ لکھوں گا مگر شاعرانہ نازک مزاجی نے اردو دونوں کو اس سے محروم کر دیا خلیہ آئندہ کرم کی نگاہ ہو جائے تو تحریر فرمادیں۔

مرزا کے اردو کلام پر مقدمہ لکھنا میرا کام نہیں۔ نہ شاعرانہ حیثیت سے نہ فلسفیانہ شان سے۔ کیونکہ یہ دونوں باتیں بہت بڑی ہیں حضرت بخود نے شرح کو عام فہم بنانے کی جس قدر کوشش کی ہے اگر مقدمہ بھی ساتھ تحریر فرمادیتے تو بہت کچھ امداد ملتی۔

حضرت یحیٰ و صاحب کی شرح زیادہ تر اسی خیال سے چھپوائی گئی ہے کہ شاعرانہ ترکیبیں زبان کے نکلتے۔ دلی والوں کا خاص طرزِ ادا۔ عشقیہ جذبات سب عام فہم ہو جائیں۔ اور کوئی بات سوائے یورپین فلسفہ کے باقی نہ رہے سو وہ میدان ابھی بہت وسیع ہے۔ ڈاکٹر عبدالرحمن مرحوم نے ابھی ابتدا کی ہے۔ خدا ہمارے ملک میں ایسے ہونہار پیدا کرے کہ اس کی فلسفیانہ شرحیں لکھیں اور اس چھوٹے سے دیوان کو آسمانِ ادب پر پہنچا دیں۔

یہ شرح انشاء اللہ ہر سمجھدار اور ذی حس انسان کو اس کے حقیقت میں باند پر دازی کرنا سکھائے گی۔ اور غالب کے سمجھنے کے علاوہ وہ اپنے آپ کو بھی سمجھنے کے قابل ہو جائے گا، انشاء اللہ +

دعا کا محتاج  
طاہر نمبرۃ حضرت آزاد

۱۲ مارچ ۱۹۳۵ء

# بسم اللہ الرحمن الرحیم

## غزل

نقش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا  
 مطلب یہ ہے کہ سستی موجب طلال و آزار ہے بسبب ناپائیدار اور فانی ہونے کے۔ تشریح یہ ہے  
 کہ نقش عالم یعنی موجودات عالم فریادی ہے نقاشِ ازل کی شوخی تحریر کا (فریادی کا لباس قلم  
 دستور ایران کے موافق کاغذ کا ہوا کرتا تھا جس طرح ہندوستان میں فریاد کرنے والے دن کو  
 مشعل جلا کر لاتے تھے یا عرب میں مقتول کا لباس پر چھپے پرکھ کر قصاص لینے کے لئے جاتے  
 تھے) شوخی کے معنی میں قیام پذیر نہ ہونا۔ اور قیام پذیر نہ ہونا ثابت ہے تصویر کے کاغذی  
 پیرہن ہونے کے یعنی عام دستور ہے کہ تصویر کاغذ پر تصویر کشی جاتی ہے اور کاغذ جلد بگڑ جانے والی  
 چیز ہے ہر پیکر تصویر سے مراد جلد حیوانات، جمادات، نباتات سے ہے۔ اور یہ ساری چیزیں فنا  
 ہونے والی ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے پھول دن بھر میں کھلا جاتا ہے۔ انسان کی موت کا کوئی  
 وقت مہین نہیں ہے۔ لکڑی تیرہ۔ دھات کی مٹی ہوئی اشیاء بھی انجام کار سیکار اور خاکستہ  
 ہو جاتی ہیں۔ جب موجودات عالم کا یہ حال ہو تو نقشِ سستی کا اپنی ناپائیداری اور بے ثباتی پر  
 فریادی ہونا شاعر کے بلند خیال اور غیر معمولی جدت کا ثبوت کامل ہے میری رائے میں شعر  
 معنی خیز اور خیال ایک اچھوتا خیال ہے اس شعر کو بے معنی کہنا انصاف کا خون کرنا ہے۔  
 کاؤ کاؤ سخت جاں نہا کے تنہائی نہ چھو صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا  
 کاؤ کاؤ کے معنی کاؤش اور کاؤش کے ہیں مرزا صاحب فرماتے ہیں فریاد کے واسطے  
 حسب فرمائش خیریں ہوئے شیر کا لانا اس قدر دشوار اور مشکل نہ تھا جس قدر ایک عاشق  
 وصل طلب حتماً نصیب کے لئے شبِ فراق کا کھرکنا اور وہ بھی سخت جانی کی حالت میں مہین  
 سخت جانی نے مر جانے کی امید بھی قطع کر دی ہے مراد کے واسطے کوہ بے ستون کا کاٹنا

ایک شکل تنہائی تھا۔ عاشق کو تنہائی کی رات کا کاٹنا صدمہ جاں گسل ہے۔  
 جذبہ نے اختیار شوق دیکھا چاہے سیدہ زخم شیر سے باہر ہے دم شمشیر کا  
 دم شمشیر آبداری شمشیر کو کہتے ہیں اور آب ہمیشہ بارہ کے باہر کے حصہ پر ہوا کرتی ہے۔  
 عاشق آب شمشیر کا سیدہ زخم شیر سے باہر ہونا اپنے جذبہ بے اختیار شوق کی دلیل بتاتا  
 ہے اور دعویٰ متضمن دلیل واقع ہوا ہے۔ شعر کے آبدار ہونے میں کس کو کلام ہو سکتا ہے۔  
 آگہی دام شنیدن جب قدر چاہے بچھا۔ مدعا اعتقا ہے اپنے عالم تقریر کا  
 آگہی کے معنی اطلاع یا بی اور خبر داری کے ہیں مطلب شعر کا یہ ہے کہ سامع کی اشعار بھی کا  
 شوق صیاد بن کر جس قدر چاہے فروب کے جال بچھائے مگر میرے اشعار کا مطلب طائر  
 عنقا صفت ہے جو کسی کے دام فروب میں پھنستا ہوا معلوم نہیں ہوتا یعنی میرا کلام مراسر  
 اسرار غیبی ہے۔ عام فہم نہیں ہے جو ہر کس و ناکس سمجھ سکے چنانچہ مرزا صاحب اردو  
 کے ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں "شعر گوئی مضمون نگاری کا نام ہے۔ قافیہ پر پائی گو  
 شعر گوئی نہیں کہتے۔"

بسکہ ہوں غالب اسیری میں بھٹی آتش زیر پا۔ مومے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا  
 آتش زیر پا بے قرار و مضطرب ہونے کا استعارہ ہے حلقہ زنجیر کا گرمی و مشت سے مومے  
 آتش دیدہ بن جانا جتا رہا ہے کہ اب زنجیر زنجیر نہیں رہی ہے یعنی مجھ کو قید کرنے کے لئے  
 زنجیر کافی نہیں ہے قاعدہ ہے کہ بال کو جب آگ پر رکھا جاتا ہے تو وہ آگ کی گرمی سے  
 مرجھا کر حلقہ کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور بودا ہو جاتا ہے مرزا صاحب فرماتے ہیں۔  
 حلقہ زنجیر میری گرمی و مشت کے مقابلے میں مومے قاعدہ سے زیادہ ناپاؤدار ہے۔  
 زنجیر کی کڑیوں کو مومے آتش دیدہ سے تشبیہ دینی نئی طرح کی جدت ہے۔

غزل

جُز قیس اور کوئی نہ آیا برئے نگار  
 صحرا نگر بہ تنگ چشمِ حسود تھا

فرماتے ہیں۔ قیس کے سوا مرد میدانِ عشقِ کامل پیدا نہ ہوا۔ شاید اس کا سبب یہ ہو کہ صحرا  
 چشمِ حامد کی طرح تنگ تھا جس میں گنجائش ہی کسی دوسرے عاشق کی نہ تھی۔ مطلب شعر  
 کا یہ ہے قبلہ عام میں سے پھر کوئی قیس جیسا عاشقِ کامل پیدا نہ ہوا جو دشتِ نجد کو آباد کر۔  
 آشفتنکی نے نقشِ سوید کیا درست ظاہر ہوا کہ داغ کا سرمایہ دو دھتھا  
 آشفتنکی پریشاں حالی اور پریشاں خیالی۔ سوید سودا کی تصویر۔ دل پر ایک کالا دھبہ  
 ہوا کرتا ہے مرزا صاحب فرماتے ہیں۔ میرے دل پر جو نقشِ سوید ہے وہ میری آشفتن  
 حالی کا پیدا کیا ہوا ہے۔ یعنی میں نے جو پریشاں حالی میں افشائے راز کے خوف سے  
 دھواں دھار آہیں ضبط کی ہیں اُس سے میرے دل پر یہ داغ چڑھ گیا ہے چنانچہ دھوئیں  
 سے سیاہ داغ پیدا ہو جایا کرتا ہے۔ اس سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ داغ کی پونجی دھواں تھی۔  
 تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ جب کچھ کھل گئی نہ زباں تھانہ سو رہا تھا  
 مطلب یہ ہے کہ جن آلامِ بحرِ صدماتِ رفقِ خواہشاتِ دل میں عہدِ شباب گزرا ہے۔  
 اور جو حمل اور طاقتوں کے مزے لوٹے ہیں وہ سب ولوے اور جوش کا زمانہ گزر جانے  
 کے بعد ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے کوئی انسانی یہ سب باتیں خواب میں دیکھتا ہوا اور  
 اب کچھ کھل جانے پر ان باتوں کے اثر فائدہ اور نقائصِ فوراً طبیعت سے زائل ہو جائیں۔  
 لیتا ہوں کتبِ غم دل میں سبقِ ہنوز لیکن یہی کہ رفت گیا اور ہو دھتھا  
 کتبِ غم دل بالکل نیا اور اچھوتا استعارہ ہے۔ فرماتے ہیں دل کھوئے ہوئے مجھ کو ایک  
 زمانہ گزر چکا ہے مگر ابھی غم دل کی کتب میں یہی سبق ہے رہا ہوں کہ رفت گیا اور ہو دھتھا  
 یعنی دل کے جانے کا بھی افسوس ہے اور یہ بھی یاد آتا ہے کہ دل کبھی میرے پہلو میں تھا  
 بھی مگر یہ یاد نہیں آتا کہ دل کب کھویا اور کیونکر کھویا۔ بے اختیار ہی عشق کی تصویر  
 اس سے بہتر فظوں میں نہیں کھینچ سکتی۔ اس پر طرہ بخودی کی آمیزش۔



مرزا صاحب فرماتے ہیں جیسا میں اصل میں تھا اور جیسا مجھ کو ہونا چاہیے تھا وہی اسکی لباس میں بھی نظر نہ ہو سکا۔ انجام کار کفن نے میرا داغ عیوب برنگی چھپالیا ورنہ میں ہر لباس میں یعنی اصلیت کو دھبہ لگانے والا قرار پاتا رہا۔ ہر لباس سے مراد یہاں مختلف زمانے مختلف اوضاع سے ہے یعنی میں وہی تو ہوں جس کو ملائکہ نے سجدہ کیا تھا دنیا میں آنے کے بعد میری وہ وقعت وہ عزت میرے انال و افحال کی وجہ سے باقی نہ رہی۔ لڑکپن کی بے تمیزیاں۔ جوانی کی بے اعتدالیاں نفس پرستیاں پیری کی ہوشاکیا میرے جامہ حقیقت کو دھبہ ہی لگاتی رہیں۔ البتہ مرجانے کے بعد کفن نے ان داغوں کو چھپالیا۔

میشے بغیر نہ سکا کو کہن آسہ سرگشتہ خمار رسوم و قیود تھا فرماتے ہیں بغیر قیشہ کے کو کہن شیریں کے عشق میں جان نہ دے سکا۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ محبت کا نشہ اس حد تک نہ پہنچا تھا کہ فرما دینا اسباب قتل کے قتل ہو جاتا یعنی خبریں کا مرنا سن کر ایک آہ کھینچتا اور جان سے گزر جاتا مگر یہ نہ کر سکا۔ اس بات سے یہ ثابت ہوا کہ رسوم و قیود کا پابند تھا۔ اس کو یوں بیان کیا ہے کہ سرگشتہ خمار رسوم و قیود تھا خمار نشہ کے آثار کی حالت کو سمجھتے ہیں اور قیود جمع ہے قید کی۔ یہاں قید بمعنی پابندی رسم استعمال ہوا ہے۔

### عزل

کہتے ہوں نہ دیں گے ہم دل اگر ٹرایا دل کہاں کہ گم کیجئے۔ ہم نے مدعا پایا۔ مشوق کا یہ کہنا سن کر کہ تمہارا دل جو غم نہو گیا ہے اگر ہم کو کہیں گراڑا مل گیا تو ہم تم کو واپس نہ دیں گے مرزا صاحب جواب میں فرماتے ہیں دل ہمارے پاس ہے کہاں جو ہم کو مٹے گا ہاں یہ بات سن کر ہم آپ کا مطلب سمجھ گئے ہیں۔ یعنی ہمارا دل آپ ہی نے ٹھرا لیا ہے۔ اب الزام سے بری ہونے کے لئے یہ کہا جاتا ہے کہ اگر ہمیں مل گیا تو ہم نہ دیں گے۔

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا درو کی دوا پائی۔ دردِ لا دوا پایا  
 فرماتے ہیں۔ زندگی کا لطف طبیعت نے عشق سے پایا ہے۔ یعنی بے عشق زندگی گدازنا ایک  
 دردِ لا دوا تھی اس کی دوا بل گئی مگر دردِ عشق سے لا دوا ہے۔ اس کی دوا دُنیا میں کسی کے  
 پاس نہیں ہے۔ دردِ کی دوا پائی دردِ لا دوا پایا یہ اسلوب بیان مرزا صاحب کے سوا  
 مبدع فیاض سے کس کو عطا ہوا ہے۔

دوستدارِ دشمن ہے اعتمادِ دل معلوم آہ بے اثر دیکھی نالہ نار سا پایا  
 دوستدارِ دشمن۔ یعنی دشمن کا دوست۔ دشمن سے مراد یہاں معشوق سے ہے، فرماتے  
 ہیں وہ ہمارا دشمن ہے اور دل اس کا دوست ہے۔ اب ہم دل پر فداک بھروسہ کر سکتے ہیں  
 دوسرے مصرعہ میں فرماتے ہیں۔ آہ و نالہ میں اثر نہیں۔ اثر کیونکر ہو دل سے نالہ کیا جائے تو  
 تاخیر بخشنے، انہوس اس بات کا ہے نہ آہ اثر کرتی ہے نہ نالہ رسا ہوتا ہے۔ دل کی دشمنی کا  
 خوب ثبوت دیا ہے۔

سادگی و پرکاری، بخود ہی و ہشیاری، حسن کو تغافل میں جرات آزا پایا  
 اس بیان کے قربان جائیے۔ کیسے پچھیدہ خیال کو کس حسن و خوبی سے بیان کیا ہے۔ سادگی  
 بھولا پن، پرکاری، چالاکی بے خودی، غفلت، ہوشیاری، خبرداری۔ فرماتے ہیں معشوق  
 کو تغافل یعنی غفلت میں جرات آزا پایا۔ مطلب یہ ہے عشاق کا دل دیکھنے کے لئے  
 معشوقوں کا بھولا پن ہوا کرتا ہے۔ درحقیقت یہ بھولا پن خاص ہشیاری اور عین چالاکی  
 ہے۔ نشست الفاظ کی تعریف نہیں ہو سکتی۔

غنیچہ پھر لگا کھلنے آج ہم نے اپنا دل خوں کیا ہوا دیکھا۔ گم کیا ہوا پایا  
 مطلب یہ ہے۔ ہمارا دل خون ہو کر آنکھوں کی راہ سے زمین پر پڑ چکا تھا اور پہلو میں کہیں  
 اس کا پتہ نہیں ملتا تھا آج ہم نے اسی دل کو دیکھ لیا اور پایا۔ یعنی یہ غنیچہ گل جو فصل بہاراں  
 میں پھرد و بارہ کھلا ہے ہمارا دل ہی تو ہے جو خزاں کے زمانے میں خون ہو گیا تھا دل کو

اکثر غمچیزے تشبیہ دی جاتی ہے۔

حال دل نہیں معلوم لیکن اس قدر یعنی ہم نے بار بار ڈھونڈا تم نے بار بار پایا فرماتے ہیں۔ دل کی حقیقت حال سے ہم واقف و خبردار نہیں ہیں کہ کب گیا اور کیونکر گیا یعنی عشق ایک بے اختیار ہی شے ہے جو معلوم ہی نہیں ہوتا کہ کس وقت پیدا ہو گیا اور کس طرح پیدا ہو گیا۔ لیکن اس قدر ہم جانتے ہیں کہ ہم نے دل کو ہزاروں بار ڈھونڈا ہے اور تم نے اس کو ہزاروں بار پایا ہے۔

شور پسند ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا آپ سے کوئی پوچھے تم نے کیا فرمایا فرماتے ہیں۔ ناصح کی نصیحت نے بے جانے زخم دل پر نمک چھڑک دیا جس کا مزہ کچھ دل ہی لے رہا ہے آپ سے یعنی حضرت ناصح سے تو کوئی پوچھے کہ آپ کو کیا لطف حاصل ہوا۔

عسزل

دل مرا سوزِ نہاں سے بے محال جا جل گیا آتشِ خاموش کی مانند گویا جل گیا فرماتے ہیں۔ میرا دل سوزِ نہاں سے بے خوف ہو کر جل گیا۔ اور اس کے جلنے کی صورت یہ تھی کہ آتشِ خاموش کی مانند گویا جل گیا۔ آتشِ خاموش وہ آگ جو کچھ کچھ سٹکا کرتی ہے اور جس میں شعلہ نہیں اٹھتا۔ سوزِ نہاں کے مقابلے میں آتشِ خاموش کا لفظ مصرعہ ثانی میں استعمال کرنا انتہائے بلاغت ہے۔ مرزا صاحب کے بیان کی خصوصیات میں سے یہ بات ہے کہ بغیر ارادہ اور تلاش کے اکثر لفظی رعایتیں واقع ہو جاتی ہیں جن کو صنعتِ الفاظ میں شمار کیا گیا ہے۔

دل میں دُوق وصل یا دیا رنگ باقی نہیں آگ اس گھر میں گئی ایسی کہ جو تھا جل گیا مطلب یہ ہے عشق میں یاس و ناامیدی اس قدر بڑھ گئی ہے کہ اب دل میں دُوق وصل اور یا دیا رنگ باقی نہیں ہے۔ اس کو ان لفظوں میں ادا کیا ہے کہ خانہٴ دل میں ایسی آگ لگی کہ جو کچھ سراپہ تھا وہ سب جل گیا اب کچھ باقی نہیں رہا۔ تاخلفہ ہے کہ ناامیدی جب

حد سے گزر جاتی ہے تو توقع خود بخود مٹ جایا کرتی ہے۔ جیسے رجومیاس نے ایسا کیا ہے۔ دل کہ حسرت کو تیرے گنہ کی اب اُمید باقی ہے نہ خواہش ہے۔

میں عدم سے کبھی پرے ہوں نہ غافل بار بار میری آہ آتشیں سے بال غنقا جل گیا فرماتے ہیں۔ میں عدم سے کبھی کچھ آگے نکل گیا ہوں یعنی فنا فی اللہ ہو گیا ہوں۔ البتہ جب اس منزل کو طے کر رہا تھا تو بار بار میری آہ آتشیں سے غنقا کے بازو میں آگ لگ گئی تھی۔ مطلب یہ ہے میں نے ابتدائے تعلیم فنا میں شہرت غنقا کو مٹا دیا تھا۔ جس کو معدوم ہونے کی ایک سب سے زیادہ دلیل سمجھا جاتا ہے۔ غافل سے مراد یہاں وہ لوگ ہیں جو ترقیاً انسانی کو سمجھ نہیں سکتے۔

عرض کیجئے جو ہر اندیشہ کی گرمی کہاں کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ سحر ابل گیا فرماتے ہیں۔ میں اپنے پُر سوز مضامین کی گرمی کا بیان کہاں جا کر کروں۔ میں نے سوچا تھا شہر کو چھو کر جنگل میں بیان کروں گا۔ امید گئی کا خیال آئے ہی جنگل میں آگ لگ گئی غرض اصحاب کا دعا اس بیان سے یہ ہے کہ نافرہوں کی کثرت دیکھ کر جیسا پُر سوز شعر کہنے کو میرا جی چاہتا ہے مکھ نہیں سکتا اور اپنے غمخیز کی پوری پوری بلند پروازیوں دکھانیں سکتا۔ یعنی نافرہوں کے سامنے اظہار کمال سے انجکچاتا ہوں جو ہر اندیشہ سے جو ہر فکر مراد ہے۔

دل نہیں تھجھکو دکھاتا اور داغوں کی بہا اس چرغاں کا کروں کیا کار فرما جل گیا مشرق کو مخاطب کر کے کہتے ہیں۔ یہ جو تو میرے سینے کے داغوں کی سیر اور روشنی دیکھ کر تعجب کر رہا ہے اور حیرت میں مبتلا ہے۔ میرے دل کے مقابلہ میں دن کی کچھ حقیقت نہ تھی اگر میرا دل میرے پہلو میں ہوتا اور تو اُس کا تماشا دیکھتا تو حقیقتِ حال سے واقف ہوتا مگر کیا کروں وہ کار فرما ہی مٹ گیا۔ البتہ یہ اس کا پر تو اور اثر باقی رہ گیا ہے جس کو تو دیکھ کر حیرت و تعجب کر رہا ہے۔

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو و غائبِ دل دیکھ کر طرزِ تیاگ اہل دُنیا جل گیا  
 فراتے ہیں شگفتگیِ خاطر جو روزِ ازل میں خصوصیت کے ساتھ مجھ کو ملی تھی جس کی بدولت  
 میں زمانہ بھر میں لطیفہ گو اور بذلہ سخن مشہور ہو گیا تھا۔ اب اس کے مقابلہ میں افسوسہ  
 خاطر ہی کا تمنائی اور آرزو مند ہوں۔ اور اس خواہش کا اصلی سبب طرزِ تیاگ اہل  
 دُنیا ہے۔ یعنی یہ لوگ مجھ سے منافقانہ برتاؤ کرتے ہیں۔

### عَنْزَل

شوق ہر رنگِ قیبِ سرو سامان نکلا قیس تصویر کے پرے میں بھی عریان نکلا  
 قیس کا لقب مجنوں ہے۔ مجنوں دیوانہ کو کہتے ہیں۔ دیوانہ آتشِ ترکِ لباس کر دیتا ہے۔  
 شوق کے معنی یہاں عشق کے لئے گئے ہیں مرزا صاحب فرماتے ہیں عشق دُشیا کے سرو سامان  
 کا دشمن نکلا۔ سامان دُنیا میں لباس بھی داخل ہے مطلب یہ ہے رنگِ عشق ایسا پختہ واقع  
 ہوا تھا کہ قیس کو تصویر کے لباس میں بھی اُس نے عریاں ہی رکھ لیا۔ رنگِ تصویر جس سے  
 دستی تصویر کھینچی جاتی ہے وہ بھی قیس کی عریانی کا پردہ نہ بن سکا۔ اب ہر رنگ کے معنی  
 ملاحظہ ہوں یعنی عشق میں۔ مجنوں میں۔ عریانی میں۔ تصویر کے رنگ میں۔ ان فرض ہر رنگ  
 میں عشق دشمنِ رنگ دُشمنِ نگ دُشمنِ نگ ہی رہا۔ نکلا ہر جے کہ قیس عاشق تھا۔ جنگل میں رہا۔ ترکِ لباس  
 کیا۔ دیوانہ لقب پایا۔ مرزا صاحب کے کمال کو دیکھئے کہ اُنھوں نے پردہ تصویر میں بھی اُنکو  
 عریاں ہی دکھایا۔

زخم نے داؤدِ دی تنگی دل کی یارب تیر بھی سینہ بسمل سے پرافشاں نکلا  
 تنگ دلی اور تنگ چشمی کا استعمال رشک و حسد کے موقع پر ہوتا ہے اور یہاں تنگ دلی  
 سے رشک کے عربی کے معنی مقصود ہیں جس کو عربی میں غبطہ کہتے ہیں۔ اور غبطہ کے معنی  
 جس پر رشک کیا جائے اس کے صفاتِ جاہل کرنے کے ہیں۔ پرافشاں دُن کے معنی اہل  
 ایران کے معاوہہ میں ترکِ تعلق کردن کے ہیں۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں۔ زخم نے غبطہ دل

کی داد نہ دی یارب جس کے سبب سے تیر بھی تعلق کر کے سینہ بسمل سے نکل گیا مطلب  
شعر کا یہ ہے کہ رشک دل نے تیر کی فطش سے سینہ کو بچا دیا اور وہ اس طرح کہ دل نے سینہ  
کے رشک سے جس میں یار کا تیر چاک کر جا لگا تھا جان دے دی۔ اب تیر یار نے دیکھا کہ  
دل عاشق بنیز خرم کے مر گیا، میری ضرورت باقی نہ رہی۔ ترک تعلق کر کے سینے سے نکل گیا۔  
بڑے گل نالہ دل دود و چراغ محفل جو تیری بزم سے نکلا سو پریشان نکلا  
پھول کی خوشبو، دل کی فریاد، چراغ کا دھواں یہ سب چیزیں ہوا کے ساتھ پھیلنے  
والی اور بکھر جانے والی ہیں۔ شاعر ان پر رشک کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ان کی پریشانی کا  
باعث ہوا نہیں ہے بلکہ یہ بھی تجھ پر عاشق ہو کر تیری بزم سے نکلتی ہیں اس لئے پریشانی  
میں۔ دعا یہ ہے کہ تجھے دیکھ کر اور تجھے مل کر یہ ممکن ہی نہیں کہ کوئی پریشان نہ ہو یعنی  
تجھ پر عاشق نہ ہو جائے۔

دل حسرت زدہ تھا مائدۂ لذت درد کام یاروں کا بقدر لب و دندان نکلا  
مائدۂ کے معنی کھانا دینے والے یا کھانا تقسیم کرنے والے کے ہیں مرزا صاحب نے اس  
مقام پر دسترخوان کے معنی لئے ہیں۔ فرماتے ہیں میرا دل حسرت زدہ لذت برد کا دسترخوان  
تھا جس پر انواع و اقسام کے کھانے پئے ہوئے تھے۔ یاروں کو ان کی قابلیت و ذوق  
کے موافق حصہ میرے دسترخوان سے ملا۔ یہاں کچھ کمی نہ تھی مطلب یہ ہے کہ اپنی اپنی  
قابلیت کے موافق لوگ مجھ سے مستفیض ہوئے۔

ہے نا آموز فنا بہت دشوار پسند سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آسان نکلا  
فرماتے ہیں۔ میری بہت اور میل و حوصلہ اس قدر دشوار پسند واقع ہوا ہے کہ فنانی تعلیم  
اس کے واسطے ایک معمولی سا کام سمجھنا چاہیے جیسے کسی مولوی کو الف بے بت پڑھائی  
جائے مگر یا مشکل کی بات ہے جس کام کو ایک زمانہ دشوار اور مشکل سمجھتا ہے وہ بھی میرے  
واسطے آسان نکلا۔ ایک اور جگہ پر بھی مرزا صاحب نے اس معنیوں کو بیان کیا ہے وہاں

وہاں فرماتے ہیں کہ

فنا تعلیم دریں بخود ہی ہوں، بس زلمے سے کہ محنتوں لام لعن لکھتا تھا دیوارِ دیستان پر  
دل میں کچھ گریہ نے اک شور اٹھایا غائب آہ جو قطرہ نہ نکلتا تھا سسٹوفاں نکلا  
پھر کا لفظ اس مطلب کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ گریہ میں دوبارہ شور و غل پیدا ہوا، شور  
و غل پانی کی وہ آواز جو دریا یا سمندر میں جوش کے وقت پیدا ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں پہلی  
بار تو میں نے اس جوش کو اس قدر ضبط کیا تھا کہ دریائے گریہ کا ایک قطرہ بھی آنکھ سے نہ  
نکلے۔ فریاد انہوں سے ہے وہ اب دریا بن کر نکلا اور طوفان کی صورت اس نے پیدا کر لی، شعر کا  
خلاصہ یہ ہے کہ رفتہ رفتہ عشق نے ظاہر ہوجانے کا سامان پیدا کر لیا۔

### غزل

دھمکی میں مر گیا جو نہ بابِ نبرد تھا عشقِ نبرد پیشہ طلبگارِ مرد تھا  
فرماتے ہیں وہ شخص دھمکانے سے مر گیا جو میدانِ جنگ میں پہلے کبھی نہ اُترا تھا (یہ اشارہ  
ہے فریاد کی طرف عشقِ نبرد پیشہ وہ سپاہی جو ہمیشہ لڑتا رہتا ہے اپنے مقابلہ میں ایک  
بہادر سپاہی کو بٹلا رہا ہے اور وہ بہادر سپاہی ہم ہیں۔ ہم نے فریاد کی طرح عشق کی دھمکی  
میں اگر جان نہیں دی بلکہ مردانگی کے ساتھ عشق اور مصائبِ عشق کا مقابلہ زندگی بھر  
کرتے رہے۔

تھا زندگی میں موت کا کٹھن کا لگا ہوا اُڑنے سے پیشتر بھی مرانگِ زرد تھا  
فرماتے ہیں مجھے زندگی میں بھی موت یاد تھی اس لئے میں نے اپنے کو فنا ہونے سے پیشتر  
فنا کر دیا تھا۔ اس بیان کا لطف کچھ اہل تصوف ہی اٹھا سکتے ہیں۔ جو موقوفِ اقبل ان موقوفِ  
کے راز سے آشنا ہیں۔ دوسرے مصرعے میں اس کی وضاحت ای الفاظ میں کی ہے،  
”اُڑنے سے پیشتر بھی مرانگِ زرد تھا“ یعنی موت کی مُردنی چھا جانے سے پہلے مرے  
موت پر موت کی مُردنی چھائی ہوئی تھی۔ اس زمین میں ایسا بلند شعر کہنا مرزا ہی جیسے ماہر فن

اور مسلم القبریت اُستاد کا کام تھا۔

تالیف نسخہ ہائے وفا کر رہا تھا میں! مجموعہ خیال ابھی فرد فرد تھا  
 فرماتے ہیں۔ ابتدائے عشق میں اُس وقت جب کہ میں وفاداری کے شعلے سنوں کی تابین  
 کر رہا تھا اور ادویہ و فاک ایک ایک دوا کا خواص و مزاج قائم کر رہا تھا اور وہ ایسا  
 وقت تھا کہ میرا خیال وفا کی ایک ایک خوبی کو علیحدہ علیحدہ جانچ کر رہا تھا، مجھ پر تم کا آغاز  
 ہو گیا اور میری وفا کے نسخے نامکمل اور ناتمام رہ گئے۔

دل تاجگر کہ ساحل دریائے خوں ہے، اب اس رگنہ میں جلوہ گل آگے گرد تھا  
 شمع کا مطلب یہ ہے کہ ہم بھی غرضی اور فارغ البالی کے زمانے میں دل شگفتہ اور طبع تلکین  
 رکھتے تھے ہر وقت وہ ہماری پیش نظر رہتی تھیں جن کے سامنے جلوہ گل بھی گرد ہوا جاتا  
 تھا مگر زمانے کا کچھ ایسا انقلاب ہو گیا ہے کہ اب دل سے جگر تک ایک دریائے خون کے  
 سوا اور کچھ بھی نہیں ہے۔ جب دل شگفتہ رکھتے تھے اب باخاطر پریشاں زندگی کے دن  
 کاٹ رہے ہیں۔ انقلاب زمانہ کی کس قدر سچی اور پُر اثر تصویر کھینچی ہے۔

جاتی ہے کوئی کشمکش اندوہ عشق کی دل بھی اگر گیا تو وہی دل کا درد تھا  
 فرماتے ہیں۔ عشق پیدا ہو جانے کے بعد یہ تو کسی طرح ممکن ہی نہیں کہ آدمی اُس سے نجات  
 پاسکے۔ یعنی جب تک دل پہلو میں تھا اُس وقت تک اندوہ عشق نے دوسرا رنگ دوسرا  
 پہلو اختیار کر رکھا تھا۔ جب سے دل جاتا رہا دل کے جانے کا درد و غم اُسی طرح پہلو میں  
 رہا۔ مطلب یہ ہے جان بچنے کا کوئی پہلو نہ دل کی موجودگی میں تھا نہ دل کے جانے  
 کے بعد نظر آتا ہے۔

احیاب چارہ سازی و حشت نہ کر سکے زنداں میں بھی خیال بیاباں نور و تھا  
 قاعدہ ہے کہ دیوانے آدمی کو بالکل خانے میں مقید رکھ کر اُس کے جنون کا علاج کیا کرتے  
 ہیں۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں۔ دوست آشنا میری دشت کا کچھ علاج ہی نہ کر سکے۔



دمشت اور دیوانگی سے باز رکھنے کے لئے مجھ کو قید کیا تھا مگر قید خانہ میں بھی میرا خیال اسی طرف بیاہاں نور دریا، جس طرح میں خود قید ہونے سے پیشتر دمشت کے عالم میں جنگل جنگل پڑا پھرتا تھا۔

یہ نقش بے کفن آسمند خستہ جاں کی ہے حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا فرماتے ہیں۔ آسمند خستہ جاں جب تک زندہ رہا آزادی کے عالم میں رہا۔ قید خانے سے بالکل آزاد تھا۔ مرنے کے بعد اس کی لاش کا بے کفن ہونا بتا رہا ہے کہ وہ اب بھی گورو کفن کی قید سے آزاد ہے۔ حق مغفرت کرے اس جملہ دعائیہ نے عجب لطف پیدا کر دیا ہے۔

### عزل

شمار سچہ مرغوب بُتِ شکل پسند آیا تماشا کے بیک کعبہ بردنِ دل پسند آیا یہ ساری غزل اس زمانہ کی ہے جب مرزا صاحب پر فارسیت کا رنگ غالب تھا۔ ردیف کے سوا پورے پورے مصرع فارسی میں ہیں۔ یہاں تک کہ مطلع کے مصرعہ اولیٰ میں ردیف کا پہلو بھی فارسی ہے یعنی اہل ایران کے ہاں مرغوب آمد محاورہ ہے، مگر معنی کے اعتبار سے یہ ایک ایسا اچھوتا مضمون ہے جس کو آج تک کسی شاعر کے خیال نے مس نہیں کیا۔ فرماتے ہیں شمار سچہ میرے بُتِ شکل پسند کو بہت ہی پسند آیا ہے۔ نہ اس لئے کہ وہ بھی تسبیح پر پڑھنا چاہتا ہے بلکہ اس واسطے کہ ایک جھپٹے میں تلو دوں پر قبضہ حاصل کر لینے کی ترکیب پاچھ آگئی۔ جس طرح زبَاد عباد تلو دانوں کی تسبیح کو سمیٹ کر مٹھی میں لے لیتے ہیں اسی طرح میرا مشوق جو ایک بُتِ عیار ہے زاہدوں اور عابدوں کی دیکھا دیکھی تلو دوں کو مٹھی میں مار لیتا ہے۔ تسبیح کے دانوں سے دل کا استعارہ کیا ہے جو نہایت قریب انھم اور نیا استعارہ ہے۔

بفیض بیدلی نو میدی جاوید آساں ہے کشاکش کو ہمارا عقدہ مشکل پسند آیا یہاں بیدلی کے معنی بھی ناامیدی کے لئے لگے ہیں۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں ناامیدی کے

فیض سے ہمیشہ کی ناکامیابی آسان ہو گئی ہے۔ یہ دیکھا گیا ہے جب کوئی آدمی کسی کام سے پورا پورا ناکامیہد ہو جاتا ہے تو اس کام کی کامیابی میں جو کاوش اور کاوش دلی کوششوں کی وجہ سے ہوئی ہے بسٹ جایا کرتی ہے۔ دوسرے مصرعہ میں یہ مطلب ادا کیا گیا ہے کہ ہمارا عقدہ مشکل کشاکش کو پسند آگیا ہے۔ قاعدہ ہے جو شے کسی کو مرغوب طبع ہوتی ہے اور پسند آجاتی ہے تو وہ اُس کو قائم رکھنے کی کوشش کرتا ہے اور اپنے اسکان تک اس کی حفاظت میں مصروف رہتا ہے۔ جب کشاکش کو ہمارا عقدہ مشکل پسند آگیا تو وہ اسے کیوں کھٹے دے گی۔ اور جب ہم نے یہ سمجھ لیا کہ ہمارا عقدہ دشوار یا نخل ہے تو اُسید عقدہ کشائی اٹھ کر ناکامیہد کی صورت میں ہمیشہ کو تسکین خاطر حاصل ہوگی۔ ہوائے سیر گل آئینہ بے مہر قاتل کہ اندازِ بخوں غلطیدن بسمل پسند آیا ہوا کے معنی یہاں شوق کے ہیں۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں۔ قاتل کو بھولوں کے دیکھنے کا شوق اور یہ شوق اس کی تنگدستی کا آئینہ ہے۔ یعنی ہمارا قاتل جو باغ میں سیر کے واسطے جاتا ہے وہ باغ میں ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کھانے اور رنگ رنگ کے پھول دیکھنے کے لئے نہیں جاتا بلکہ وہ تو صرف اُن بھولوں کو دیکھنے جاتا ہے جو شاخوں سے جھڑک کر زمین پر گر پڑے ہیں اور ہوا کے جھونکوں سے کروٹیں بدل رہے ہیں وہ اُن جھڑے ہوئے پھولوں کو تماشائے رقص بسمل سمجھتا ہے اور اس کو ان کے دیکھنے سے فرحت و مسرت قاتل ہوتی ہے۔ جراحت تحفۃ الماس منانِ داغِ جگر بدیدہ مبارکبادِ آسہ غمخوارِ جان دردمند آیا مرزا صاحب کا پہلو دار بیان اس مقطع میں دو معنی پیدا کر رہا ہے۔ ایک یہ کہ میرا غمخوار جو دردست کو سمجھانے اور مجھ سے ملاقات پر آمادہ کرنے کے لئے گیا تھا وہ وہاں سے تحفہ میں زخم میرے کی گئی۔ داغِ جگر کے گرد واپس آیا ہے مطلب یہ ہے کہ وہ خود عاشق ہو گیا۔ دوسرے معنی یہ نکلتے ہیں کہ حضرت عشق یہ سالانِ خرابی کے کہ جناب اسد اللہ خاں صاحب غائب کی ملاقات کو تشریف لائے ہیں۔

## عزل

وہر میں نقشِ وفا وجہ تسلی نہ ہوا ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندہ معنی نہ ہوا  
 فرماتے ہیں دُنیا میں جو لوگ وفاداری سے کسی کے دل پر نقشِ وفا قائم کر دیتے ہیں وہ گویا  
 ایک بیکار کام میں اپنا وقت ضائع کرتے ہیں اس لئے نقشِ وفا اہل وفا کے لئے سوجب تسلی  
 خاطر اور سبب اطمینانِ طبیعت نہیں ہوتا ہمیشہ اہل دُنیا دستور دُنیا کے موافق وفا کے صلے  
 میں جفا و ستم کے مستحق قرار دیئے جاتے ہیں۔ مرزا صاحب اپنی تسلی خاطر ان فخلوں سے  
 فرماتے ہیں۔ وفادہ لفظ ہے جس کے کچھ معنی ہی نہیں ہیں گویا وفاداری دُنیا میں  
 بیکار بات ہے۔

سبزہ خط سے ترا کا کل سرکش نہ دیا یہ زمرہ بھی حریفِ دمِ افعی نہ ہوا  
 مشہور ہے کہ زمرہ سے سانپ اندھا ہوجا کر تباہ ہے۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں تیرے  
 سبزہ خط سے رُلف کا افعی سرکش اندھا نہ ہوا۔ مطلب یہ ہے کہ خط کھل آنے پر بھی  
 رُلفوں کی دلفریبی اور سرکشی میں فرق نہ آیا۔ سبزہ خط کو زمرہ سے اور ساکل کو سانپ  
 سے تشبیہ دی گئی ہے۔

میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ فاسے چھوٹوں وہ شکر مرے مرنے پر بھی راضی نہ ہوا  
 فرماتے ہیں۔ مرنے کے بعد فکر وفا سے چھٹکارا ہوجاتا لیکن وہ شکر مرے مرنے پر  
 راضی نہ ہوا۔ نہ اکت خیال اس شعر میں یہ پیدا کی گئی ہے کہ موت جو ایک بے اختیاری  
 اور انگریز امر ہے اس کو اختیاری اور دوست کی مرضی کا تابع ظاہر کیا گیا ہے۔ مگر دوست  
 شکر ہے وہ عاشق کے مرنے پر راضی نہ ہوتا۔ یہ سمجھتا ہے کہ اس کی موت میری بدنامی  
 کا باعث قرار پائے گی۔ علاوہ ازیں میرے خنل شرم میں فرق آجائے گا اور سب سے زیادہ  
 یہ خیال مانے ہے کہ ایسا وفادار دوسرا شخص مجھ کو کہاں سے ملے گا۔ لفظی اور معنوی تریخ  
 کی اس شعر میں کوئی انتہا نہیں رہی ہے۔

دل گذرگاہ خیال نے دسا غریبی ہی گر نفس جادہ سر منزل تقویٰ نہ ہوا  
 فرماتے ہیں۔ اگر تاساں راہ منزل پر ہیز گاری نہ بن سکا تو کچھ غم نہیں۔ میرا دل تو نگاہ جام  
 و شراب تو بن سکتا ہے میں جام و شربت کے خیال ہی میں دل کو مست رکھوں گا۔ اگر  
 زہد و تقویٰ سے طبیعت کو خوش نہیں کر سکتا، زہدی اور پرہیزگاری کو برا تصور کیا گیا ہے۔  
 ہوں تم سے وعدہ نہ کرنے پہ بھی راضی کہ بھی گوش مشت محش گلابا رنگ تسلی نہ ہوا  
 مطلب یہ ہے کہ اگر تو نے وصل کا وعدہ نہ کیا تو بھی میری خوشی کا باعث ہے اس سبب سے  
 کہ میرے کان پہ بھی تسلی کی آواز سے آشنا نہ ہوئے تھے۔ اگرچہ میرا مقصود وصل ہی تھا  
 لیکن اس لئے کہ میں کبھی شرمندہ احساس نہ ہوا تھا۔ اپنی ناکامیابی سے خوش ہوں۔

کس سے محرومی قسمت کی شکایت کیجئے ہم نے چاہا تھا کہ مرجائیں سو وہ بھی نہ ہوا  
 فرماتے ہیں محرومی قسمت ہمارے حضور میں آگئی ہے۔ جو کام ہم کرنا چاہتے ہیں وہی نہیں ہوتا  
 یہاں تک ہمارے قسمت کو ہم سے ضد ہے کہ ہم نے دنیا کے غم سے تنگ اگر پرچا یا  
 تھا کہ بلا سے مری جائیں تو یہ بھی نہ ہوا

مر گیا صد مہ کی جنبش لب سے غالب ناتوانی سے حریف دم عیسیٰ نہ ہوا  
 حریف مد مقابل فرماتے ہیں حضرت عیسیٰ نے ابھی پورا اُتھڑا ڈنک اللہ نہ کہا تھا صرت  
 ہونٹوں کو خفیف کی جنبش ہوئی تھی کہ غالب کا کام تمام ہو گیا۔ یعنی وہ اتنا خفیف و ناتوان  
 تھا کہ حضرت عیسیٰ کے ہونٹوں کی یہ حرکت بھی برداشت نہ کر سکا۔

### عنزل

ستائش گر ہے زاہد مستدرس باغ رضوان کا وہ آگ گلہ ستہ ہے ہم بخود دیکھ طاق نسیاں کا  
 طاق نسیاں اُس طاق کو کہتے ہیں جس میں کچھ رکھ کر بھول جائیں۔ طاق نسیاں کا گلہ ستہ  
 وہ گلہ ستہ ہے جس کو طاق نسیاں میں رکھ کر بھول گئے ہوں۔ بخودوں کی بہشت کو طاق  
 نسیاں کے گلہ ستہ سے تشبیہ دینی بالکل ایک نرالی تشبیہ ہے جو آج تک کسی کے کلام میں

نظر سے نہیں گزری، مطلب یہ ہے کہ زباہ جس بلغ جنت کی اس قدر مدح کرتا ہے وہ ہم  
 بخود دل کے طاق نسیاں کا وہ گلدستہ ہے جس کو ہم نے دل سے اُتار دیا اور بھلا دیا۔  
 بیاں کیا کیجئے، پیدا کاوشما کز گاں کا کہ ہر اک قطرہ خون دانہ ہے تسبیحِ مرجاں کا  
 خون کے قطرے کو موت کے دانے سے جو تسبیح میں ڈالا جاتا ہے تشبیہ دی ہے۔ فرماتے ہیں۔  
 مژگانِ یار کی کاوش نے قطرہ خون آنسو بنا دیا ہے جنہوں نے مسلسل لڑی دار جمع ہو کر  
 تسبیحِ مرجاں کی صورت اختیار کر لی ہے۔ مضمون شعر نہایت سے خالی نہیں ہے۔  
 نہ آئی سطوتِ قاتل بھی مانعِ میرے نالوں کو لیا دانتوں میں جو تنکا ہوا ریشہ نیتاں کا  
 سطوتِ رعب۔ نیستاں نے کا جنگل۔ نے بانسری کو کہتے ہیں۔ نے نوازی بھی محاورہ ہے۔ اور  
 بانسری بجاتی بھی بولا جاتا ہے۔ دانتوں میں تنکا لینا اظہارِ انکسار کرنا۔ ہندوستان میں بھی  
 اس کا عمل در آمد ہے۔ اور شمس بدندانِ گرفتار کا محاورہ بھی ہے۔ مرزا صاحب فرماتے  
 ہیں قاتل کا رعب و ادب بھی میرے نالوں کو نہ روک سکا۔ اس کے خوف سے اظہارِ عجز  
 کے لئے جواب میں نے دانتوں میں دبا پایا وہ نے بن کر خود بخود بکھنے لگا اور اس سے  
 نالہ کی آواز پیدا ہو گئی۔

دکھاؤں گا تماشا سوئی اگر فرصت نہ مانے مرا ہر داغِ دل اک تخم ہے سروِ چراغاں کا  
 فرماتے ہیں اگر مجھ کو زمانے نے مہلت دی تو میں تم کو سیر و کھاؤں گا میرا ہر ایک داغِ سرو  
 چراغاں کا بیج ہے۔ مطلب یہ ہے کہ داغِ عشق ابھی دل میں پیدا ہوا ہے اور وہ گویا تخم ہے  
 سروِ چراغاں کا اگر زمانہ کا کوئی انقلاب پیش نہ آیا تو وہ میرے دل سے تھوڑے دنوں میں  
 سروِ چراغاں پیدا ہو جائے گا۔

کیا آئینہ خانے کا وہ نقشہ تیرے جلوے نے کرے جو پرتوِ خورشیدِ عالمِ شبنمِ ستاں کا  
 شبنمِ ستاں مرکب ہے شبنم اور ستاں سے شبنم اس کو کہتے ہیں۔ ستاں وہ مقامِ جہاں اوس  
 پڑی ہو آئینہ خانہ وہ مکان جس میں دیواروں پر چاروں طرف آئینے کے ٹکڑے نصب

کئے گئے ہوں۔ عورت عام میں جس کو شیش محل کہتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔ تیرے جلوے نے شیش محل کا وہ حال کر دیا ہے جو آفتاب کی گرمی خیمہ کا کر دیتی ہے جس طرح خیمہ کے قطرے آفتاب کی گرمی سے بہ کر اڑ جاتے ہیں اسی طرح تیرے جلوے کی گرمی سے آئینے پانی ہو کر بہہ گئے۔

میری تعمیر میں مضمر ہے اک صوف خرابی کی یہو لا برق خرم کا ہے خون گرم دہقان کا تعمیر عمارت مکان۔ خرابہ۔ ویرانہ۔ کھنڈر۔ یہو لا۔ مادہ۔ خون گرم۔ سرگرمی۔ مطلب یہ ہے کہ میرا جسم فانی ہے یعنی میرا وجود میری خفاکی ذیل ہے۔ جس طرح دہقان کی سرگرمی خود اس کے کھلیاں پر بجلی کا کام دیتی ہے اسی طرح میرے جسم میں فنا ہونے کی قابلیت پوشیدہ رکھ دی گئی۔ دوسرا مصرعہ پہلے مصرعے کی شرح تصور کیا جائے۔

اگلا ہے گھر میں ہر سوسنہ ویرانی تماشا کر عمارت کھوٹنے پر گھاس کے میرے دربان کا سبزہ سے مراد سبزہ بیگانہ ہے۔ اور سبزہ بیگانہ اُس گھاس کو کہتے ہیں جو برسات کے موسم میں بے موقع مقام پر ہو جاتی ہے۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں مکان کے دربان ہونے کے بعد یہ فوج پہنچ گئی ہے کہ اس میں جگہ جگہ پر گھاس اُگ رہی ہے۔ دربان کا کام بیگانہ آدمی کو گھر کے اندر نہ آنے دینے کا ہے اس لئے وہ سبزہ بیگانہ کو کھود کھود کر گھر سے باہر نکالتا ہے۔ ویرانی کو خطاب کر کے کہنا۔ اے ویرانی تو یہ سیر تو دیکھ۔ بظن سے خالی نہیں ہے۔ خموشی میں نہاں گل گشتہ لاکھوں آندوئیں ہیں چراغ مُردہ ہوں میں بے زباں گو غریباں کا مرزا صاحب فرماتے ہیں۔ میری خاموشی میں چھپی ہوئی لاکھوں آندوئیں میں گویا میں بے زباں بچھا ہوا چراغ ہوں۔ گو غریباں کا۔ چراغ کی نو کو آدمی کی زباں سے تشبیہ دی ہے اور کچھ ہوئے چراغ سے مراد بے زباں آدمی ہے یہ تشبیہ خوں گشتہ آندوئیں سے مناسبت رکھتی ہے۔

ہنوز اک پر تو نقش خیال یار باقی ہے دلِ افسردہ گویا حجرہ ہے یوسف کنز دل کا فرماتے ہیں۔ ابھی تک سنوڑا سا خیال یار کا لمس باقی ہے۔ اگرچہ میری افسردہ خاطر نے خیال

یاد کو دل سے بھلا دیا ہے لیکن اس ذرا سے پتوں میں بھی اس بلا کا نور ہے کہ میرے دل افسردہ پر حجرہ زندانِ یوسف کا گمان ہوتا ہے۔ حجرہ چھوٹی کو ٹھہری کو کہتے ہیں۔ دلِ فخریٰ سے تنگ آکر حجرہ بن گیا ہے۔

بغل میں غیر کی آج آگے تھے ہیں کیس ورنہ سبب کیا خواب میں آکر تبسم ہائے پنہاں کا تبسم ہائے پنہاں۔ وہ تبسم جس کا اثر ہونٹوں پر برائے نام ظاہر ہو۔ فرماتے ہیں۔ خواب میں آکر تبسم پنہاں کا سبب شاید یہ ہے کہ آپ کسی مقام پر غیر کے ہلو میں آرام فرما رہے ہیں۔ اور میرے جلانے کے واسطے خواب میں آکر چوری سے سکراتے ہیں۔

نہیں معلوم کس کس کا لہو پانی ہوا ہوگا قیامت ہے سرشک آلودہ ہناتیرِ خرگاہ فرماتے ہیں۔ کس کس عاشق کا لہو پانی کی طرح تو نے بہایا ہوگا۔ یعنی کن کن لوگوں کو بے گناہ قتل کیا ہوگا۔ تیری خرگاہ کا آنسوؤں سے تر ہونا قیامت سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ معلوم ہوتا ہے اب اُن بے گناہوں کی یاد تجھ کو رُلا رہی ہے۔

نظر میں ہے ہماری جادو راہ فنا غائب کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشان فرماتے ہیں۔ جادو راہ فنا دنیا کے اجزائے پریشان کا غیرازہ ہے۔ تمام اوراقِ عالم فنا ہو کر اسی ایک ڈورے میں منسلک ہو جاتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جس رشتے میں تمام اوراقِ عالم بٹے ہوئے ہیں میں اُس رشتے کو بھولا نہیں ہوں یعنی جادو راہ فنا ہر وقت میری آنکھوں کے سامنے رہتا ہے۔

## عَنْزَل

نہ ہو گا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا حبابِ موجہ زرقارے نقشِ قدم میرا یک بیاباں ماندگی بہت تھک جانا۔ ذوق سے ملازمتاں ذوقِ صحرانوردی ہے۔ فرماتے ہیں میں خود کیسا ہی تھک جاؤں میرا شوقِ صحرانوردی کم نہ ہوگا جس طرح موج آب آگے بٹکنے کی غرض سے ابھرتی ہے اُسی طرح میرا نقشِ قدم آگے بڑھنے کا شوق رکھتا ہے۔

محبت تھی جس سے لیکن اب یہ بے دماغی ہے کہ موج بوئے گل سے ناک میں آلتاب دھیرا  
مطلب یہ ہے۔ پہلے مجھے جس سے محبت تھی اب نفرت پیدا ہو گئی ہے بوئے گل جو بیشتر سرت  
اور خوشی پیدا کرتی تھی اب اس سے میرا ناک میں دم ہے۔ زمانہ کے انقلاب سے محبت  
نے نفرت کی صورت پیدا کر لی ہے۔

### قطعہ

سرا پارہن عشق و ناگزیر اُلفتِ ہستی عبادتِ برق کی کرتا ہوں و افسوسِ حال کا  
مطلب یہ ہے کہ سرتا پائے عشق بھی ہوں اور اپنی جان کو بھی عزیز رکھتا ہوں۔ میری مثال  
ایک آتش پرست کی سی ہے کہ آگ کی پرستش بھی کرتا ہوں اور خرمن کے جل جانے کا بھی  
اندیشہ ہے۔ ناگزیر اُلفتِ ہستی کا یہ مطلب ہے کہ اپنے کو عزیز نہ رکھنے پر مجبور ہوں۔ یعنی  
اللہ تعالیٰ نے میری خلقت میں یہ بات ودیعت کر دی ہے کہ اپنی جان کو عزیز رکھوں۔  
بقدرِ ظن ہے ساقی خمارِ خشنہ کامی بھی جو تو دریائے تھے تو میں خیمارہ پاش کا  
فرماتے ہیں۔ اسے ساقی شراب پلانے میں جس قدر تیز حوصلہ بڑھا ہوا ہے اُسی قدر تیز  
پینے میں میں بھی عالی ظرف واقع ہوا ہوں۔ یعنی تو اگر دریائے تھے تو میں ساحل  
کی انگریزی ہوں قاعدہ ہے کہ شراب خوار کو نشہ کے اُسمار پر انگریزائیاں اُسنے لگتی ہیں۔  
ساحل یعنی دریا کا کنارہ باوجود دریا قریب ہونے کے ہمیشہ لب رہا کرتا ہے۔ اس  
مثال سے یہ مطلب نکلتا ہے کہ ساقی جس قدر دریا دلی سے شراب پلا رہا ہے اُسی قدر میں  
بھی عالی ظرف ہونے کی وجہ سے شراب کا بیاسا ہوں۔

### عَنْزَل

محرم نہیں ہے تو ہی خواہے راز کا یاں ورنہ جو حجاب پردہ ہے ساز کا  
فرماتے ہیں۔ راز کے فنون سے تو خود ہی نا آشنا ہے ورنہ دُنیا میں جو بظاہر حجاب  
نظر آتے ہیں وہ بھی پردہ ساز کی طرح بول رہے اور بچ رہے ہیں اور اسرارِ الہی



ظاہر کر رہے ہیں۔ بے خل شعر کھایا ہے۔

رنگ شکستہ صبح بہارِ نظارہ ہے یہ وقت ہے شگفتن گھلے ناز کا  
 فرماتے ہیں میرا اڑا ہوا رنگ میرے دوست کی صبح بہارِ نظارہ ہے اور یہی وقت تو ہے  
 جب اُس کے گھلے ناز کھلا کرتے ہیں اس لئے معشوق سے خطاب کر کے فرماتے  
 ہیں صبح کے وقت میرے منہ پر ہوائیاں اڑتی ہوئی دیکھ کر تو بھی اپنے ناز و انداز کے  
 پھول کھلانے میں مصروف ناز و انداز ہو۔

تو اور سوئے غیر نظر بے تیز تیز میں اور دکھ تری مرزدہ ہلے دراز کا  
 مرزدہ ہلے دراز سے یہاں دل میں اتر جانے والی اور گھر لینے والی پکیں مراد ہیں۔  
 فرماتے ہیں تو اور غیر کی طرف یہ تیز تیز نکلا ہیں۔ میں اور دل میں گھر لینے والی پکوں  
 کی تکلیف مطلب یہ ہے تو جو لطفت و عنایت کی نگاہیں غیر پر کرتا ہے مجھ کو رشک  
 و حسد پیدا ہوتا ہے اور اُس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ تیرا عشق رشک کی برچھیاں میرے  
 دل میں چھبوتا ہے۔

صرف ہے ضبط آہ میں میرا و گرنہ میں طمع ہے ایک ہی نفس جاں گداز کا  
 فرماتے ہیں میں جو اپنی آہ کو ضبط کر رہا ہوں اس میں میں نے اپنا فائدہ سمجھ رکھا ہے  
 ورنہ میرا جسم زار میرے ایک ہی نفس جاں گداز میں کھل کر آتش عشق کی خوراک بن  
 جائے یعنی جس طرح شمع پگھل کر بہہ جاتی ہے، میری آہ مجھ کو فنا کر دینے کے لئے  
 کافی ہے۔

میں بسکہ جوش بادہ سے شیشے پھلے ہر گوشہ بساط ہے سریشہ باز کا  
 شیشہ باز ایک قسم کا بھائی مٹی ہوتا ہے جو تماشا کرتے وقت شیشے یا بوتل کو اچھال کر  
 سرودش پر روکتا ہے اور ناچنے میں جسم کے ہر حصہ پر اُس کو لے آتا ہے۔ فرماتے  
 ہیں بہار کا موسم آنے سے شراب میں ایسا جوش پیدا ہو گیا ہے کہ جہاں جہاں فرش

کے کونوں پر شراب کے بھرے ہوئے شیشے رکھے ہیں۔ اپنے اپنے مقاموں پر وہ اسی طرح اُچھل رہے ہیں جس طرح بازگیر کے سرور و شہ پر جنبش دینے سے شیشہ اُچھلتا ہے اور پھر اُسی مقام پر قائم ہو جاتا ہے۔ ناخن پہ قرض اُس گرہ نیم ناز کا فرماتے ہیں۔ یار کی گرہ بند قبا ہم سے آدھی کھل کر رہ گئی پوری نہ کھل سکی اس مجرم میں ہمارا دل ہم سے کاوش کا تقاضا کر رہا ہے اور ناخن پر ابھی تک گرہ بند قبا کا قرضہ باقی ہے بہتر ہے کہ ہم اپنے دل کو اس ناخن سے کہ جس سے بند قبا پورا نہ کھل سکا تھا گریہ کر زخمی کر لیں اس سے زیادہ اس ناکامی کا بدلہ اور کیا ہو سکتا ہے۔

تاراج کاوش غم بھراں ہوا آسہ سینہ کہ تھا دُفینہ گہرائے راز کا تاراج کرنا محاورہ ہے ایسے موقع پر بولا جاتا ہے جب غنیم کی فوج فتحیاب ہو کر شہر میں داخل ہوتی ہے اور اسباب وغیرہ لوٹنے پر دست دراز کرتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ مکانات کو بھی ڈھائی اور مسمار کرتی جاتی ہے۔ فرماتے ہیں بکاوش غم بھراں نے اے آسہ دل پر فتحیاب ہو کر اس کو لوٹ لیا اور برباد کر دیا۔ سینے میں جو کچھ رازِ عشق یا رازِ حقیقت کے خزانے چھپے ہوئے تھے وہ سب ظاہر ہو گئے۔

### عَنْدَل

بزمِ شاہنشاہِ ہر شعار کا دفتر کھلا رکھو یارب یہ درِ گنجینہ گوہر کھلا قلندرِ معلیٰ میں بعض بعض موقعوں پر متواتر مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ بالخصوص اخیر بادشاہِ ظہلِ سبحانی بہادر شاہ کے عہد میں اکثر ایسا ہوتا تھا۔ اسی کے متعلق فرماتے ہیں، بزمِ سخن شاہنشاہ میں مشاعروں کا دورِ دُورہ پھر شروع ہو گیا۔ وہ زمانہ وہ موسم آگیا جس میں ہفتہ وار مشاعرے جاری ہو گئے۔ گو بادِ دفتر سخن کھل گیا۔ دوسرے مصرع میں اس خوشگوار موسم کے لئے دُعا کرتے ہیں کہ الہی اس کانِ گوہر کے دروازے

کو ہمیشہ کھلا رکھنا۔

شب ہوئی پھر انجم رخشندہ کا منظر کھلا۔ اس تکلف سے کہ گویا بتکدہ کا در کھلا اس مطلع میں پھر اسی مضمون کو دوسرے لفظوں میں دہرایا ہے۔ فرماتے ہیں۔ رات ہوئی بزم سخن منعقد ہونے کا وقت آگیا۔ چمکنے والے ستاروں کا منظر کھل گیا۔ چمکنے والے ستاروں سے یہاں اشعار مراد ہیں۔ دوسرے مصرعہ میں فرماتے ہیں۔ اس تکلف سے وہ منظر کھلا ہے کہ گویا بت کدہ کا در کھلا۔ یعنی وہ انجم رخشندہ جو اشعار کے لباس میں ظاہر ہوتے ہیں۔ ایسے آراستہ و پیراستہ ہیں کہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ڈھلے ہوئے بت سامنے رکھ دیئے ہیں جو منہ سے بول رہے ہیں۔

گرچہ ہوں یواہر کیوں دست کا کھافل فریب آستیں میں شہ نہ پناہی تھ میں نشتر کھلا دشمن چھری کو کہتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔ میں ہوں تو دیوانہ لیکن دشمن دوست نما کا فریب نہیں کھاؤں گا۔ آستیں میں چھری چھپا کر لایا ہے اور چٹکی میں کھلا ہوا نشتر لے رکھا ہے۔ بظاہر فصد یعنی چاہتا ہے جو دیوانہ کا علاج ہے۔ اور دل میں قتل کا ارادہ رکھتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ظاہری دوست باطن میں دشمن ہو کرتے ہیں۔

گو نہ بھصوں سگی باتیں گو نہ پاؤں اسکا بھید پر یہ کیا کم ہے کہ مجھ سے وہ پری پیکر کھلا اس ردیف کو معمولہ کہتے ہیں۔ یہاں کھٹنے کے معنی بے تکلف ہو جانے کے ہیں۔ فرماتے ہیں اس کی پیچیدہ باتیں میں نہیں سمجھ سکتا اور اس کے پوشیدہ راز میں نہیں پاسکتا لیکن میں اسی میں خوش ہوں کہ مجھ سے وہ پری پیکر بے تکلف تو ہو گیا۔

ہے خیال حسن میں حسن عمل کا سا خیال خلد کا اک در ہے میری گور کے اندر کھلا فرماتے ہیں۔ میں خیال حسن یا میں ایسا محو ہو گیا ہوں کہ اب اس کو حسن عمل خیال کرتا ہوں اور اس خیال کرنے کی وجہ یہ واقع ہوئی ہے کہ خلد کی ایک کھڑکی میری قبر کے اندر رکھل گئی ہے۔ مطلب یہ ہے معشوق حقیقی کے تصور کامل نے مجھ کو عبادت کا کام دیا ہے اور

اسی کے ذریعہ سے میری بخشش ہو گئی ہے بخشش کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ جنت کا دروازہ قبر میں کھول دیا جائے۔

منہ نہ کھلنے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں زلف سے بڑھ کر نقاب اس شوخ کے منہ پر کھلا اس شعر کا یہ ٹکڑا کہ دیکھا ہی نہیں۔ مرزا صاحب کے حصہ کا ہے۔ معشوق حقیقی کا حسن و القرب کس نے دیکھا ہے شعر کی تشریح یہ ہے، باوجود اس قدر پردوں کے جو ظہور کیا۔ قلب عشاق پر ہوا ہے وہ ایسا ہے کہ اس کی صفت بیان ہو ہی نہیں سکتی۔ قاعدہ ہے سیا زلفیں گورے اور خوبصورت چہرے پر بے انتہا بھلی معلوم ہو کرتی ہیں۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں نقاب زلفوں سے بھی بڑھ کر خوشنما معلوم ہوئی۔ مرزا صاحب نے زمانہ قدیم کے موافق نقاب کو مذکر باندھا ہے۔ یہ بھی معلوم رہے کہ اب دلی والے بالاتفاق نقاب کو مؤنث استعمال کرتے ہیں۔

در یہ رہنے کو کما اور کہہ کے کیسا پھر گیا جتنے عرصے میں مرا لیٹا ہوا بستر کھلا شعر سیدھا اور صاف ہے۔ معشوق کی تلون مزاجی طبیعت کی شوخی، بالخصوص بدگمانی کی تصویر سادے لفظوں میں کھینچ کر دکھائی گئی ہے۔

کیوں اندھیری ہو شب غم ہو بلاؤں کا نزول آج اُدھر ہی کو رہے کا دیدہ اختر کھلا شب غم کی تکلیفوں سے گھبرا کر اپنے دل سے سوال پیش ہے کیا سبب ہے رات کیوں اندھیری ہے۔ گویا وہ اس ایسے گڑھے میں کہ وہاں میں کبھی کی بھی قابلیت نہیں رہی ہے پھر خود ہی صبح کو جواب دیتے ہیں۔ بلاؤں کا نزول ہے یعنی مجھ پر شبِ فراق میں آسمان سے بلاؤں نازل ہو رہی ہیں اور دیدہ اختر اُس کے تماشائی ہیں۔ اس لئے اتاروں نے اپنا سہ آسمان کی طرف کر لیا ہے۔ اگر تاروں کی روشنی ہوتی اور میں ان بلاؤں کو آسمان سے اُترتے ہوئے دیکھ سکتا تو شاید کچھ اپنی حفاظت کی تدبیر کر سکتا۔ اب یہ بات تو خیال میں آگئی کہ یہ رات شبِ غم ہے اس لئے اندھیری ہے مگر نزولِ بلا سے بچنے کی تدبیر

اندھیرا گھپ ہونے کے سبب سے کچھ سمجھ میں نہیں آتی۔

کیا رہوں غربت میں غمِ شب جو ادا کا خیال نامہ لاتا ہے وطن سے نامہ بر اکثر کھلا  
فرماتے ہیں میں وطن کی تکلیفوں سے بچ کر پردیس میں آ رہا تھا مگر مسافت میں بھی حادثوں  
کی یہ کثرت ہے کہ جو خط نامہ بر وطن سے لاتا ہے وہ کھلا ہوا ہوتا ہے۔ یعنی کسی نہ کسی عزیز کی  
خبر مرگ درج ہوتی ہے۔ اس صورت میں یہاں بھی خوش نہیں رہ سکتا۔ ہندوستان کی رسم  
ہے کہ میں خط میں کسی کی موت کا واقعہ تحریر کیا جاتا ہے اس خط کا ایک کنارہ بھی کتر  
لیتے ہیں اور لغافہ بھی نیم دار رکھتے ہیں۔

اسکی آمت میں ہمیں میں یکے میں کچھ کلام بند واسطے جس شہ کے غالب گنبد بے در کھلا  
یہ مقلعہ غم ہے شبِ سراج کا واقعہ کس خوبصورتی سے کیسے مختصر جملے میں ادا ہو گیا ہے یعنی  
گنبد بے در کا کھلنا بتا رہا ہے کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شبِ سراج میں  
آسمان پر تشریف لے گئے تھے۔

### غزل قطعہ بند

شب کے برقِ سوزِ دل سے زہرہ ابرو آج تھا شعلہ جوالہ ہر یک حلقہ گر و اب تھا  
فرماتے ہیں۔ رات کو میرے سوزِ دل کی بجلی سے ابر کا پتہ پانی ہو گیا تھا اور جو بھنور اس میں  
پڑا تھا وہ ایک شعلہ جوالہ بن گیا تھا۔

واں کرم کو عذر پارش تھا عنایتِ خرام گریہ سے یاں پنبہ باش کفِ سیلاب تھا  
وہاں تو اس کو سینہ برسنے کا بہانہ مل گیا تھوڑے صل کا وعدہ کیونکر ایفا ہو سکتا تھا اور یہاں  
اس کے انتظار میں یہ حال تھا کہ روتے روتے ٹکیہ کی روئی گریا پانی کا جھاگ بن گئی تھی۔  
واں خود آرائی کو تھا موتی پر مینے کا خیال یاں ہجومِ عشق میں تاہنگہ نایاب تھا  
وہاں تو اس کی خود آرائی بناؤ سنگار کے لئے موتی پر وہی تھی اور اس مصروفیت میں  
وعدہ بھی فراموش ہو گیا تھا۔ یہاں یہ حال تھا کہ انتظار میں روتے روتے یہ نوبت پہنچ گئی

تھی کہ آنسوؤں کی کثرت نے تارِ نظر کو بھی ملم کر دیا تھا۔ دعا یہ ہے کہ معشوق چاہتا تھا کہ ظاہری آرائش میں کوئی کمی اور کسر نہ رہ جائے اور عاشق کا شوق اس بات کا مستقام تھا کہ وصل کی گھڑی جلد آجائے۔ خود آرائی اور مینائی شوق کی تصویر اس سے بہتر فطرت میں کھینچ نہیں سکتی۔

جلوہ گل نے کیا تھاواں چراغاں آج  
یاں رواں مرزاں چشم تر سے خونِ ناب تھا  
وہاں تو اس کثرت سے پھول کھلے ہوئے تھے کہ ان کے عکس سے نہر کے پانی میں چراغِ روشن نظر آتے تھے اور یہاں خون کے آنسوؤں کی طرح آنکھوں سے بہ رہے تھے۔

یاں سر پر شور بے خوابی سے تھا دیوانہ جو  
واں وہ فرقِ نازِ محبوبِ بالِش کھواب تھا  
فرماتے ہیں۔ میرا سر شوریدہ جس میں عشق و محبت کا جوش بھرا ہوا تھا، فرقت کی مینائی اور بخوابی سے دیوانہ ڈھونڈ رہا تھا (مرزا صاحب دیوانہ سے سر بھڑک کر مر جانے کی تکلیف کو فرقت میں جاگنے کی ایذا پر ترجیح دیتے ہیں) دوسرے مصرع میں بمقابلہ اپنی حالت کے معشوق کی حالت پر رشک کرتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ وہ فرقِ نازِ محبوب کے حکموں پر رکھا ہوا تھا۔ وہ آرام سے سوتا تھا اور میں سر بھڑکنے کی جستجو میں تھا۔

یاں نفس کرتا تھا روشن شمع بزمِ بخودی  
جلوہ گل واں بساطِ صحبت احباب تھا  
فرماتے ہیں۔ یہاں ہماری گرم آہیں شمع کی طرح روشن ہو گئی تھیں۔ شمع سے سانس کے ساتھ شعلے نکل رہے تھے اور وہ شعلے ہماری بخودی عشق میں اضافہ کر لے جاتے تھے وہاں فرش پر بچکوں کا بچھونا ہو رہا تھا اس پر صحبتِ احباب گرم تھی۔ یعنی رقیبوں سے بیچھے ہوئے ہنس بول رہے تھے۔

فرش سے تا عرش اں طوفاں تھا موجِ جنگ  
یاں زمین سے آسماں تک آسمانِ جنگِ فتن کا باب تھا  
اس شعر میں ترتیب بدل دی ہے۔ پہلے مصرع میں معشوق کی حالت دکھائی ہے۔ فرماتے ہیں زمین سے آسماں تک وہاں خوشی کی لہروں کا ایک طوفان برپا تھا (کثرت کے لئے)

طوفان کا لفظ استعمال کیا ہے) یاں زمین سے آسمان تک ہمارے جھلانے کے لئے آگ بھری ہوئی تھی یعنی مسرت۔ افسوس۔ رنج۔ رقیب۔ جوشِ محبت۔ اضطرابِ دل۔ یہ ساری بلائیں ہم کو تکلیف پہنچا رہی تھیں۔ اپنی اور معشوق کی حالت کا تعادل مطلق سے قطع تک جس فتن و خوبی کے ساتھ کیا ہے اس کا لطف اہلِ مذاق اٹھا سکتے ہیں۔

ناگماں اس رنگ سے خونناہ ٹپکانے لگا۔ دل کہ ذوق کاوشِ ناخن سے لذتِ یاب تھا۔ یہ شعر گریز کا ہے۔ اوپر جو کچھ بیان ہو چکا ہے اس کو ختم کرنے کے بعد فرماتے ہیں ناگماں یعنی بیک اس طرح سے دل میں آنگ پیدا ہو گئی کہ دوسری غزل اس زمین میں اور لکھنی چاہئے۔ اس کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔ اس رنگ سے خونناہ ٹپکانے لگا۔ وہ دل جو کاوشِ ناخن سے لذتِ یاب ہو چکا تھا۔

### عزل

نالہ دل میں شبِ نازِ اثرِ نایاب تھا۔ تھا پسندِ بزمِ وصلِ غیر کو بیتاب تھا۔ پسند کا لانا نہ جو اکثر بچوں پر سے نظر اُٹارنے کی غرض سے جلا کر اس کی دھوئی دیتے ہیں مرزا صاحب فرماتے ہیں۔ رات کو نالہ دل میں مطلق اثر نہ تھا۔ ہمارا دوست بزمِ غیر میں تھا اور وہ نالہ جو نہایت بیتاب تھا اور اپنے اضطراب کی وجہ سے بار بار زبان پر آجاتا تھا۔ بزمِ غیر کے لئے کالا دانہ بن گیا تھا۔ یعنی بزمِ غیر کو نظر بہ سے بچا رہا تھا۔ نالہ کی بے آخری بالکل بھوتے خیال کے ساتھ نئے الفاظ میں دکھائی گئی ہے۔

مقدم سیلابِ دل کیا نشاۃ آہنگ ہے۔ خانہٴ معاشقِ مگر سازِ صدائے آب تھا۔ مطلب یہ ہے۔ سیلاب کے آنے سے میرا دل بہت ہی نشاۃ انگیز ہے۔ شاید میرا گھر صدائے آب سے ساز کا ہمسر ہو گیا تھا۔ ساز سے یہاں جلتراگ مراد ہے جو چینی کے سات پیالوں میں پانی بھر کر ایک چھوٹی تے کے ذریعہ سے بجایا جاتا ہے۔

نازش آیام خاکستر نشینی کیا کہوں پہلوئے اندیشہ وقت بسترِ سنجاب تھا  
 سنجاب کا پرستین بنا کر پہنا جاتا ہے۔ اس پرستین کو بھی سنجاب کہتے ہیں۔ خاک کی جگہ کا  
 ہے۔ فرماتے ہیں۔ میں جس زمانے میں خاک نشین تھا اُس زمانے کے غرور اور تکبر کا کیا  
 حال بیان کروں۔ اپنے خیال میں ایسا سمجھتا تھا گویا مسندِ سنجاب پر بیٹھا ہوا ہوں۔  
 مطلب یہ ہے کہ قناعت اور گوشہ نشینی بھی بہت کم کبر و غرور سے خالی ہوتی ہے۔  
 کچھ نہ کی اپنے جنونِ نارسانے وسیلہ ذرہ ذرہ روکشِ خورشیدِ عالم تاب تھا  
 کچھ نہ کی یعنی اچھی بات نہ کی۔ ہماری سچی کر دی۔ جنونِ نارسانے یہاں مراد عشقِ ناقص  
 ہے۔ فرماتے ہیں عشقِ ناقص نے ہم کو جلوہٴ دوست سے فیضیاب نہ ہونے دیا۔ ورنہ  
 یہاں یعنی دُنیا میں تو ایک ایک خاک کا ذرہ خورشیدِ عالم تاب بنا ہوا تھا۔ افسوس ہے کہ  
 اکتسابِ فیض سے محروم رہے اور تجلیاتِ نور انہی نہ دیکھ سکے۔

### قطبہ

آج کیل پروا نہیں اپنے اسیروں کی مجھے کل تک تیرا بھی دل مہر و وفا کا باب تھا  
 فرماتے ہیں۔ یہ آج نئی بات کیا ہے کہ تو اپنے اسیروں سے بے پروا ہو گیا۔ کل تک تو تیرا دل  
 وفا اور محبت کا دروازہ بنا ہوا تھا۔

یاد کرو وہ دن کہ ہر اک حلقہٴ تیرے دام کا انتظارِ صید میں اک دیدہٴ بخواب تھا  
 فرماتے ہیں۔ وہ دن بھی مجھ کو یاد ہے کہ تیرے جال کا ہر حلقہٴ شکار کے انتظار میں دیدہٴ بخواب  
 بنا ہوا تھا۔ حلقہٴ دام کی تخیل دیدہٴ بے خواب سے جو نیند نہ آنے کی وجہ سے ہر وقت  
 کھلا رہتا ہے (میں قدرِ بلیغ واقع ہوئی ہے۔

میں نے روکاراتِ غائب کو درگزر نہ کی تھی اُس کے سیلِ گریہ سے گردوں کو سیلاب تھا  
 فرماتے ہیں۔ رات کو میں نے غائب کو درگزر نہ کیا۔ ورنہ تم تماشہ دیکھتے کہ اُس کا  
 سیلِ گریہ آسمان تک پہنچ کر آسمان کو ایک پانی کا بُلبلا بنا دیتا۔



## عَنْزِل

ایک ایک قطرے کا مجھے دینا پڑا حساب خون جگر و دیت خرگانِ یار تھا  
 مینی آنکھوں سے اس قدر خون جاری رہتا ہے۔ مگر آجگر میں جتنا خون تھا وہ خرگانِ  
 یار کی امانت تھی اور اس لئے اُس کے ایک ایک قطرہ کا حساب اسی طرح دینا پڑے گا  
 جس طرح امانت کا حساب دینا پڑتا ہے (از یادگار غالب)

اب میں ہوں اور ماتم یک سہمرا زرد توڑا جو تو نے آئینہ تماشال دار تھا  
 فرماتے ہیں تو نے آئینہ اس حالت میں توڑا ہے کہ جب تو اس میں اپنا منہ دیکھ رہا تھا اور  
 تیرا عکس اس میں نظر آ رہا تھا تو آئینہ میں اپنا تماشا لائی تھا اور میں یہ موقع غنیمت سمجھ کر  
 تجھ کو دیکھ رہا تھا۔ میرے دل میں سینکڑوں آرزوئیں، ہزاروں تمنائیں، لاکھوں خواہشیں  
 جوش مار رہی تھیں، تیرے غمزدہ مس نے یہ گوارہ نہ کیا کہ تو اپنا تماشائی آئینہ میں دیکھتا  
 تو نے آئینہ توڑ ڈالا اور اس کے ٹوٹ جانے سے میری تمام آرزوئیں خاک میں مل  
 گئیں۔ مگر آ آرزوؤں کا ایک آباد شہر تیرے آئینہ توڑ دینے سے برباد ہو گیا۔

گلیوں میں میری نقش کر کھینچے پھر واکریں جاں دادہ ہوائے سررنگزار تھا  
 فرماتے ہیں میں نے رنگزار مشوق کی آرزو میں جان دی ہے میرے اس بے مثل انجام کا انعام  
 مجھ کو یہ ملنا چاہیے کہ لوگ میری نقش کو گلیوں میں کھینچے پھر میں۔ نزاکت و لطافت  
 معانی اس شعر میں یہ رکھی گئی ہے کہ مشوق کی اس گلی کا پتہ نہیں دیا گیا جس کی آڑ  
 میں جان دی گئی ہے صرف یہ ارشاد ہوتا ہے کہ میری نقش کو گلیوں میں کھینچے پھر  
 اور دل میں یہ خیال ہے کہ رفتہ رفتہ لوگ میری نقش کو مشوق کی گلی میں بھی لے  
 جائیں گے۔ یوں دلی مدعا حاصل ہو جائے گا۔ یہ ندرت معانی غالب ہی کے شعر میں  
 ہو کر رہی ہے۔

دو جِ سراپِ شبتِ وفا کا نہ پوچھاں ہر ذرہ مثل جو ہر تیغِ آبدار تھا



وائے دیوانگی شوق کہ ہر دم مجھ کو آپ جانا اُدھر اور آپ ہی حیراں ہونا فرماتے ہیں۔ دیوانگی شوق۔ یعنی کثرتِ شوق نے مجھ کو ایسا خود رفتہ بنا دیا ہے کہ میں بار بار مستحقِ حقیقی کا مشتاقِ جمال ہو کر اپنی خودی سے گزر جاتا ہوں اور نارسائی کی وجہ سے حیران ہو کر سوچتا رہتا ہوں کہ ہیں نہیں کہاں اور اس کا دیدار کہاں۔

جلوہ از بسکہ نقاضائے نگہ کرتا ہے جو ہر آئینہ بھی چاہے ہے خرگاہ ہونا فرماتے ہیں۔ جلوہ یار بار بار یہی کتاب ہے کہ مجھے دیکھ آئینہ نولادی کا جو ہر خرگاہ بنا چاہتا ہے۔ اس لئے کہ آئینہ کو آنکھ سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ اس بیان میں مرزا صاحب نے جو خوبی رکھی ہے وہ آئینہ سے زیادہ روشن ہے۔

عشرتِ قتل گم اہل تمناست پوچھ عیدِ نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا فرماتے ہیں۔ قتل گاہ میں اہل تمناس کی خوشی کا حال مت پوچھو۔ شمشیر یار کا عریاں ہونا شہادتِ طلب لوگوں کے لئے عیدِ نظارہ ہے شمشیر کو ہلال سے تشبیہ دی جاتی ہے اور رمضان مبارک کا چاند دیکھ کر تلوار دیکھ کر کہتے ہیں۔ یہاں شمشیر کا دیکھنا ہلالِ عید دیکھنے کے متبادل کما گیب ہے۔ اور یہ معنی شعر کے الفاظ سے بغیر فکر و غور کے نکل آتے ہیں۔

لے گئے خاک میں ہم دواغِ تنائے نشاط تو ہو اور آپ بصد رنگِ گلستاں ہونا فرماتے ہیں۔ ہم تو دواغِ تنائے نشاطِ قبر میں لے چلے۔ اب تو ہو اور تنہائی کے عالم میں تجھ کو سو سو طرح سے بارغ کی مانند پھلنا پھونا نصیب ہو۔

عشرتِ پارہ دل زخمِ تمنا کھانا لڈ۔ ریش بگر غرقِ تمنا۔ واں ہونا یہ شعر دو نکات ہے۔ اور دو نکات شعر میں اکثر فضلِ محدث ہوتا ہے۔ اس خوبی کے ساتھ دونوں مصرعوں کا کائنات کی قول ٹکا ہونا مرزا ہی جیسے کامل فن کا کام ہے۔ معنی شعر کے یہ ہیں۔ دل کے ایک ایک پارہ کا زخمِ تمنا کھانا یا مٹِ عشرت و شادمانی ہے اور زخمِ بگر

کاتھک داں میں سر تاپا ڈوبا ہوا ہونا لذتِ عشق حاصل کرنے کی دلیل ہے۔  
 کی برے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ لے لی۔ اُسے اُس زود پشیمان کا پشیمان ہونا  
 دوسرے مصرعہ میں طنزاً بطور استعارہ کے دیر پشیمان کی جگہ زود پشیمان کہا گیا ہے یہ دینا  
 استعارہ ہے جیسا قرآن مجید میں اُنْذِرْهُمْ هَٰذِهِ جُغْدٌ مِّمَّا يَخْلُفُ اَبْرَہِمَ کہا  
 گیا ہے۔ شعر کا مطلب یہ ہے۔ برے قتل کے بعد اُس نے جفا و ظلم سے توبہ کر لی۔ ہائے اُس  
 جند پشیمان ہو جانے والے کا پشیمان ہو جانا۔ یعنی زندگی بھر تو اپنے ظلم سے پشیمان نہ ہوا  
 اور قتل کے بعد جب کام قبضہ اختیار سے باہر ہو گیا تو پشیمان ہوا۔ اس زود پشیمان کے  
 لفظ کا مزا بیان نہیں ہو سکتا۔ یہ وجدانی کیفیت ہے۔ تحریر میں نہیں آ سکتی۔ بل غنائی  
 ہی کچھ اس کا طعم اٹھا سکتے ہیں۔

میں اس چارہ گرہ کپڑے کی قسمت غالب جسکی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں بڑا  
 ایسے بلند شعر کے بعد ایسا عالی رتبہ مطلق کہنا حضرت غالب ہی کا کام تھا۔ عالمِ وحشت میں جنوں  
 کے اتھ سے گریباں دھجیاں ہوتا ہے۔ بحر میں خود عاشق اپنے گریباں کا ایک ایک تار الگ  
 کرتا ہے۔ دل میں محشوق کی دست درازیاں گریباں عاشق کے پُرنے لڑائی میں اور پھر  
 وہ گریباں کا کپڑا کتنا ہے۔ صرت چار گرہ۔ اس تخصیص کو تو دیکھیے۔

### عزل

شبِ خمار شوقِ ساقیِ رست خیز انداز تھا تا محیطِ بادہ صورتِ خائے خمیازہ تھا  
 فرماتے ہیں۔ رات کو شوقِ ساقی نے طول کھینچ کر خمار کی صورت اختیار کر لی تھی۔ خمارِ شب کے  
 اُتار کی حالت کو کہتے ہیں۔ رست خیز انداز تھا۔ یعنی قیامت کی سی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔  
 جس طرح قیامت کے دن مَرُوے قبروں سے اُٹھیں گے۔ اسی طرز جو چیز جہاں لگی ہوئی  
 تھی وہ بلند ہوئی شروع ہو گئی یاں تک کہ شراب کا احاطہ یعنی جس طرف میں شراب۔  
 رکھی ہوئی تھی وہ بھی انگریزی کی طرح اپنے مقام سے اُبھرتا معلوم ہوتا تھا۔ تادمہ ہے

خرب خوار کو نشہ کے استار کے وقت جہاں اور انگڑائی آتی ہے۔ انگڑائی میں ہاتھ بندہ ہو کر آپس میں مل جاتے ہیں اور یہی شکل رنجیز کی ہے یہ مطلب خمر کا یہ ہے کہ میری طرح انتظار سانی میں شیشہ کے اندر خرب کو بھی انگڑائیاں آنے لگی تھیں خرب میں جوش آجائے گا انگڑائی سے نشیدہ دی ہے جو مرزا صاحب کے عقل کی بلند پروازی کا ایک ادنیٰ نمونہ ہے۔

ایک قدم دشت کے در میں نذر امکاں کھلا جادہ اجزائے دو عالم دشت کا شیرازہ تھا فرماتے ہیں۔ ابھی میں نے ایک ہی قدم دشت میں بڑھایا تھا کہ نذر امکاں کا سبق میرے سامنے آگیا اور مجھ کو معلوم ہو گیا کہ جادہ دشت دو عالم کے اجزاء کا شیرازہ تھا یعنی دونوں جہان کی کیفیت مجھ پر شکست ہو گئی۔

مانع دشت خزاں پہلے کیلی کون ہے خانہٴ مجنون صحرا اگر دے دروازہ تھا یہ مضبور ہے کہ یہی کئی بار کشش محبتِ قیس سے مجبور ہو کر بسواری محل دشتِ مجنون گئی ہے اور بخود غمازی سارا بنایا بس عصمتِ مجنون سے مل نہ سکی۔ اس کے قریب ہو کر گزر گئی۔ مرزا صاحب اس فقرہ کی طرف کنایتہ اشارہ کرنے کے بعد یہ فرماتے ہیں کہ "خانہٴ مجنون صحرا اگر دے دروازہ تھا" یعنی یہی کاروکنے والا دروازہ کوئی دروازہ نہ تھا پھر کیا سبب مانع ہوا کہ یہی وجود کششِ عشق کے مجنون تک نہ پہنچ سکی۔

پوچھ مت سوانی اندازِ استغنائے حسن دست مرہونِ خسارِ رخنِ غائزہ تھا فرماتے ہیں۔ جو لوگ حسنِ مشوق کو بناؤ سنگار سے مستفیق ملتے ہیں وہ گریا حسن کے استغنا کر کسوا اور بدنام کرتے ہیں۔ حسنِ معشوق مندی کا منت پذیر ہے اور خسارِ مشوق غمازہ کا گد ہے مطلب یہ ہے کہ ہاتھ کو حنا کی اور خسار کو غمازہ کی احتیاج ہے اور یہ دونوں چیزیں باعثِ آراکشِ حسن ہیں۔

اللہ دل سے دیے اور راقِ نعتِ دل بجاں یادِ حجازِ الہ اک دیران بے شیرازہ تھا

اس شعر میں مرزا صاحب اپنے کمال شاعری کی طوط اشارہ کر کے فرماتے ہیں کہ میرے  
 دل کے ٹکڑے یعنی میرے عالی مضامین جو نالہ دل کی صورت میں بے اختیار میری زبان  
 سے نکل گئے تھے اُن کو میرے جوش طبعیت نے اور ارق دل بنا کر ہوا پر اُڑا دیا مطلب  
 یہ ہے کہ میرے اچھوتے خیالات کو عالم میں پھیلا دیا۔ اب جو میں نے خیال کر کے دیکھا تو  
 ”یادگار نامہ اک دیوان بے شیرازہ تھا“ یہ آثارہ اُس اُردو دیوان کی طوط ہے۔ اسی  
 مضمون کو فارسی میں بھی ادا کیا ہے، وہ یہ ہے س  
 مائے بردیم بدیں مرتبہ انشی غائب شمر خرد خواہش آں کر دگر دروغِ نیا

### عزل

دوست غنچواری میں میری سخی فریاد کیا زخم کے بھرنے تلک ناخن بڑھ آئیں گے کیا  
 فرماتے ہیں۔ دوست میری غنچواری میں کیا کرشنش رستی کریں گے (لفظ کیا) سے سوال  
 پیدا ہوتا ہے اور اس میں مرزا صاحب نے لطف یہ لکھا ہے کہ ان کی کرشنش کو سمجھ کر  
 ان سے سوال کیا ہے اور پھر اس سمجھے ہوئے معاملہ کو دوسرے مصرعہ میں خود ہی ظاہر  
 کر دیا ہے یعنی ”زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا“ اس مطلب کو اس  
 خوبی کے ساتھ بیان کرنا کہ دوست غنچواری میں اس سے زیادہ کیا کرشنش کر دے،  
 کہ میرے ناخن کاٹ ڈالیں گے۔ میں زخم کو دیرانگی کی حالت میں جو ناخن سے کر رہا  
 رہتا ہوں اور اچھا نہیں ہونے دیتا ناخن کٹ جانے کے بعد زخم کے جلد اچھا ہو جائیگی  
 اُمید کی جاتی ہے۔ میں اپنے دوستوں کے مقابلہ میں بہ سرفراز ہوں کہ جب تک  
 زخم مندمل ہوگا میرے کٹے ہوئے ناخن بھی بڑھ جائیں گے اور ان کی ساری کرشنش  
 دم بھر میں بیکار ہو جائے گی۔ اس لئے کہ میں زخم کو پھر گرا کر لوں گا۔

بے نیازی سے گزری بندہ پرور کب تک ہم کہیں گے حال دل دراپ فرمائیں گے کیا  
 معشوق ہے خطاب کر کے فرماتے ہیں بندہ پرور آپ کی بے نیازی، حد سے گزرتی ہے۔ کب تک یہی

حالت رہے گی کہ ہم اپنا حال دل عرض کریں گے اور آپ بے پروائی سے ”کیا فرمادیں گے۔ یعنی کیا کہا ہم نے نہیں سنا۔ دوسرا پہلو لفظ ”کیا“ سے طنز کا نکتہ ہے یعنی جو کچھ تو نے کہا وہ جھوٹ کا۔ اس شعر میں ”کیا“ کا ایک پہلو استفسار ہے اور دوسرا پہلو طنز ہے۔

حضرت ناصح جو آئیں دیدہ دل فرش راہ کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا کہ سمجھائیں گے کیا اس شعر سے جو مرزا صاحب کی شوخی طبع جو اس کا خاص امتحان طبعیت ہے ظاہر ہوتی ہے یعنی ایک مصرعہ میں حضرت ناصح کی یہ وقعت و عزت ظاہر کی جاتی ہے انکی شریف آوری کے وقت دیدہ دل فرش راہ ہیں اور دوسرے مصرعہ میں ان کی فہمائش کو اس حقارت سے بیان کیا جاتا ہے کہ وہ مجھے کیا سمجھا سکتے ہیں۔ اُن کی ہستی کیا ہے۔

آج دل تیغ و کفن باندھ ہو جاتا ہوں غدر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائیں گے کیا یعنی قتل کرنے میں سب سے بڑا غدر یہی ہو سکتا ہے کہ ہمارے پاس اس وقت تلوار نہیں ہے اس غدر کو میں نے پہلے ہی سے مٹا دیا ہے کہ میں خود تلوار باندھ کر جاتا ہوں اور کفن بھی ساتھ باندھ لیا ہے۔ کفن ساتھ باندھ لینے سے شعر میں یہ لطف پیدا ہو گیا کہ مجھ سے بڑھ کر اور کون سرفروش ہو سکتا ہے کہ میں کفن باندھ کر آیا ہوں۔

گر کیا ناصح نے ہم کو قید اچھایوں ہی! یہ جنون عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا نوبی اس شعر میں یہ ہے کہ ناصح کو قید کرنے والا بتایا ہے۔ حالانکہ ناصح کسی کو قید نہیں کرتا۔ ترک عشق کی نصیحت کیا کرتا ہے۔ بار بار مجھانے اور مجبور کر کے اپنے پاس بٹھانے کو مرزا صاحب قید کر لینے سے تعبیر کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ یہ جنون عشق کے انداز چھٹ نہیں سکتے ہم ناصح کے سامنے بھی اپنے خیالات میں مستغرق رہتے ہیں۔

خانہ زاد زندہ ہیں بغیر سے بھائیں گے کیوں ہیں گرفتار و فانی زندہ سے گھبرائیں گے کیا شعر دو مختلف ہے۔ دونوں مصرعے برابر کے واقع ہوئے ہیں مطلب صاف ہے۔ زنجیر

سے اس لئے نہیں بھاگ سکے کہ خانہ زاد زلف ہیں اور زنداں سے یوں نہیں گھبرا سکتے کہ گرفتارِ وفا ہیں پہلے ہی سے زنجیرِ زلف اور طوقِ وفادارست و گردن میں آویزاں ہے۔ ہے اب اس سمورہ میں غوطہ غمِ اُلفت اُسد ہم نے اُنکے دلی میں میں کھائیں گے کیا فرماتے ہیں۔ ہماری غذا تو غمِ اُلفت ہے۔ اور غمِ اُلفت اُسی وقت نصیب ہوتا ہے جب انسان کسی پر عاشق ہو جائے۔ دلی میں غمِ اُلفت کا قوط ہے یعنی یہاں اب ایسے مشوق نہیں ہیں جن سے اُلفت کی جائے۔

### عزل

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا مرنے پر اپنے دل کو تسکین دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ ہماری قسمت میں وصالِ یار گناہی نہیں ہے اور اگر اور بھی زندہ رہتے تو بھی یہی انتظار ہوتا جو اب تک رہا۔ انتظار اس لئے رہا کہ دل عاشق کبھی وصلِ مشوق سے ناامید ہوتا ہی نہیں۔

تسے دھم پر جسے ہم تیرے جان بھوٹ جانا کہ خوشی سے مر نہ بات اگر اُفتاب ہو مشوق سے مخاطب ہو کہ فرماتے ہیں۔ تو جو ہم کو یہ الزام دیتا ہے کہ وعدہ دل کن کر تجھ کو مر جانا چاہئے قتل یہ ٹھیک ہے۔ مگر ہمارا زمانہ رہنا اس وجہ سے ہوا کہ ہم نے تیرے وعدہ کو غلط سمجھا۔ اگر ہمیں اعتبار ہوتا تو سرورِ شادی مرگ ہو جلتے۔

تیری ازاد ہے جا اگر بندھا تھا عہدِ برباد کبھی تو نہ توڑ سکتا اگر اتوار ہو فرماتے ہیں۔ تیری نزاکت مانع عہد شکنی ہے۔ اس نزاکت پر جو نے عہد توڑا تو ہم کو معلوم ہو گیا کہ عہدِ برباد بندھا تھا۔ اگر مضبوط بندھا تو تجھ سے نہ ٹوٹ سکتا۔ کس خوبی سے منو کو الزام عہد شکنی سے رہ گیا ہے اور اپنے دل کو تسلی دی ہے۔

کوئی میرے دل سے لوجھے تیرے تیریم کش کو دلش کماں سے ہوتی جو جگر کے یار ہوتا تیریم کش وہ تیرمیں کے چھوڑتے وقت کمان پوری نہ کھینچی تھی ہو۔ مشوق تیرے جگر میں الجھا ہوا دیکھ



شر ۱۱ اور غفل ہو جائے اور اپنے دل میں کہتا ہے کہ کہیں میرا تیرا اس کے جگر سے پار نہ ہوا۔  
مرزا صاحب اُس کی شر نہ مانی تو ان لفظوں سے ملتا ہے کہ تیرے تیر خیم کش کو کوئی  
میرے دل سے پوچھے: قاعدہ ہے تیرے زخم میں رہ جانے سے بہ نسبت اُس کے پار  
ہو جانے کے زخمی کو زیادہ تکلیف ہوتی ہے اور منشوق اسی واسطے تیرا تلوار کا وار کرتا  
ہے کہ عاشق کو زیادہ ایذا پہنچے۔

یہ کہاں کی دوستی ہو کہ بے ہوش ناصح کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غمگسار ہوتا  
دوستوں کی شکایت میں فرماتے ہیں۔ یہ کیسی دوستی ہے کہ ہر دوست ناصح بن کر ترکِ عشق  
کی فہمائش کرتا ہے۔ اگر دوستی کا دعویٰ تھا تو میرے دردِ عشق کا علاج کیا ہوتا اور دفع  
غم کی تدبیر سوچی ہوتی۔

گلابِ سنگ سے چمکتا رہے کہ پھر نہ چمکتا جسے غم سمجھ رہے ہو وہ اگر شرار ہوتا  
فرماتے ہیں تم جس کو غم سمجھتے ہو۔ یہ اگر شرار ہوتا تو پھر کی رگوں سے بھی اس طرح موج جاری  
ہو جانا کہ پھر کبھی نہ ختم سکتا۔ مگر وہ شر نہیں بلکہ شر سے زیادہ جالانے والی شے ہے  
اس کو انسان ہی برداشت کر سکتا ہے۔ پتھر میں یہ طاقت نہیں کہ وہ اس تکلیف  
کو سہہ سکتا۔

غم اگر یہ جاگسل ہے یہ کہاں کہیں دل ہے غمِ عشق گر نہ ہوتا غم روزگار ہوتا  
اول مضرعہ کا دوسرا حصہ: یہ کہاں کہیں کہ دل ہے۔ یہ ثابت کر رہا ہے کہ دل محدود  
آفات اور مخرنِ رنج و آلام پیدا کیا گیا ہے۔ یعنی دل کے لئے غم کا ہونا لازمی اور ضروری  
ہے۔ اگر غمِ عشق نہ ہوتا تو غم روزگار ہوتا۔ غمِ عشق میں یہ خصوصیت ہے کہ وہ جاگسل  
بھی ثابت ہوا۔

سہو اُس سے کہ کیا شبِ غم بڑا بلا ہے مجھے کیا برا تھا مرزا اگر ایک بار ہوتا  
فرماتے ہیں شبِ غم کی کیا حقیقت بیان کروں۔ وہ موت سے زیادہ تکلیف دینے والی

بلا ہے۔ مرنا جس کو زلمے میں کوئی انسان پسند نہیں کرتا ساری دُنیا جس سے گھبراتی اور ڈرتی ہے، اس تکلیف خُش بغم کے مقابلہ میں میرے لئے وہ بھی اچھا تھا۔ شبِ غم میں تو ہزاروں بار مجھے مزار پڑتا ہے۔ موت کی ایذا اٹھاتا ہوں اور پھر نہیں مڑتا۔ شبِ غم کو موت پر کس خوبی سے ترجیح دی ہے۔

مجھے ہم جو مر کے رُسا ہوئے کیوں غرقِ دریا نہ کہیں جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا فرماتے ہیں۔ ہم مرنے کے بعد متہم و مجرم ہی رہے۔ اگر ہم غرقِ دریا ہو جاتے تو نہ بسا جنازہ اٹھتا نہ مزار کا نشان باقی رہتا۔

اُسے کون دیکھ سکتا کہ گمان ہے وہ کیسا جو دوئی کی بُو بھی ہوتی تو کہیں دریہ رہتا مشفقِ حقیقی کی یکتائی کا ثبوت مرزا صاحب نے اُس کے دو چار نہ ہونے سے دیا ہے یعنی اگر کتنا نہ ہوتا اور دوئی کی ذرا سی بھی جھلک ہوتی تو ضرور کہیں نہ ہمیں نظر آ جاتا۔

یہ مسائل تصوف یہ ترا بیانِ غالب تجھے ہم دلی سمجھتے جو نہ بادِ خوار بر یہ دونوں باتیں مرزا صاحب کی خصوصیات میں سے ہیں۔ ایک اسلوبِ بیان و دوسرے تصوف کا رنگ۔ حضرت استاد ہی مولانا حالی مرحوم نے یادگارِ غالب میں اس مقطع پر یہ لطیفہ تحریر فرمایا ہے کہ جس وقت یہ غزل بادشاہ کو سنائی تو بادشاہ نے مقطع سُنی کر کہا بھئی ہم تو جب ایسا نہ سمجھتے۔ مرزا صاحب نے فرمایا۔ حضور تو اب بھی ایسا ہی سمجھتے ہیں۔ مگر یہ اس لئے ارشاد ہوا ہے کہ میں اپنی ولایت پر مغرور نہ ہو جاؤں۔

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا نہ ہو مرنا تو جینے کا مزاکا یہاں نشاط کے معنی اُتک کے ہیں۔ فرماتے ہیں۔ کام کرنے کی اُتک جو دلوں میں پیدا ہو گئی ہے وہ صرف اسی وجہ سے ہے کہ دُنیا میں رہنے کا زمانہ تھوڑا ہے۔ اگر مرنا نہ ہوتا تو جینے کا کچھ مرنا نہ تھا۔ زمانہ کی چیل پیل کا محک یہی خیال ہے کہ موت سر پر کھڑی ہوئی ہے جو کچھ کرنا ہے جلد انجام دے۔ ورنہ قاعدہ ہے جس قدر فرصت زیادہ ہوتی ہے آدمی اُن کی

تجاہل سے کام انجام دیتا ہے۔ بے مثل مطلع کھاتا ہے۔

تجاہل پیشگی سے مدعا کیا کہاں تک اسے سراپا ناز کیا

فرماتے ہیں۔ جب دیکھو تم تجاہل کو کام میں لانے ہو۔ آخر تمہارا دلی منشا کیا ہے۔ یعنی ہر بات پر تم کیا کہہ دیتے ہو۔ کوئی بات سننے اور سمجھنے ہی نہیں ہو۔

نواز شہمائے بجا دیکھتا ہوں شکایت ہائے رنگیں کا گلا کیا

یعنی رقیب پر حمزائی رعایتیں بے محل دیکھتا ہوں۔ اور جب محبت بھرے الفاظ میں تم سے اس کا گلا کرتا ہوں تو تم مجھ سے اُلٹی شکایت کرنے لگتے ہو۔ یہ کیا بات ہے کچھ بتاؤ تو ہوں۔

نگاہ بے محابا۔ بے مہیا با چاہتا ہوں تغافل ہائے تمکین آزمائیا

نگاہ بے محابا۔ بے تکلف اور بے محاب ہو کر دیکھنا۔ فرماتے ہیں مجھ سے آنکھیں چار کرو میں تمہاری نگاہ کی تاب نہ لا کر تڑپ جاؤں گا۔ تم تغافل سے میرے صبر و استقلال کو کیوں آزماتے جو چشم پوشی سے گھبرانے اور بے قرار ہونے والا نہیں ہوں۔

فروغ شعلہ اخس کس نس ہے ہوس کو پاس ناموس و ناکیا

فرماتے ہیں رقیب کی جمعوتی محبت کی مثال ایسی ہے کہ جیسے شعلہ اخس دم بھریں روشنی دے کر بجھ جاتا ہے۔ رقیب کو ناموس و ناکا پاس خاک بھی نہیں ہے اسکی محبت چارون کی چاندنی ہے۔ ہمیشہ قائم نہیں رہے گی۔ عشق ناقص کو شعلہ اخس سے تشبیہ دینی ایک ایسا ہی اچھوتا خیال ہے جیسا مرزا صاحب کا آخر کلام۔

نفس مخرج محیط بخودی ہے تغافل ہائے ساقی کا گلا کیا

فرماتے ہیں۔ ہم تو مست است ہیں۔ ہمارا ہر سانس ایک مخرج بخودی ہے۔ ہمیں نہ ساقی کی ضرورت نہ شراب کی احتیاج۔ ہم کیوں تغافل ساقی کا گلا کریں۔ دوسرے معنی اس شعر میں یہ بھی پیدا ہوتے ہیں کہ ہم اپنے مال میں مست ہیں ہمیں دنیا کے بہت و نیست کا کیا غم۔

دماغ عطریہ راہن نہیں ہے غم آوارگی مائے صسا کیا  
 فرماتے ہیں۔ ہم تو بوسے یار کے سرٹھنے داے ہیں۔ ہمارا دماغ عطریہ راہن یا رکی خوشبو  
 جس پر غیروں نے غطرلاب پسند نہیں کرتا۔ صبا اگر قریب کے کرچے سے عطریہ راہن  
 کی خوشبو لے کر آئی ہے تو ہم اس کو کیا کریں۔ آوارگی کا لفظ بتا رہا ہے کہ صبا کو چہ قریب  
 سے بن کر آئی ہے۔

دل ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر ہم اُس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا  
 فرماتے ہیں۔ قطرہ جو ایک جزو ضعیف و ریا کا ہے جب اس کے دل سے یہ آواز نکلتی  
 ہے کہ میں دریا ہوں اور وہ دریا میں لی کر دریا بن جاتا ہے تو ہمارا کیا پوچھنا ہے ہم تو  
 اپنے بدے کے ساتھ عنایت کا دعویٰ رکھتے ہیں۔ یعنی ہم تو قطرہ کے مقابلہ میں ایک  
 انسان کا جسم ہیں۔ ہمارا سراپا تو اُس کی ذات کا ایک بڑا حصہ ہے۔

محابا کیا ہے میں ضامن ادھر دیکھ شہیدانِ نگہ کا خوں بہا کیا  
 فرماتے ہیں۔ شہیدانِ نگہ کا خوں بہایا جانا دستور کے خلاف ہے۔ پھر تو کیوں ڈرتا ہے۔  
 بے خوف ہو کر میری طرت دیکھ اگر میں مرجاؤں گا تو اس بات کا ذمہ لیتا ہوں کہ تجھ سے  
 میرے قتل کی باز پرس ہوگی۔ جس خوبی اور تدبیر کے ساتھ مرزا صاحب نے اس  
 مضمون کو ادا کیا ہے وہ ظاہر ہے۔

سُن اے غارِ نگہ جنسِ وفا سُن شکستِ قیمتِ دل کی صدرا کیا  
 فرماتے ہیں۔ جنسِ وفا جو میرے دل میں تھی وہ گویا قیمتِ دل تھی۔ یعنی میرا دل اسی وجہ  
 سے قیمتی سمجھا جاتا تھا کہ اُس میں جنسِ وفا تھی تو نے دل کو توڑ کر اس کو غارت کر دیا تو  
 اب تو میری سُن اور کمر کرتا ہوں کہ میری بات سُن۔ شکستِ دل کی صدا ملامت ہو کر مانتا ہے  
 جس سے تو ڈرتا ہے اور سنا نہیں چاہتا۔ تو خوف نہ کر تو نے دل نہیں توڑا بلکہ قیمتِ  
 دل توڑی ہے قیمتِ دل کی شکستگی میں کوئی صدا پیدا نہیں ہو سکتی۔ اس صورت میں تجھے

ڈرنا نہ چاہئے۔ کیا کس نے جگر داری کا دعویٰ شکیب خاطر عاشق بھلا کیا فرماتے ہیں۔ توجہ تھرانا قافل یا تکلیف فراق سے مجھے تڑپانا اور بے چین کرنا چاہتا ہے میں نے کب تجھ سے جگر داری یعنی بہادری اور مضبوطی کا دعویٰ کیا ہے۔ بھلا دل عاشق کا صبر ہی کیا ایک ذرا سے ناز و انداز میں تو اس کو بے صبر بنا سکتا ہے۔

یہ قاتل وعدہ صبر آزمائیوں یہ کافر فتنہ طاقست رُبا کیا قاتل وعدہ صبر آزمائی صفت ہے اور کافر فتنہ طاقست رُبا کی۔ مطلب یہ ہے کہ تجھ سے وعدہ صبر آزمائیوں کیا جاتا ہے اور اسی پہلے مصرعہ کا مضمون دوسرے مصرعہ میں دوسرے لفظوں کے ساتھ اکٹھا دیا جاتا ہے۔ مدحش الفاظ قابلِ داد ہے۔

بلائے جاں ہے غائب اس کی ہر بات عبارت کیا اشارت کیا ادا کیا اس مقطع میں مرزا صاحب نے کیا کہ حرف علت قرار دیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ غائب اس کی ہر ایک بات جانتا ہے۔ خواہ عبارت ہو خواہ اشارت واداہو جان لینے میں یہ سب کی سب مساوات کا درجہ رکھتی ہیں۔

### عزل

در خورِ قہر و غضب جب کوئی ہسانہ ہوا پھر غلط کیا ہے کہ ہمساکوئی پیدا نہ ہوا در خور۔ فارسی محاورہ ہے۔ یعنی لائق و سزاوار استعمال ہوتا ہے۔ مطلب شعر کا یہ ہے کہ آپ غیر پر تو ظلم و ستم کرتے ہی نہیں۔ قہر و غضب کے لئے ہم ہی مخصوص ہو گئے ہیں پھر اگر ہم پر کہتے ہیں کہ ہم ساکوئی دوسرا آپ کا چاہنے والا پیدا نہیں ہوا تو اس میں جھوٹ کیا ہے آپ ہمارے قول کو کیوں نہیں تسلیم کر لیتے۔

بندگی میں بھی وہ آئادہ و خود میں ہیں کہ ہم اُسے پھر آئے در کعبہ اگر واندہ ہوا خود میں و خود پسند یہ دونوں لفظ ایک ہی معنی رکھتے ہیں۔ یعنی دوسرے کو اپنے جیسے کم سمجھنا۔

مگر یہاں مرزا صاحب نے خود میں کے معنی خود داری کے لئے ہیں۔ مطلب شعر کا یہ ہے کہ عبادت الہی میں بھی اپنے کو ایسا لے دیئے رکھتے ہیں کہ اگر ہم کو در کعبہ کھلنا ہوا نہیں ملتا تو کندی کھٹکنا اگر دروازہ کھلوانا اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں اس لئے واپس پلے آتے ہیں حقیقت حال یہ ہے کہ مرزا صاحب زندگی میں خود داری کا ایک اعلیٰ نمونہ تھے۔ سب کو مقبول ہے دعویٰ تری کیتائی کا روبرو کوئی بُت آئینہ سیما نہ ہوا یعنی تیرا مقابل کوئی نہ بن سکا۔ دعویٰ متخص دلیل واقع ہوا ہے۔

کم نہیں نازش ہمنامی چشمِ خواں تیرا بیمار بُرا کیا ہے گرا چھانہ ہوا چشمِ مشوق کو زخس بیمار اور چشمِ بیمار کتے ہیں۔ فراتے ہیں۔ میں بھی تیرے عشق کا بیمار ہوں اس لئے مجھے بھی ہمنامی کا آخر حاصل ہو گیا ہے۔ اگر میں اچھا نہ ہوا تو اس میں بُرائی کی کیا بات ہے۔ تیری آنکھ کا ہمنام مشہور ہو جاؤں گا۔

سینہ کا داغ ہے وہ نالہ کہ لب کا گہا خاک کا رزق ہے وہ قطرہ کہ دیرا نہ ہوا فراتے ہیں۔ وہ نالہ جو بے اثری اور نارسانی کی وجہ سے لب تک نہیں آیا ہے میرے سینہ کا داغ بن کر رہ گیا ہے یعنی اُس نے میرے جوشِ عشق کو دھبہ لگا دیا اس کی تحشیل پیش کرتے ہیں کہ جس قطرہ میں دریا بننے کی قابلیت نہیں ہوتی وہ خاک میں جذب ہو کر رہ جایا کرتا ہے۔

نام کا میرے ہے خود گھہ کسی کو نہ ملا کام میں میرے ہے جو فتنہ کہ برپا نہ ہوا فراتے ہیں۔ وہ اندائے محبت جو کسی کو نہ ملی میرے لئے نقصان کردی گئی ہے اور وہ فتنہ قیامت جو کبھی برپا نہ ہوا میرے کام میں ضرورت ہے یعنی میرے واسطے کلیفیں اور مصیبتیں جمع کر رہا ہے۔

ہر بجنِ مٹو سے دم ذکر نہ چکے خوننا حمزہ کا قصہ ہوا عشق کا چرچانہ ہوا فرماتے ہیں۔ جس طرح داستان گوا میر حمزہ کی داستان بیان کرتا ہے اور سننے والے خوشی

کے ساتھ سُستے رہتے ہیں عشق کا ذکر ایسا بے اثر نہیں ہے اس کے یہاں کہنے والے کے ردِ گئے ٹر گئے سے خون جاری ہو جاتا ہے۔ نہ ٹپکے خونِ ناب میں استفہام اقرار ہے یعنی ضرور خونِ ناب چپکے۔

قطرہ میں جلہ دکھائی نہ ہے اور جزو میں گل کھیل اڑکوں کا ہوا اور دیدہ بینا نہ ہوا دیدہ بینا یعنی نگاہِ عادت کچھ مفہمی کھیل نہیں ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ قطرہ میں دجلہ اور جزو میں گل نظر نہ آجائے۔ اس کے مصرعہ اولیٰ میں بھی استفہام اقرار ہے جس خوبی کے ساتھ یہ بیغ مضمون مرزا صاحب نے ان دو مصرعوں میں ادا کیا ہے۔ حیدر تصنیف سے باہر ہے۔ تھی خبر گرم کہ غالب کے اڑیں گے پُندے در کینے ہم بھی گئے تھے پرتاشا نہ ہوا مرزا صاحب اپنی عادت کے موافق اس مقطع میں بھی خوشی برت گئے۔ ایک معمولی مضمون کو نزلے پہلوئے الفاظ میں ادا کیا ہے مطلب موتِ غالب کے معشوق نے غالب کا امتحان عشق لینے کے لئے ایک دن مقرر کیا تھا۔ اُس کو یوں بیان فرمایا ہے کہ شعر میں یہ غیر مشہور تھی کہ آج مرزا غالب کے پُندے اڑیں گے۔ عالمِ تماشا ئی میردیکھنے معشوق کے کرے میں جمع ہو گئے مگر یہ تماشا لتوی رہا اور امتحانِ عشقِ دو فنا میں بغیر امتحان دیئے کامیابی حاصل ہو گئی۔

اسد ہم در جنوں جلاں گئے بے سرو پا ہیں کہ بہ سرِ نیچہ مژگانِ آہو پشتِ خار اپنا فرماتے ہیں اسے اسد ہم جنوں اور دشت میں دور دور کے دکھا دے کرنے والے گدائے بے سرو پا ہیں کہ جنوں پر بھی سبقت لے گئے ہیں (میان کیا جاتا ہے۔ جنوں کے پاس ہرن آجایا کرتے تھے اور جنوں اُن کی آنکھوں سے لٹی کی آنکھوں کو تشبیہ دیا کرتے تھے) مرزا صاحب اپنے جنوں کی حالت کو جنوں سے کامل تر ظاہر کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ سرِ نیچہ مژگانِ آہو میرا پشتِ خار ہے یعنی دشت کے نالہ میں آہو جیسے (دوشی) جانور کو بھی پس پشت چھوڑ دیتا ہوں اور وہ بھی مجھ پر سبقت حاصل نہیں کر سکتا۔

## عَنْزَل

پئے نذرِ کرم تحفہ ہے شرمِ نارسائی کا بخوں غلطیدن صد رنگِ دعویٰ پارسائی کا  
فرماتے ہیں۔ میں اپنے گناہوں کے سبب سے بارگاہِ انہی میں تقرب حاصل نہ کر سکا اور بادِ جزر  
میرے گناہوں کے اللہ تعالیٰ نے طرح طرح کے لطف و کرم مجھ پر فرمائے۔ اب میں ان  
عنایتوں کے بدلے میں شرمِ نارسائی کا تحفہ پیش کرتا ہوں۔ یعنی یادِ جود اپنے گناہوں سے  
بھی جو گناہوں کی مستریں میرے دل میں خونِ بروجی ہیں۔ اور صد ہا قسم کی ہیں۔ ان ہی کے  
ساتھ میں پارسائی کا دعویٰ بھی پیش کرتا ہوں۔

نہ ہو حسنِ تماشا و دستِ رسوئی یونانی کا بہ مہرِ صد نظر ثابت، دعویٰ پارسائی کا  
حسنِ تماشا و دستِ سے یہ مطلب ہے کہ جس شخص کے جلوے ذرے ذرے اور پتے پتے میں  
نظر آتے ہیں اور دیکھنے والے یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارا دوست ہر جگہ۔ ہر رنگ۔ ہر نقشے میں اپنا  
جلوہ دکھا رہا ہے اور پھر کہیں موجود نہیں۔ کسی جگہ قیام نہیں کرتا۔ بالہیں ہر اُس پر یونانی  
کا الزام بھی عاید نہیں ہو سکتا۔ دیکھنے والوں کی سینکڑوں نگاہیں اس مضمون پر مہر کرتی  
ہیں اور کہتی ہیں کہ ہم اُس کے پردے تک بھی رسائی حاصل نہیں کر سکیں۔ یعنی یہاں تک  
پارسائی ہے کہ پردے کے قریب تک کسی نظر کو رسائی حاصل نہیں ہے۔ پھر دعویٰ پارسائی کی  
صدائق میں کس کو کلام ہو سکتا ہے۔

زکوۃ حسن دے اے جلوہٴ جنتش کہ مہرِ آسا چراغِ خانہٴ درویش ہو کا سا گدائی کا  
مشقوفی حقیقی کی طرہٴ خطاب ہے۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں۔ زکوۃ حسن دے یعنی حسن کا  
چالیسواں حصہ بھی سال بھر میں اگر مجھ کو مل جایا کرے تو آفتاب کی طرح کا رنگدانی روشن  
ہو کہ چراغِ خانہٴ درویش بن جائے مطلب یہ ہے کہ میرے دل کو اپنے عرفان سے آفتاب  
کی طرح روشن اور متور کرے۔

نہ اما جانِ کربِ جرمِ غافلِ یزدگردی رہا مانندِ خونِ بے گنہ حقِ آشنائی سے



فرماتے ہیں۔ تو نے ایک مشتاقِ قتل کر کے مجرم سمجھ کر اس لئے قتل نہیں کیا کہ خون بے گناہ اپنی گردن پر نہ لے لے گا۔ یہ سب وہ ہیں تیرے گردن پر بکائے خون بے گناہ حق آشنائی رہ گیا۔  
(انوار کلمۃ آلب)

تمہارے زبانِ محوِ پاس بے زبانی ہے۔ مٹا جس سے تھانہ نہ سکے بے دستِ پائی کا فرماتے ہیں۔ میری تنہا یہ قلمی کمر پر ہے ایسی زبانِ مانگوں جس سے تیرے درگاہ میں اپنا عرض حال کر سکوں مگر اس درخواست یا دعا سے پہلے میری زبانِ محوِ پاس بے زبانی ہو گئی۔ یعنی مجھ کو وہ خاص زبان نہ ملنے سے یہ فائدہ پہنچا کہ میں تیری بارگاہ میں بے دست و پائی یعنی بے سرو سامانی کا جھکا پیش ہی نہ کر سکا اور اس سے یہ فائدہ ہوا کہ مجھ کو بجائے زبانِ شکایت کے درجہ تسلیم و رضا عطا ہو گیا۔

وہی اک بات ہے جو زبانِ نفس دلی کہتے ہیں کہ جس کا جلوہ باعث ہے مری رنگیں نوائی کا فرماتے ہیں۔ یہ بے نفس اور کھٹ گل ہیں کہ فرق نہیں ہے وہی اک بات ہے یعنی ان دونوں کو مساوات کا درجہ حاصل ہے اور اس کا باعث جلوہ چمنِ فصل بہار اور جوشِ گل ہے۔ چمن میں جوشِ گل سے کھٹ گل پیدا ہوتی ہے اور میں چمن کی سار دیکھ کر رنگیں نوائی کے ساتھ غزلِ سلاخی شروع کر دیتا ہوں۔

دہانِ بہت پیغامہ جو زنجیرِ رسوائی عدم تک ہو چا چرچا ہے تیری یونوائی کا معشوق سے فرماتے ہیں اے بے وفاب تو تیری بے وفائی کا چرچا عدم تک پہنچ گیا ہے اب تو بے وفائی چھوڑ دو اور اس کا ثبوت یہ دیتے ہیں کہ زمانہ بھر کے معشوق تجھ کو طعنے دیتے ہیں۔ پیغامہ کے معنی طعنے اور تشنے کے ہیں اور معشوق کی صفت بے دہانی ہوتی ہے اس لئے دہن کو عدم سے تشبیہ دیتے ہیں اس سلسلے کو تیرے بے وفائی کا چرچا ایک معشوق سے لے کر دوسرے معشوق تک اور دوسرے سے لے کر ہزار یا معشوق تک پہنچا ہے۔ زنجیرِ رسوائی قرار دیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ عدم میں پہنچ کر انسان کی ساری عادتیں بدل

جاتی ہیں مگر نیری بے وفائی کی عادت ہم تک پہنچ کر بھی نہ بدلی۔  
 نہ دے نامہ کو اتنا طول غالب فقیر لکھ دے کہ حسرت سبج ہوں عرض ستمائے جُدا کی کا  
 فرماتے ہیں۔ اے غالب تو جو طرح طرح کی شکایتیں اور قسم قسم کے گلے لکھ کر خط کو طول  
 دے رہا ہے اس سے کیا فائدہ۔ مختصر سا فقرہ لکھ دے کہ ستمائے جُدا کی اور آزارِ فراق  
 بیان کرنے کی حسرت دل میں رکھتا ہوں۔ آپ خود تشریف لاکر یا مجھ کو بلا کر میری  
 مصیبت کے واقعات میری زبان سے سُن لیجئے۔

### عَنْدَل

مگر نہ اندوہ شبِ فرقت بیاں ہو جائیگا بے تکلف داغِ مہر وہاں ہو جائیگا  
 فرماتے ہیں۔ اگر شبِ فرقت کا رنج و غم بیاں نہ کیا جائے گا اور تم دل لگا کر اُس کو نہ سُن  
 لو گے تو بڑی قیامت پیدا ہو جائے گی کہ چاند میں جو داغ ہے وہ میرا مہر وہاں ہو جائے گا  
 یعنی جس طرح چاند کے داغ کو سارا زمانہ دکھتا ہے اسی طرح تمھاری جُدا کی تکلیفوں  
 کا حال لوگوں پر کھل جائے گا گویا میری خموشی نہاں ہی کر افشائے لازمِ محبت کر دے گی او  
 پھر تم بدنام ہو جاؤ گے۔ اس سے بہتر یہ ہے کہ میری مصیبت کا حال تم سُن لو تاکہ میرا  
 دل غم کے بوجھ سے ہلکا ہو جائے دل کی بھر اس نکل جائے گی تو راز چھپا رہے گا۔

زہرہ گرا ایسا ہی شامِ بحر میں ہوتا ہے آب پر تو مہتابِ سیلِ خانماں ہو جائیگا  
 فرماتے ہیں۔ اگر یہی قاعدہ قرار پا گیا ہے کہ شامِ سحر کی تختیاں چٹوں کو پالی کر دیتی ہیں او  
 خون کے آنسوؤں سے رُوادیتی ہیں تو عجب نہیں کہ چاندنی سیلِ آبِ بن کر میرے گھر کے  
 در و دیوار کو بہائے جائے۔

لے تو لوں سکتے ہیں اُس کے پاؤں کا بوسہ مگر ایسی باتوں سے وہ کافر بدگماں ہو جائیگا  
 جو شوقِ عشق اور رُعبِ مَسْن کی تصویر ایسے صاف اور سادے لفظوں میں کینچی ہے کہ قابلِ ستائش  
 ہے مرزا صاحب اب دُرُخسار کے بوسہ کا شوق بوجہ ادبِ عشق ظاہر نہیں کرتے بلکہ یہ کہتے ہیں

کہ پاؤں کا ہوسہ تقاضائے دل سے مجبور ہو کر صونے کی حالت میں لے تولوں مگر خوف اس بات کا ہے کہ مجھ سے بدگمان ہو جائے گا۔ مطلب یہ ہے کہ میری پاک محبت کا یقین اُس کے دل سے مٹ جائے گا اور مجھ کو براہِ موس خیال کرے گا۔

دل کو ہم صرف وفا سمجھے تھے کیا معلوم تھا یعنی یہ پہلے ہی نذر امتحان ہو جائیگا فرماتے ہیں۔ ہم تو سمجھے ہوئے تھے کہ دل کو وفا داریوں کے کام میں صرف کریں گے اور زندگی بھر وفا داری میں ہمارا ساتھ دے گا اس کی خبر نہ تھی کہ یہ پہلے ہی معشوق کے امتحان کی نذر ہو جائے گا اور ایک ہی نگاہ میں ایسا کارکن کا رگزار اور مددگار کام آجائے گا۔

سب کے دل میں جگہ تیری جو تو راضی ہوا مجھ پہ گویا اک زمانہ مہرِ ماں ہو جائیگا عجیب بلخِ شکر کہا ہے۔ فرماتے ہیں۔ ایک عالم کے دل میں تیری جگہ ہے۔ ساری دُنیا تجھ سے محبت کرتی ہے۔ ہر کس و نا کس تجھ پر فریفتہ ہے۔ اگر تو ہم سے راضی ہو گیا تو سارا زمانہ ہم پر مہرِ ماں ہو جائے گا۔

گر نگاہِ گرم فرماتی رہی تعلیمِ ضبط شعلہ خُس میں صبیہ خوں میں نہاں ہو جائیگا فرماتے ہیں۔ تیری نگاہِ تہر و غضبِ اُرسوائی اور بدنامی کے خوف سے اگر اسی طرح ضبطِ ناہ و آہ کی تعلیم دیتی رہی تو کیا عجیب ہے کہ شعلہ آتش گھاس کے تنکوں میں اسی طرح چھپ جائے جس طرح خوں رگوں میں پوشیدہ ہے۔

باغ میں مجھ کو نہ لے جاو نہ میرے حال پر ہر گل تر ایک چشمِ خونِ نقشاں ہو جائیگا فرماتے ہیں عشق کے غم درخ سے سری حالت ایسی زار نزار ہو گئی ہے کہ جو مجھے دیکھتا ہے اُس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو جاتے ہیں مگر تو مجھ کو اپنے ساتھ بلانے لے جائے گا تو گلاب کے تر و تازہ پھول چشمِ خونِ نقشاں بن کر میرے حال پر خون کے آنسو باریں اس کا لازمی نتیجہ ہو گا کہ یہ باغ میں بنائے طاب و انبساط تجھ کو بے صفی حاصل ہوگی۔  
وائے ایہ تیرا انصافِ ششدر میں ہر اب تلکِ تعمیرِ توقع ہے کہ واں ہو جائیگا

فرماتے ہیں۔ میں تیرے ظلم بجا صرف اس توقع پر اٹھا رہا ہوں کہ حشر کے دن میرا تیرا انصاف خدا کے سامنے ہو جائے گا اور مجھے میری مظلومی کی داوِل جلتے گی۔ اگر خدا انھی مشر میں بھی انصاف نہ ہوا تو پھر مجھ پر قیامت گزر جائے گی۔

فائدہ کیا سوچ آخر تو بھی ہے دانا اسد دوستی نادان کی ہے جی کا زیاں ہو جائیگا مثل مشہور ہے۔ نادان کی دوستی جی کا زیاں۔ فرماتے ہیں۔ اے اسد اس دوستی میں کیا فائدہ ہے۔ آخر تو قتل مند ہے اس بات کو اپنے دل میں سوچ کہ نادان کی دوستی میں جان کا ضرر ہوا کرتا ہے۔ لطف اس شعر میں یہ پیدا کیا گیا ہے کہ دل کو فریب دے کر عشق سے باز رکھنا چاہتے ہیں اور یہ بات عاشق کے اختیار سے باہر ہے کہ وہ جان کے خوف سے عشق کو ترک کر دے۔

### عَنْزَل

دردمنت کش دوا نہ ہوا میں نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا  
فرماتے ہیں۔ میرا درد و عشق دوا سے مٹ نہ سکا اور میں اچھا نہ ہو سکا، میرے لئے یہ کچھ بُری بات نہیں ہوئی۔ اگر میں اچھا ہوتا تو میرے درد و عشق کو دوا کا شست پذیر ہونا پڑتا اور مجھ کو کسی کا احسان اٹھانا منظور نہ تھا اس لئے اچھا ہی ہوا کہ میں اچھا نہ ہوا۔

جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو اک تماشا ہوا بگلا نہ ہوا  
فرماتے ہیں۔ فیصلہ کے وقت رقیبوں کو کیوں جمع کرتے ہو۔ جھگڑا ہمارا تمھارا ہے وہ بھی صرف بگلا اور شکایت کرنے کا اس کو تماشا بنانے سے کیا فائدہ۔ یہ بات ہم کو کسی طرح گوارا نہیں کہ ہماری شکایت تمھارے منہ سے ہمارے رقیب سنیں اور تمھاری باتیں ہاں ملائیں۔

ہم کہاں قسمت آزمائے جائیں تو ہی جب فسخ آزمائے ہوا  
فرماتے ہیں۔ ہمارے لئے تو ایسی کون سی جگہ ہے جہاں جا کر آرزو قتل پوری کرید۔

جب تو ہی فخر کا امتحان لینے سے یکجہاں ہے۔

کتنے شیریں ہیں میوے لب کہ رقیب گالیاں کھا کے بے مزانہ ہوا  
شیریں دہنی معشوق کی تعریف پر دعویٰ کس قدر متضمن دلیل واقع ہوا ہے۔ فرماتے ہیں  
کہ تیرے ہونٹ ایسے شیریں ہیں کہ رقیب جیسا بواہوس بھی گالیاں کھا کر پی گیا اور بد مزہ  
نہ ہوا حالانکہ چاشنی عشق سے محروم تھا مگر تلخی دشنام اس کو بھی گوارا ہو گئی۔

ہے فخر گرم آن کے آنے کی آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا  
شوق معانی نوازی کا یہ جوش کہ خبر آمد معشوق سن کر بے اختیار آنکھیں بچھا دینے کو جی  
چاہتا تھا اور بے سروسامانی کی یہ کیفیت کہ آج گھر میں بوریا بھی نہیں رہا۔ کل تک تو تھا  
بھی اب ان کی تشریف آوری کے خیال سے مرزا صاحب دل ہی دل میں شرمائے جاتے  
ہیں کہ ہائے وہ آئیں گے تو میری بے سروسامانی کو دیکھ کر دل میں کیا خیال کریں گے۔

کیا وہ غرور و کی خدائی تھی بندگی میں برا بھلا نہ ہوا  
مرزا صاحب نے اس شعر میں عجب شوخی برتی ہے جو کہیں دیکھنے میں نہیں آئی۔ یہ شعر  
اور اس کے بعد کا شعر دونوں بیت الغزل ہیں۔ فرماتے ہیں۔ میری بندگی کیا غرور و کی  
خدائی تھی کہ اس سے مجھ کو سوائے نقصان کے کچھ فائدہ نہ پہنچا۔ یہاں بندگی سے مراد  
عبادت نہیں ہے عبودیت ہے۔ بندگی پر غرور و کی خدائی کا اطلاق کرنا بالکل نئی بات  
ہے (از یادگار غائب)

جان دی دی ہوئی اسی کی تھی حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا  
فرماتے ہیں۔ ہم نے زندگی بھر یہ ایک ہی کام کیا ہے کہ جان دے دی لیکن پھر سوچ کر سمجھے  
کہ وہ جان تو اسی کی دی ہوئی تھی۔ اس کی امانت اس کو واپس کر دی اس میں کون سی فخر  
کی بات ہے۔ حق تو یہ ہے یعنی سچی بات تو یہ ہے کہ اس کا حق ہم سے کچھ بھی ادا نہ ہو سکا۔  
اس خیال۔ ابن الفاظ۔ اس بندش کا کیا کہنا ہے۔

زخم گردب گیا لہو نہ تھما کام گر رک گیا روانہ ہوا  
 فرماتے ہیں۔ زخم اگر دب بھی گیا یعنی اس کی کشادگی باندھ دینے سے سٹ بھی ٹھنی اور  
 زخم باہم پیوستہ ہو بھی گئے تو بھی خون بند نہ ہوا، مگر اس کے خلاف کام رک گیا تو وہ  
 روانہ ہوا۔ قاعدہ یہ چاہتا تھا کہ جس طرح زخم دب جانے سے لہو جاری رہا، اسی طرح  
 کام رک جانے پر بھی روا ہو۔ اپنی بد نصیبی کا اظہار کس سادگی سے کیا ہے۔ کتنے بڑے  
 مضمون کو دو مصرعوں میں ادا کیا ہے۔

رہزنی سے کہ دستانی ہے لے کے دل دستان روانہ ہوا  
 فرماتے ہیں ہم تو مڑ مڑ کر چلے جاتے تھے۔ مشوق نے ہم سے دل چھین لیا۔ ستم ہالے  
 ستم یہ کہ دل لیتے ہی غائب ہو گیا۔ دستانی کا قاعدہ یہ ہے کہ ٹھہر کر دم لے کر ہم اپنا نام  
 و نشان گھر کا پتہ ملنے کا وقت بتاتا۔ اُس نے تو یہ کچھ بھی نہ کیا۔ دل لیتے ہی چوروں کی  
 طرح بھاگ نکلا۔ اب ہمیں کون بتلے کہ رہزنی تھی یا دستانی۔ اس شعر میں معمولہ قافیہ  
 نے اور بھی لطف پیدا کر دیا۔

کچھ تو پڑھئے کہ لوگ کہتے ہیں آج غائب غنزل سرا نہ ہوا  
 سنا گیا ہے کہ یہ مشاعرہ قلعہ میں کسی شہزادہ کے مکان پر منعقد ہوا تھا۔ مرزا صاحب نے  
 طرح میں غزل نہ لکھی تھی۔ جب اسرار بالند کی حد تک پہنچ گیا تو غیر طرح غزل بٹکھ دی۔  
 مقطع پہلے سے اس مضمون کا کہہ دیا تھا۔

### غنزل

جگہ ہے شوق کہ دل میں بھی تنگی جا کا گھر میں ٹھو ہوا اضطراب دریا کا  
 مرزا صاحب تعجب کے مہر میں فرماتے ہیں۔ شوق کو تنگی جا کا جگہ دل میں بھی ہے ”بھی“  
 کا لفظ تباہ رہا ہے کہ دل ایسی وسیع چیز ہے کہ دونوں عالم اس میں سما جاتے ہیں اور پھر  
 خالی رہتا ہے باوجود اس وسعت کے شوق کو جگہ کی تنگی کا کھلہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ

شوق کی وسعت بھی دل کی وسعت سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ داب تنگی جاہ کا ثبوت کاغذ ہو) فرماتے ہیں۔ غم میں دریا کی روانی ٹھوہرگی یعنی کوزے میں دریا سما گیا۔ مگر بھیج جانے کے سبب سے موجوں کی حرکت بند ہوگئی دل کو گہر سے اور شوق کو دیا سے تشبیہ دی ہے جو بالکل نئی تشبیہ ہے۔ بھیج یہ ہے کہ اس مطلع میں دریا کو زے کے اندر بند کر لیا ہے۔ پھر لطف یہ ہے کہ گنجی بندش تناسب الفاظ۔ طریق بیان میں فرق نہیں آنے پایا۔ دونوں مصرعے ایک ہی سانچے میں ڈھلے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔

یہ جانتا ہوں کہ تو اور پارس مکتوب مگر ستم زدہ ہوں ذوق خامہ فرسا کا فرماتے ہیں۔ یہ تو میں جانتا ہوں اور اچھی طرح سمجھ چکا ہوں کہ تو قیامت تک میرے کسی خط کا جواب نہیں لکھے گا۔ مگر کیا کروں مجبور ہوں۔ ذوق خامہ فرسائی مجھ پر ظلم کرتا ہے اس لئے بار بار مجھ کو خط بھیج رہا ہوں۔ باوجودیکہ اسید جواب سے قطع نظر کر چکا ہوں۔

حنائے پائے خزاں ہے بہار اگر ہے یہی دوام کلفتِ خاطر ہے عیشِ دنیا کا فرماتے ہیں۔ بہار اگر ایسی ہی بے ثبات اور بے بنیاد ہے تو بہار ہی کیا ہے یعنی موسم بہار خزاں کے پاؤں کا رنگ حنا ہے جو بہت جلد اُگ جائے گا اور اس کی مثال ایسی ہے جیسے عیشِ دنیا کے عیش کی مدت بہت ہی قلیل ہوتی ہے اور کلفتِ خاطر زندگی بھر قائم رہتی ہے۔ مطلب شعر یہ ہے کہ دنیا میں عیش و آرام کا زمانہ کم ہے اور رنج و مصیبت کا دورہ دورہ زیادہ۔

غمِ فراق میں تکلیفِ سیرِ باغ نہ دو مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بجا کا قاترہ ہے کہ رنج و مصیبت کے دقتِ عیش و عشرت کی چھیڑ چھاڑ ناگوار ہوا کرتی ہے چنانچہ اشارۃً خاں آتشا کہتے ہیں سے

نہ چیر دے نکتِ ادب باری راہِ لگ اپنی تجھے اٹھکیلیاں سو جھی میں یاں ہزار میسے ہیں مرزا صاحب فرماتے ہیں۔ مجھے غمِ فراق کی حالت میں سیرِ باغ کے لئے گھوڑے گھسیٹنے لگے جاتے

مجھ کو خندہ ہائے بیجا کا دماغ نہیں ہے۔ خندہ نگل کو خندہ بیجا سے اس لئے تفسیر کیا ہے کہ وہ کچھ سوچ سمجھ کر ازراہ تعجب یا تسخر نہیں ہنستا۔ خندہ بیجا رنج و غم کی حالت میں نہ آتا ناگوار خلل برآ کرتا ہے۔ شر کی نمونگی میں کلام نہیں۔

### عَنْزَل

ہنوز محرمی حُسن کو ترستا ہوں کرے ہے ہر بے سوکام چشمِ مینا کا  
فرماتے ہیں۔ باوجود اس کے کہ میرا روگنٹا روگنٹا چشمِ مینا بن گیا ہے۔ ذہن سے ذہن میں  
اُس کی تجلیاں دیکھ رہا ہوں، پھر بھی مجھ کو خرمی حُسن کا درجہ حاصل نہیں ہو سکا۔ یعنی کہ نہ  
ذات اور معرفتِ الہی سے محروم ہوں۔

دل اُس کو پہلے ہی ناز واداسے دے بیٹھے ہمیں دماغ کہاں حُسن کے تقاضا کا  
ناز واداکو طلبِ دل کا تقاضا کتنا نئی طرح کی جذبہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اُدھر سے بھی  
ناز واداکا بھی آغاز نہ ہوا تھا ہم نے پہلے ہی سے دل نذر کر دیا۔ دوسری لطافتِ خیال  
اس شعر میں یہ ہے کہ محض حُسن جو سادگی کے عالم میں تھا ہم اُس پر عاشق ہو گئے۔ ناز و  
ادامیں کو زبور حُسن سمجھا جاتا ہے فریفتگی کے لئے اس کی بھی ضرورت نہ تھی۔

نہ کہہ کہ گریہ بمقدارِ حسرتِ دل ہے مری نگاہ میں ہے جمعِ خرمیجِ دریا کا  
مرزا صاحبِ معشوق سے شکایت کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ قویہ نہ کہہ کہ تیرا گریہ تیری  
حسرتِ دل کے برابر ہے۔ نہیں ہرگز یہ بات نہیں ہے۔ مری نگاہ میں دریا کا جمع و  
خرمِ جمع ہے یعنی جس قدر میں نے آنسو بہائے ہیں اس سے بہت زیادہ حسرتِ گریہ میرے  
دل میں موجود ہے حسرتِ دل کے مقابلہ میں ابھی کچھ بھی نہیں رویا ہوں۔

فلک کو دیکھ کے کتابوں میں کو یاد آسے جفا میں اُس کی ہے اندازِ کارِ فرما کا  
یعنی فلک کو دیکھ کے خُدا یاد آتا ہے اس لئے کہ آسمان جو ظلم و ستم مجھ پر کرتا ہے وہ سب  
اُسی کے حکم سے ہوتے ہیں۔ بنیرِ حکمِ الہی کے آسمان بھی کچھ نہیں کر سکتا۔ شر بہت سادہ



اور خیال بہت پائیزہ ہے۔

## عَنْزِل

قطرہ ہے بسکہ حیرت سے نفس پرور ہوا خطِ جام سے سراسر رشتہ نگو ہر ہوا  
خود مزا صاحب اس مطلع کی شرح اپنے ایک خط میں اس طرح تحریر فرماتے ہیں کہ خیال  
تو دقیق نظم کیا گیا ہے لیکن لطف زیادہ نہیں۔ وہ فرماتے ہیں: قطرہ جو چپکنے میں  
بے اختیار ہے افراطِ حیرت سے چپکنا بھول گیا اور برابر برابر بوندیں جو ختم کر رہ گئیں  
تو بے لے کا خط اس تلگے کی صورت بن گیا جس میں موتی پر دسے گئے ہوں۔

اعتبارِ عشق کی خانہ خرابی دیکھنا غیر نے کی آہ لیکن وہ خفا مجھ پر ہوا  
فرماتے ہیں۔ معشوق کو میرے عشق کا یقین آگیا ہے اور اس قدر اس کا اعتبار جم گیا  
ہے کہ اگر غیر بھی مجھو لے چھوے سے کبھی آہ و فریا کرتا ہے تو وہ معنی معشوقِ خوبِ بزمِ اُمی  
اور رسوائی سے بجا پر خفا ہوتا ہے غیر کی طرف اس کا لگان بھی نہیں جاتا۔

## عَنْزِل

جب بقریبِ سفر یار نے محلِ باندھا تپشِ شوق نے ہر ذرہ پہ اک دل باندھا  
فرماتے ہیں سفر کے وقت جو یار نے اوٹ پر محل کسا اور باندھا ہماری تپشِ شوق نے ہر  
ذرہ خاک پر ایک دل باندھ دیا جو ختمِ سفر تک یار کے ساتھ ساتھ رہا۔ مطلب یہ ہے کہ  
دوست کو رخصت کرتے وقت ہمارا شوق یہ چاہتا تھا کہ ہم بھی اُس کے ہمراہ روانہ  
ہو جائیں اور اُس بے قراری کی حالت میں خاک کے ذرہ کو دیکھ کر جو سواری کے وقت  
زمین سے گرد و غبار بن کر بلند ہوتے تھے ہم سمجھتے تھے کہ ہر ذرہ پر ایک دل باندھا  
ہوا ہے ورنہ خاک کے ذرے ہیں یہ تڑپ کہاں ہوتی ہے۔

اہلِ بینش نے بحیرتِ کدہ شوخیِ ناز جو ہر آئینہ کو طوطی بسمل باندھا  
اہلِ بینش سے یہاں وہ اہلِ تماشہ مراد ہیں جو یار کے آئینہ دیکھتے وقت ادھر ادھر موجو

ہیں اور حیرت کہہ وہ آئینہ ہے جس میں عکسِ یارِ شوخی و ناز کے ساتھ جلوہ فرما ہے۔ یہاں آئینہ سے مراد فولادی آئینہ ہے جس میں جوہر ہوا کرتے ہیں۔ جوہرِ فولاد کا رنگ سبز ہوتا ہے اور رنگ کو ہمیشہ طوطی سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ اس لئے فرماتے ہیں کہ پہلوؤں سے دیکھنے والوں کو ہر ایک رُخ سے جوہرِ آئینہ کی سبزی متحرک نظر آتی ہے اس وجہ سے اُسے طوطی بسمل سے تشبیہ دی گئی ہے۔ یہ تشبیہ نہایت لطیف اور بدیع ہے۔ مطلب شعر کا یہ ہے کہ جوہرِ آئینہ فولادی کی تیزی جو اطراف و جوانب سے متحرک نظر آرہی ہے یہ طوطی بسمل ہے جس کو شوخی و ناز کی ٹھہری سے بسمل کر دیا گیا ہے۔

یاس و امید کے ایک عربرہ میدانِ مانگا عجزِ ہمت نے طلسمِ دلِ سائل باندھا  
عربرہ کے معنی برفونی اور جنگجوائی کے ہیں۔ یاس و امید نے ایک میدانِ جنگ مانگا یا ہے آپس میں لڑائی ہو رہی ہے۔ کبھی یاس غالب آجاتی ہے۔ کبھی امید۔ دوسرے مصرعے میں فرماتے ہیں عجزِ ہمت نے ایک طلسم باندھا ہے یعنی طلسم بنایا ہے جس میں یاس و امید کی باہم لڑائی ہو رہی ہے۔ یاس چاہتی ہے میں فتح حاصل کر لوں۔ امید کی کوشش ہے میں شکست دے دوں۔ شعر کا مطلب یہ ہے جو شخص ہمت نہیں رکھتا وہ سائل ہی کہ امید و بیم میں مبتلا رہتا ہے یعنی سوال کرنے کے بعد جب تک کچھٹ یا جواب صاف سے امید کا طلسم ٹوٹے یاس و امید میں باہم جھگڑا رہتا ہے۔

نہ بندھے تشنگیِ ذوق کے مضمونِ غائب گرچہ دلِ کھول کے دیا کو بھی صل باندھا  
فرماتے ہیں۔ ذوقِ سخن کی تشنگی کے مضمون جیسے باندھے چاہئے تھے ہم سے لے غائب نہ بندھ سکے باوجودیکہ دلِ کھول کے دیا کو بھی ہم نے ساحل باندھا۔ ساحل کو تمام شعرا تشناب لکھتے چلے آئے ہیں۔ اگرچہ آغوش میں دیا کو رکھتا ہے مگر پھر بھی خشک لب نظر آتا ہے دلِ کھول کر کوئی کام کرنا کسی کام میں سائل کرنے کو کہتے ہیں۔ مطلب شعر کا یہ ہے کہ ذوقِ سخن اس درجہ غالب تھا کہ باوجود بہت کچھ لکھنے کے طبیعت مضامین سے سیر نہ ہوئی۔

## غزل

میں اور بزمِ نئے سے یوں تشنہ کام آؤں گریں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا  
فراتے میں شیب اور حیرت کی بات ہے مجھ جیسا بادہ خوار جس کو ساری دُنیا شرابِ بکوار جانتی  
بزمِ نئے سے اس طرح پیاسا چلا آئے۔ یہ مانا کہ میں نے توبہ کئی تھی اور پیاس توبہ ساقی  
سے شراب نہ مانگی مگر ساقی کو کیا ہو گیا تھا کہ اُس نے بے طلب کے مجھ کو نہ دی اور زبردستی  
نہ ملا دی۔ جن لفظوں میں مرزا صاحب نے اس مضمون کو بیان کیا ہے کچھ اہلِ زبانی ہی اس کا  
لطیف حاصل کر سکتے ہیں۔

ہے ایک تیر جس میں نون چھ پڑے ہیں وہ دن گئے کہ اپنا دل سے جگر جدا تھا  
اس مضمون کو مرزا صاحب نے ایک اور مطلع میں بھی باندھا ہے وہاں یوں فرماتے ہیں سے  
دل سے تیری نگاہ جگر تک گز گئی دونوں کو اک ادا میں رضا نہ گز گئی

مرقومہ بلا شعر میں بھی تیر سے مراد تیر نظر ہے یعنی وہ زمانہ اب کہاں ہے کہ دل پہلو میں  
اپنے مقام پر رہتا تھا اور جگر سینے میں اپنی جگہ قیام پذیر تھا اب تو عشق نے دونوں کو  
ایک ہی تیر میں چھید کر زمین پر ڈال دیا ہے۔

درماندگی میں غالب کچھ ہی پڑے تو جانوں جب رشتہ بے گرہ تھا ناخن گرہ کشا تھا  
مطلب صوفِ اتنا ہے کہ جب مدافعتِ مصائب کی قدرت حاصل تھی اس وقت مصیبتیں نہ پڑیں  
جس وقت اُن کے دفعیہ کی طاقت باقی نہ رہی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس مضمون کو  
اس استعارہ میں بیان کیا ہے کہ جب رشتہ بے گرہ تھا یعنی کسی مشکل کا سامنا پیش نہ  
آیا تھا تو ناخن گرہ کشا تھا یعنی اُس کے دفعیہ کی قدرت تھی۔ مشکل گرہ کا استعارہ  
ہے اور تدبیر ناخن کا استعارہ۔

## غزل

گھر ہمارا جو نہ روتے تو ویراں ہوتا بحرِ گرِ بحر نہ ہوتا تو سیاہاں ہوتا

فرماتے ہیں۔ ہمارے گھر کی قسمت ہی میں دیران ہونا لکھا تھا لوگ ہم پر رونے کا الزام کیوں رکھتے ہیں۔ جو گھر کثرتِ گریہ سے دریا بن گیا ہے وہی گھر نہ رونے کی حالت میں جنگل بن جاتا غرض یہ ہے کہ ہر نصیبی اپنا رنگ دکھائے بغیر کسی طرح نہیں رہتی۔

ستنگی دل کا گلہ کیا یہ وہ کافردل ہے کہ اگر تنگ نہ ہوتا تو پریشاں ہوتا اس شعر میں بھی مسطورہ بالا مطلع کا مضمون دوسری ترکیب اور دوسرے الفاظ میں بیان فرماتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ دل کو موردِ رنج و بلا رہنا لازمی اور ناگزیر ہے۔ مینی اگر دل میں تنگ نہ ہوتا۔ واضحہ خاطر کی بدولت اس قدر پریشانی بڑھ جاتی کہ پریشاں ہو جاتا۔

بعد یک عمر و رعبارتو دیتا بارے کاشِ رضواں ہی دریا کا دریاں ہوتا فرماتے ہیں۔ عمر بھر عبادت کرنے کے بعد جنت میں باریابی حاصل ہو جاتی رضواں ہم کو نہ روکتا دریا کا پاسبان اس قدر سخت گیر ہے کہ عمر بھر انتجائیں کرنے کے بعد بھی خانہ دوست میں جلنے کی اجازت نہیں دیتا۔ کاشِ دبیان رضوان ہوتا راجہ بہشت کا دربان ہے) اُس سے یہ اُمید ہو سکتی تھی کہ وہ عمر بھر عبادت کرنے کے بعد نہ روکتا۔

### غزل

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا کس خوبی کے ساتھ نیستی کو ہستی پر ترجیح دی ہے کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔ فرماتے ہیں کہ جب دنیا پیدا نہ ہوئی تھی اُس وقت صرف خدا ہی خدا تھا۔ اگر اس عالم امکان کو پیدا نہ کیا جاتا تو بھی خدا ہی خدا ہوتا۔ پس میری ہستی نے ظاہر ہو کر مجھ کو ایک دوسرا جسم قرار دیا اور دوسرے جسم نے قرار پا کر مجھ کو برباد کر دیا۔ اگر میں پیدا نہ ہوتا اور میرا وجود نہ ہوتا تو خیال کرنا چاہیے کہ میں کیا ہوتا۔ مینی خدا ہوتا اس واسطے کہ یہ پہلے ہی بنا دیا گیا ہے کہ جب کچھ نہ تھا تو خدا تھا۔ اور کچھ نہ ہوتا تو بھی خدا ہی ہوتا۔

ہوا جب غم سے یوں محسوس غم کیا سر کے کٹنے کا نہ ہوتا کہ جذباتن سے تو زانو پر دھرا ہوتا اس شعر میں لفظ بے حس نے ثبوت و دعویٰ کے ساتھ عجب لطف پیدا کر دیا ہے۔ فرماتے ہیں جب ہمارا سر غم و الم کی کثرت سے ایسا بے حس ہو گیا تھا کہ ہر وقت اُسے زانو پر رکھنا پڑتا تھا تو ایسے سر کے کٹنے جلنے کا غم و الم بے فائدہ ہے یعنی کثرتِ غم نے سر کے کٹنے کو پہلے بیکار کر دیا تھا۔ بیکار شے کا ضائع ہونا کچھ افسوس کی بات نہیں۔ ہوئی مدت کہ غالب مر گیا پر یاد آتا ہے وہ ہر اک بات پر کسنا کہ یوں بتاؤ کیا ہوتا یہاں کیا کیا کا لفظ تحقیر کے معنی پر استعمال ہوا ہے جس سے انتہا درجہ کی بے دلی اور نا اُمیدی ظاہر ہوتی ہے۔ گویا دنیا کی بے ثباتی کا خیال کسی کام میں نظر کے سامنے سے ہٹتا ہی نہیں۔ فرماتے ہیں کہ غالب کو مرے ہوئے ایک عرصہ دراز گزر گیا ہے مگر اب تک ہم کو وہ اور اُس کی باتیں یاد آتی ہیں۔ وہ ہمیشہ ہر بات پر یہ کہتا رہتا تھا کہ اگر خوش نصیبی سے ایسا بھی ہوتا تو کیا ہوتا۔ یعنی ع دُنیا بچ است و کار دُنیا برس بچ است

### غزل

ایک ذرہ زمیں نہیں بیکار باغ کا یاں جادہ کبھی فقیہ ہے لالے کے داغ کا فرماتے ہیں۔ اب کے سال بہارِ باغ میں ایسے زور شور سے آئی ہے کہ ذرہ بھر زمین بھی بیکار نہیں رہی ہے۔ باغ کی روشنی جو کثرتِ بہار سے سبزہ زار ہو گئی ہیں۔ وہ گویا مرہم زنگار کی تیاں بن گئی ہیں۔ داغِ لالہ کے واسطے (مرہم زنگار ہمیشہ زخم کو کاٹتا اور صاف کرتا ہے) یعنی لالے کا داغ مٹا دینے کے واسطے مرہم زنگار ہی کا استعمال مناسب سمجھا گیا ہے۔

بے بے کے بے طاقت آشوب آگئی کھینچا ہے عجزِ حوصلہ نے خطِ ایام کا فرماتے ہیں۔ بغیر شرابِ محبتِ الہی کے کسی میں یہ طاقت نہیں ہے کہ آشوب آگئی کی برداشت کر سکے۔ ایام کے معنی پیالہ کے ہیں۔ اور یہاں پیالے سے مراد وہ گلاس ہے

جس پر شراب ناپنے کے لئے خطوط کھینچے ہوئے ہوتے ہیں۔ انگریزی میں جس کو نم سجر یا اونس سجر کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ عجز حوصلہ کی وجہ سے ہم نے بیانہ شراب پر نشانات بنا دیئے ہیں اور اسی سے شراب ناپ کر پیتے ہیں۔ اور مقدار شراب دن بدن بڑھاتے جاتے ہیں۔ آشوب آگہی کی طاقت برداشت بقدر خطوط جام رنہ رنہ پیدا ہوتی جاتی ہے۔ یعنی ذکر و اشغال کی دن بدن مہارت و شوق زیادہ کرتے جاتے ہیں۔

بلبل کے کاروبار یہ ہیں خندہ ہائے گل کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے داغ کا فرماتے ہیں۔ دیوانے آدمی کی حرکات پر جس طرح عام آدمی ہنستے ہیں اسی طرح بلبل کے شوق نغمہ و فریفتگی پر بھول خندہ زن ہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ جس کو عشق کہتے ہیں وہ درحقیقت ایک قسم کا خلل داغ ہے۔ انسان نے غلطی سے خلل داغ کا نام عشق رکھ لیا ہے۔ مصرعہ ثانی کی بے ساختگی قابلِ مہرج و مستائش ہے۔

تازہ نہیں ہے تشنہ فکر سخن مجھے تر یا کی قدیم ہوں دود چراغ کا فرماتے ہیں۔ فکر سخن کا نشہ مجھے آجکل کا نہیں۔ روزِ ازل سے تشنہ فکر سخن ساتھ لیکر آیا ہوں۔ تر یا کی کے معنی افیون کے بھی ہیں اور چنڈہ کے چھینٹے کو بھی کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح چنڈہ بانہ چراغ کی ٹوکے ذریعہ سے افیون کا دھواں نے کی وساطت سے حقہ کی طرح کھینچتے ہیں اور پیتے ہیں۔ اسی طرح دود چراغ سے تشنہ فکر سخن کرتا ہوں۔ قاعدہ ہے کہ فکر سخن یا عشق سخن زیادہ قرات کے وقت کی جاتی ہے اور رات کو کھنے کی غرض سے شمع یا چراغ کا قریب ہونا بھی لازمی ہے۔ طالب علم بھی عموماً رات کو سبق یاد کرتے ہیں۔

ستو بار بند عشق سے آزاد ہم ہوئے پر کیا کریں کہ دل ہی عدد ہے فراغ کا اس شعر میں مرزا صاحب نے محسوسات کو تخیل کا جامہ پہنا دیا ہے۔ یہاں عشق سے دنیا کی محبت اور بند عشق سے اس محبت میں پھنسا ہوا ہونا مراد ہے۔ فرماتے ہیں

سُورِ اہل دُنیا کی فکروں سے ہم آزاد ہوئے ہیں اور دُنیا اہل دُنیا سے قطع تعلق کر چکے ہیں مگر اس بات سے مجبور ہیں کہ دل فارغ البالی کا دُشمن واقع ہوا ہے یعنی دُنیا میں رہ کر بغیر غفلت فکر آدمی رہ ہی نہیں سکتا۔

بے خون دل بے چشم میں موجِ نگہ غبار یہ سیکدہ خراب ہے مے کے سُرخ کا فرماتے ہیں۔ انسان کی آنکھ اُسی واسطے پیدا کی گئی ہے کہ ہمیشہ خون کے آنسو بہاتی رہے۔ اگر آنکھ سے خون دل نہیں بہتا تو موجِ محاکہ کے بدلے آنکھوں میں خاک اُڑنے لگتی ہے۔ یعنی آنکھ کی زیبائش اور رونق خاک میں بدل جاتی ہے۔ یہ سیکدہ یعنی چشم انسان بغیر شراب کے خراب ہو جاتا ہے۔ تناسب الفاظ کی کیا بات ہے۔

بلغ شگفتہ تیرا بساطِ نشاطِ دل ابر بہارِ خمکہ کس کے دماغ کا فرماتے ہیں میرے غمِ خاطر کی کھلانے والی تیرے بلغِ حسن کی بہار ہے اور یہ بلغِ سدا بہار اور ہمیشہ شگفتہ رہنے والا ہے۔ میری سستی کا سبب ابرِ بہاری نہیں ہو سکتا معلوم نہیں یہ خمکہ یعنی ابرِ بہاراں کس کے مست کرنے اور بیہوش کر دینے کے واسطے پیدا کیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ معمولی شراب بھوار بہار سے لطف اُٹھا سکتے ہیں اور ان کا دماغ فصلِ گل میں چین کی سیر سے فرحت و انبساط حاصل کر سکتا ہے۔ میرے شگفتہ کرنے کے لئے تیرا بلغِ حسن اور تیرے حسن کی بہار ہے۔

### غزل

وہ مری چینِ جبین سے غمِ پنہاں سمجھا رازِ مکتوب بہ بے ربطی عنوانِ سمجھا فرماتے ہیں۔ معشوق میری چینِ جبین سے میرے غمِ پنہاں کو سمجھ گیا د غمِ پنہاں کے معنی یہاں رنجشِ دلی کے ہیں (پھر اسی مضمون کو دوسرے الفاظ میں یوں بیان کیا ہے۔ غم کا مضمون پتہ کی بے ربطی سے اُس پر کھل گیا۔ چین جبین سے استعارہ لفظِ غم سے اور غمِ پنہاں کا استعارہ رازِ مکتوب سے کیا ہے۔

کیا ان بیش نہیں صیقل آئینہ ہنوز چاک کرتا ہوں میں جب کہ گریباں سمجھا  
 حضرات صوفیہ کے ہاں صفائی قلب کے لئے بہت سے طریقے ذکر کے رکھے گئے ہیں۔  
 چنانچہ قادر یہ خاندان کا یہ طریقہ ہے کہ ان کے مقام سے سانس کو کھینچ کر پیچے تک  
 لاتے ہیں اور دہنی جانب سے گردن کو حرکت دے کر قلب کے اوپر ضرب لگاتے ہیں  
 اور اس خیالی سانس کی کشش کو عربی خط میں لفظ **إِلَّا اللّٰه** کی صورت تصور کرتے  
 ہیں۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں۔ میں بھی اپنے آئینہ دل کی چلا چاک گریباں سے کرتا  
 رہا ہوں۔ انجام کار مجھ کو یہ ثابت ہوا کہ ایک الف سے زیادہ میرے آئینہ دل کی چلا  
 نہیں ہوئی۔ اور یہ ویسی ہی ایک سیدھی کھیر ہے جو آئینہ نولادی کو صیقل کرتے وقت  
 ابتدا میں پیدا ہو جایا کرتی ہے۔ مجھ پر اپنی غلطی ثابت ہو گئی اور اب میں سمجھ گیا ہوں کہ  
 میرا گریباں جس کو میں نے مصقلہ سمجھا تھا (مصقلہ گھوڑے کی نعل کی صورت کا ایک  
 آلہ آہنی ہوتا ہے جس سے آئینہ نولادی یا تلوار وغیرہ ہتھیاروں کو صیقل کیا کرتے ہیں)  
 وہ حقیقت میں مصقلہ نہیں ہے بلکہ گریباں ہے۔ اب میں اُسے بیکار شے سمجھ کر  
 چاک کر رہا ہوں اور اپنی غلطی پر نادم ہوں۔ گریباں سے یہاں مراد گریباں کی کٹھنی  
 سے ہے جو بالکل مصقلہ سے مشابہت رکھتی ہے۔

شرح اسباب گرفتاری خاطر مت پرچھ اس قدر تنگ ہوا دل کہ میں زنداں سمجھا  
 فرماتے ہیں۔ میری گرفتاری خاطر کا سبب مجھ سے شرح دہسٹ کے ساتھ یعنی مفصل نہ  
 پوچھو میں اپنا پورا پورا راز کھولنا نہیں چاہتا۔ محل حال یہ ہے کہ دل میرا اس قدر  
 تنگ ہو گیا ہے کہ میں اُس کو زنداں سمجھتا ہوں۔

بدگمانی نے نہ چاہا اُسے سرگرم خرام دُخ پہ ہر قطرہ عرق دیدہ حیراں سمجھا  
 فرماتے ہیں۔ میری بدگمانی نے یہ بات منظور نہ کی کہ وہ دیر تک سرگرم خرام نازد ہے  
 اور اس کی وجہ یہ تھی کہ نزاکت کے سبب سے چلنے میں اُس کو پسینہ آیا اور ہاتھ پر



اس پینے کے قطرے جمع ہو گئے۔ میں ہر قطرہ کو یہ سمجھا کہ رقیب کی چشم میرا اُس کے رُخ پر جمی ہوئی ہے۔

عجز سے اپنے یہ جانا کہ وہ بد خو ہوگا۔ نبضِ خس سے پیشِ شعلہ سوزاں ہوگا  
عجز کو خس اور تند خوئی کو شعلہ سے تعبیر کیا ہے۔ مطلب شعر کا یہ ہے۔ میں نے اپنی عاجزی اور اُس کی بد مزاجی سے یہ سمجھ لیا کہ جس طرح شعلہ سوزاں گھاس بھوس کو جلا دیتا ہے اُس کا غصہ میری بربادی اور قتل کا باعث ہوگا۔

سفرِ عشق میں کی ضعف نے راحت طلبی ہر قدم سایہ کو میں اپنے شبستان سمجھا  
فرماتے ہیں۔ جب سفرِ عشق میں تکان بہت بڑھ گئی اور کمزوری پیدا ہو گئی تو ضعف نے آرام لینا چاہا۔ مسافر ہمیشہ تھک جانے کے بعد آرام لینے کے لئے سایہ کی تلاش کیا کرتا ہے چونکہ میرا سفرِ عشق تھا۔ یہاں درخت یا دیوار کا سایہ تو مفقود ہی تھا۔ میں نے اپنے سایہ کو شبستان سمجھ کر آرام لینا چاہا۔ استعاروں سے قطع نظر کر لینے کے بعد اس شعر میں یہ معنی پیدا ہوتے ہیں۔ جب محرومی اور ناکامی صدمے گزر جاتی ہے تو انسان یا اس اور نا اُمیدی کو اپنا جہم قرار دے کر تسکینِ خاطر حاصل کر لیتا ہے۔

تھا گریزاں خُڑا یار سے دلِ تادمِ مرگ دفعِ پیکانِ قضا اس قدر آساں سمجھا  
فرماتے ہیں۔ خُڑا یار سے میرا دل مرنے کے وقت تک بھاگتا اور ڈرتا ہی رہا۔ اور نادانی سے بھاگنے کو میں دفعیہ قضا سمجھتا رہا۔ تعجب ہے کہ پیکانِ قضا کا دفعیہ میں نے اس قدر آساں سمجھ لیا تھا۔

دل دیا جان کیوں کو وفادارِ اسد غلطی کی کہ جو کافر کو مسلمان سمجھا  
فرماتے ہیں۔ اے اسد تم نے اُس کو وفادار سمجھ کر کیوں اپنا دل دیا۔ بالفرض محال اگر دل کا دینا ہی مقصود تھا تو بے وفا سمجھ کر دیا ہوتا۔ بہت بڑی غلطی کی جو کافر کو مسلمان سمجھا۔ یعنی وفاداری تو شرطِ اسلام ہے۔ کافر کو اس سے کیا تعلق۔

## غزل پھر مجھے دیدہ تر یاد آیا دل جگر تشنہ فریاد آیا

فرماتے ہیں۔ مجھے اپنا دیدہ تر پھر یاد آیا جس کے ذریعے سے میرے بہت سے حوصلے نکلا کرتے تھے اور آتشِ عشق۔ آتشِ شوق۔ آتشِ رشک کچھ کھلا جایا کرتی تھی۔ یعنی کسی قدر تسکین حاصل ہو جایا کرتی تھی۔ دوسرے مصرع میں فرماتے ہیں میرے دل و جگر دیدہ تر کے یاد آ جانے سے آرزو مند فریاد ہو گئے۔ مرزا صاحب نے فارسی محاورے کے موافق یہاں ہوئے کی جگہ آیا استعمال فرمایا ہے۔

## دم لیا تھا نہ قیامت نے ہونہ پھر ترا وقت سفر یاد آیا

دوست کو رخصت کرتے وقت جو دردناک کیفیت گزری تھی اور جو اُس کے چلے جانے کے بعد رہ رہ کر یاد آتی ہے۔ اس میں جو کبھی کبھی کچھ وقفہ ہو جاتا ہے اُس کو قیامت کے دم لینے سے تعبیر کیا ہے۔ ایسے طبعی شعرا و زبان میں کم دیکھے گئے ہیں۔ جو حالت فی الواقع ایسے موقع پر گزرتی ہے ان دو مصرعوں میں اس کی تصویر کشی دی ہے جس سے بہتر کسی اسلوب بیان میں یہ مضمون ادا نہیں ہو سکتا (از یادگار غالب)

## سادگی ہائے تمنا یعنی پھر وہ نیرنگ نظر یاد آیا

فرماتے ہیں۔ آرزو اور تمنا کی سادگی کو تو دیکھو یعنی پھر نگاہِ یار کی نیرنگیوں کا تماشا یاد آیا، مطلب یہ ہے کہ نگاہِ یار نے جو اشارے کنائے سے باتیں کی تھیں اور عاشق اپنی سادگی سے آرزو پوری ہونے کا ذریعہ سمجھا تھا بلکہ اپنی کامیابی کا یقین کامل ہو گیا تھا لیکن حال کچھ بھی نہ ہوا۔ ظاہر یہ ہوا کہ مشوق کی تنکائوں کا وہ ایک قریب تھا مگر اس میں ایک قسم کا لطفِ حال ہو چکا ہے اس لئے وہ پھر یاد آتا ہے۔

## عذر در ماندگی اے حسرتِ دل نالہ کرتا تھا جب مگر یاد آیا

فرماتے ہیں۔ اے حسرتِ دل میں مجھ سے اپنے قاصر رہنے کا عذر کرتا ہوں میں ضرور تیری

خواہش کے موافق نامہ کرنا لیکن مجبور اس سے ہو گیا کہ مجھ کو اپنا جگر یاد آ گیا یعنی میں نامہ کرنا تو جگر شوق ہو جاتا۔ مطلب یہ ہے کہ صرّتِ دل اس بات کی متقاضی تھی کہ نامہ کیا جائے اور اُس کے اثر سے کامیابی حاصل کی جائے۔ مگر ہمارا نامہ ایسا پُر درد نامہ تھا کہ اُس کے نسخے سے نکلنے ہی جگر شوق ہو جاتا۔

زندگی یوں بھی گزرتی جاتی کیوں ترا راہ گزریا د آیا  
فرماتے ہیں۔ زندگی بسر ہونے کے لئے کسی پر عاشق ہونا لازمی امر نہیں ہے۔ غیر عشق کے بھی آدمی جی سکتا ہے۔ تیری راہ گزریا د آنا ہمارے لئے مصیبت کا سبب ہو گیا۔ نہ تیری راہ گزریا د میں کی ہم مدت سے شہرت منا کرتے تھے دیکھنے کے لئے جاتے نہ تجھ سے دو چار ہوتے نہ تیرا عشق پیدا ہوتا نہ اس مصیبت میں پھنستے جس میں اب گرفتار ہیں۔ خوبی اس شعر میں یہ رکھی ہے کہ امور تضاد و قدر کو باغی نادانی کا سبب سمجھ کر اُس پر افسوس ظاہر کیا جاتا ہے۔ مرزا صاحب کے زمانہ میں رہ گزر کو نہ خبر بولا اور لکھا جاتا تھا۔ لیکن اب بالاتفاق اہل دلی ٹونٹ استعمال کرتے ہیں۔

کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوئی گھر ترا خصلہ میں گریا د آیا  
اس شعر میں مرزا صاحب اپنی معمولی شوخی برت گئے ہیں جس سے شعر کے دو معنی پیدا ہو گئے۔ ایک یہ کہ جب تیرا گھر ہم کو خلد میں یاد آئے گا اور رضواں سے اس کا ذکر کریں گے رضواں تیرے گھر پر خلد کو ترجیح دے گا ہم بھلا کیوں کر اس بات کو تسلیم کریں گے ضرور آپس میں جھگڑا ہو گا وہ ہمیں ٹھٹھلائے گا ہم اُسے ٹھٹھلائیں گے یہاں تک کہ لڑائی کی نوبت آجائے گی۔ دوسرے لطیف معنی یہ نکلتے ہیں کہ جب تیرا گھر خلد میں ہم کو یاد آئے گا تو ہم خلد سے نکل کر بھاگنا چاہیں گے۔ رضوان روکے گا۔ باہم خوب گفتگو گشتا ہوگی۔

آہ وہ جرأتِ فریاد کہاں دل سے تنگ آگے جگر یاد آیا

فرماتے ہیں۔ جگر کی موجودگی کے زمانے میں جو فریاد کرتے دقتِ جراثیم سے کام لیا جاتا تھا وہ جراثیم اب جگر کے مٹ جانے کے بعد باقی نہ رہی دلِ کمال انہی کی وجہ سے نالہ کرتے ہوئے پچھلکا تلبے اور اس کا سبب معشوق کی بدنامی کا خوف ہے۔ اگر جگر سینے میں ہوتا تو وہ اس قسم کا پس و پیش نہ کرتا نالہ میں اثر ہوتا یا نہ ہوتا مگر نالہ ضرور کیا جاتا۔

پھر ترے کوچہ کو جاتا ہے خیال دلِ گم گشتہ مگر یاد آیا  
فرماتے ہیں۔ تیرے کوچے میں ہمارا دل کھو گیا ہے اس لئے رہ رہ کر تیرے کوچے کا خیال آتا ہے۔ شاید یہ بات کہ دلِ گم گشتہ ہم کو بار بار یاد آتا ہے۔ مرزا صاحب نے اس مضمون کو ادا کرنے میں آدابِ عشق اس قدر ملحوظ رکھا ہے کہ دوست کو دل کی چوری کا الزام نہیں دیتے بلکہ اُس کے کوچے میں دل کا گم ہو جانا ظاہر کرتے ہیں۔ دوسری نزاکتِ معانی اس شعر میں یہ ہے کہ بے چین کرنے والے معشوق کی یاد ہے مگر افضائے رازِ عشق کے لئے دلِ گم گشتہ کے یاد کرنے کا بہانہ کیا جاتا ہے۔

کوئی دیرانی سی دیرانی ہے دشت کو دیکھ کے گھرا دیا  
اس شعر میں دو معنی نکلتے ہیں۔ اول یہ کہ جس دشت میں ہم ہیں وہ اس قدر دیران ہے کہ اُس کو دیکھ کے گھرا دیا جاتا ہے۔ یعنی خوفِ معلوم ہوتا ہے مگر ذرا غور کرنے کے بعد یہ دوسرے معنی نکلتے ہیں کہ ہم تو اپنے گھری کو سمجھتے تھے کہ ایسی دیرانی کہیں نہیں ہوگی۔ مگر دشت بھی اس قدر دیران ہے کہ اُس کو دیکھ کر گھر کی دیرانی یاد آتی ہے۔

میں نے محنوں پہ لڑکپن میں اسد سنگ اٹھایا تھا سرِ یاد آیا  
فرماتے ہیں۔ میں نے بچپن کے زمانے میں لڑکوں کی دیکھا دیکھی محنوں پہ پتھر اٹھایا تھا مگر فوراً ہی مجھ کو اپنا سرِ یاد آ گیا۔ یعنی یہ خیال ہوا کہ میرے سر میں بھی اسی قسم کا سوداِ عشق سمایا ہوا ہے۔ یعنی سیرِ مزاج تو بچپن سے عاشقانہ تھا۔

### عَنْزِل

ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا۔ آپ آتے تھے مگر کوئی غماں گیر بھی تھا فرماتے ہیں۔ وعدہ پر آپ تشریف تو لے آئے مگر دیر کر کے آئے اس وقت کی کوئی وجہ ضرور ہوگی۔ شاید یہ وجہ ہو کہ غیر آپ کو یہاں آنے سے روکتا تھا۔

تم سے بچا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلا۔ اس میں کچھ شاید خوبیِ تقدیر بھی تھا ظنراً زشتی تقدیر کو خوبیِ تقدیر کہا گیا ہے۔ فرماتے ہیں۔ مجھ سے مجھے اپنی تباہی کا گلا بچا ہے۔ اس میں ضرور کچھ نہ کچھ میری بھی بد نصیبی کی شرکت تھی۔ معشوق کو کثرتِ محبت کی وجہ سے الزام دیتے ہوئے ہچکچاتے ہیں۔

تو مجھے بھول گیا ہو تو رستہ بتلا دوں۔ کبھی فتراک میں تیرے کوئی غم بھی تھا فرماتے ہیں میں وہی شکار ہوں جو کبھی تیرے گھوڑے کے شکار بند میں باندھا گیا تھا اور تو نے مجھ کو حقیر سمجھ کر کھول پھینکا تھا۔ تو شاید مجھ کو بھول گیا ہو۔ مگر ابھی تک اپنے کو تیرا شکار ہی سمجھے جاتا ہوں۔ پنجرِ شکار کو کہتے ہیں۔ فتراک اُس سوئی رستی یا تسمہ کو کہتے ہیں جو گھوڑے کی زین میں ٹینڈیوں کے چاروں طرف بندھی ہوئی یا پیوستہ ہوتا ہے۔

قید میں ہے تیرے وحشی کو وہی زلف کی یاد۔ ہاں کچھ اک پنجرِ گرانباری زنجیر بھی تھا فرماتے ہیں تیرا وحشی تیری زلف کی یاد کو جس میں پہلے قید رہ چکا ہے ابھی تک بھولا نہیں البتہ اس کے ساتھ ایک خفیہ سا خیالِ گرانباری زنجیر کا بھی تھا۔ اس بیان سے قیدِ زلف کے مقابلے میں قیدِ زنجیر کی سختی کو کم درجہ کا ثابت کرنا منظور تھا۔

بجلی اک کو نہ گئی آنکھوں کے آگے تو کیا بات کرتے کہ میں لب تشنہ تنفر رہ بھی تھا اس شعر میں مرزا صاحب نے اس مضمون کو کہ معشوق نے اک کی اک میں اپنی صورت دکھا دی تو اس سے کیا فتنی ہو سکتی ہے اس طرح ادا کیا ہے۔ "بجلی اک کو نہ گئی آنکھوں

کے آگے تو کیا۔ دوسرے مصرعہ کا مفہوم یہ ہے۔ مجھ سے گفتگو بھی کرنی چاہئے تھی میں  
تقدیر سننے کا بھی مشتاق تھا۔ آنکھوں کو تو دیدار سے کچھ تھوڑی بہت تسلی ہو گئی مگر  
دل کا ارمان نہ نکلا۔ یہ جب ہی نکلتا کہ میرے پاس تھوڑی دیر ٹھہر کر مجھ سے بات چیت  
کی جاتی۔

یوسف اسکو کہوں اور کچھ کہے خیر ہوئی مگر گزریٹھے تو میں لائق تعزیر بھی تھا  
فرماتے ہیں میں نے اُس کو یوسف کہہ دیا (یعنی غلام بنا دیا)۔ ہنسی خیر ہو گئی کہ وہ مجھ سے  
اپنی یہ تعریف سن کر خاموش ہو گیا۔ اگر وہ ناراض ہو جاتا تو میں یوسف کہہ دینے کے جرم  
میں سزا کے قابل تھا۔

دیکھ کر غیر کو ہو کیوں نہ کلیجہ ٹھنڈا نالہ کرتا تھا ولے طالب تاثیر بھی تھا  
فرماتے ہیں۔ غیر کو دیکھ کر میرا کلیجہ کیوں نہ ٹھنڈا ہو جائے اس کے کہ میں نالے کرتا تھا اور  
اپنے نالوں سے تاثیر کا طلبگار بھی تھا۔ یعنی مجھ پر میرے نالوں کا اثر کچھ ظاہر نہ ہوا تھا۔  
اب غیر کو بُری حالت میں دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ یہ میری ہی فراڈ کا اثر ہے۔

پیشے میں عیب نہیں رکھتے نہ فراڈ کو نہ نام ہم ہی آشفٹہ سرد میں جواں میر بھی تھا  
فرماتے ہیں پیشہ کچھ عیب کی بات نہیں ہے۔ آپ فراڈ کو کیوں نام رکھتے ہیں یعنی فراڈ بھی  
ایک عشق پیشہ گزرا ہے۔ ہم بھی عشق پیشہ ہیں اور میر بھی عشق پیشہ تھا اگر فراڈ نے عشق  
کی مفتیوں سے عبور ہو کر کوہ کنی اختیار کی تو اس میں عیب کی کیا بات ہے۔ کوئی عاشق پہا  
کا شتا ہے۔ کوئی فریقہ مصیبت کے دن کا شتا ہے۔ کوئی ضیفہ ہجر کی راتیں کا شتا ہے۔  
ہم تھے مرنے کو کھڑے پاس آیا نہ سہی آخر اُس شوخ کے ترکش میں کوئی تیر بھی تھا  
فرماتے ہیں۔ ہم تو جان قربان کرنے کے لئے اُس کے سامنے جا کھڑے ہوئے تھے۔ اگر اُس نے  
ہمارے پاس آنا کسر شان سمجھا تھا تو وہ ہی سے کوئی تیر کھینچ لارا ہوا۔ مطلب یہ ہے کہ  
ہم سے ناچیز عاشق کو بھی اپنے ادا و ناز کا شکار بنانا ضرور تھا۔

کپڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے یراقی آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا  
 فرماتے ہیں۔ کراٹا کا تبین کی تحریر پر تمہیں ہمارے گناہوں کا شمار منحصر رکھا گیا ہے۔ وہ تو  
 فرشتے ہیں اُن کو انسانی خواہشات کا کیا احساس ہے جس بات کو چاہا گناہ میں شامل کر لیا  
 کہنے کے وقت دُنیا کے دستور کے موافق ہمارا آدمی یعنی ہمارا کوئی دلیل ضرور ہونا چاہئے  
 تھا۔ سرت فرشتوں کی تحریر پر ہمیں کیوں سزا دی جاتی ہے۔

ریختہ کے تھیں استاد نہیں ہو غائب کہتے ہیں گلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا  
 ریختہ اور دو میں شعر کہنے کو کہتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔ اُس دو شاعری میں اسے غائب تھیں استاد  
 نہیں ہو۔ کہتے ہیں۔ یعنی مشہور ہے کہ پہلے زمانے میں کوئی شاعر میر بھی تھا۔ کس خوبی سے  
 فنِ سخن میں اپنے کو میر صاحب کا ہم تہ ہونا ثابت کیا ہے۔

### غزل

لب خشک و تشنگی مردِ گاہ کا زیارت کدہ ہوں دل آزر دگاہ کا  
 فرماتے ہیں۔ میں لب خشک اُن لوگوں کا ہوں جو آرزو اور شوق کی حالت میں بغیر کامیابی  
 چال کئے دُنیا سے گزر گئے ہیں۔ اس واسطے دل شکستہ اور پریشان خاطر لوگوں کی زیارت  
 گناہ بن گیا ہوں۔ دل آزر دگاہ سے مراد گروہِ عشاق ہے جو اکثر محرومی کی حالت میں  
 مبتلا رہتے ہیں۔

ہم نہ اُمید سی جہم بد گمانی میں دل ہوں فریبِ وفا خور دگاہ کا  
 فرماتے ہیں۔ سر سے پائیک نہ اُمید سی اور بد گمانی کی تصویر بن گیا ہوں اس لئے کہ میں اُن  
 لوگوں کا دل ہوں جو وفا کے شوق کا فریب کھا چکے ہیں یعنی جن عشاق نے مشق کو  
 وفادار سمجھ کر اس سے طرح طرح کے نقصان اُٹھائے ہیں اور آخر کار حصولِ ناکامی  
 کے بعد نہ اُمید سی چھل کی ہے۔

## غزل

تو دوست کسی کا بھی شکر نہ ہوا تھا اوروں پہ ہے وہ ظلم جو مجھ پر ہوا تھا  
اس شعر کے ظاہری معنی تو یہ ہیں کہ آج تک کسی کا بھی تو نہیں بنا ہے اور تیرا جو ایک  
مجھ ہی پر نہیں بلکہ اوروں پر تو نے مجھ سے زیادہ ظلم کئے ہیں۔ لیکن کسی قدر گہرا مطلب  
اس شعر کا یہ ہے کہ جو ظلم مجھ پر کبھی نہ ہوا تھا وہ اب تو اوروں پر کر رہا ہے۔ اوروں  
سے یہاں خاص رقیب کی طرف اشارہ ہے یعنی رقیب پر تو نے مجھ سے زیادہ ستم  
کر کے میرے دل میں رشک کی ایسی آگ لگا دی ہے کہ جس کے مقابلہ میں جو د ستم  
کچھ حقیقت نہیں رکھتے۔ تیری اس اداسے ثابت ہو گیا کہ میرے متعلق تیرا ترک جو  
دشمنی کا اظہار کر رہا ہے۔

چھوڑا مہِ نخب کی طرح دستِ قضا نے خورشیدِ بنو زُاس کے برابر نہ ہوا تھا  
اے نخب وہ مصنوعی چاند جس کو حکیم ابن عطا مشہور ابن مقفانے چاندِ نخب سے  
بھلا لیا تھا۔ یہ چاند دواؤں کے ذریعہ سے تیار کیا گیا تھا۔ اس کی روشنی دور تک نہ  
پھیل سکی تھی اور اصل چاند کے سامنے ناقصا خلقت قرار پایا تھا۔ دو مہینے تک چاندِ  
نخب سے نکلتا رہا بعد میں شق ہو گیا۔ فرماتے ہیں۔ اے نخب کی طرح ناقص اور بیکار  
سمجھ کر دستِ قدرت نے چھوڑ دیا۔ حالانکہ خورشید ابھی روئے یار کے مقابلہ میں  
مکمل کو نہ پہنچا تھا۔

توفیق بہ اندازہِ ہمت ہے ازل سے آنکھوں میں ہے وہ قطرہ جو گوہر نہ ہوا تھا  
بالکل نیا اور اچھوتا اور باریک خیال ہے اور نہایت صفائی اور عمدگی سے اس کو  
ادا کیا گیا ہے۔ اگر کسی کی سمجھ میں نہ آئے تو اس کی سمجھ کا قصور ہے۔ دعویٰ یہ  
ہے کہ جس قدر ہمت عالی ہوتی ہے اسی کے موافق اُس کی تائیدِ غیب سے ہوتی ہے اور  
ثبوت یہ ہے کہ قطرہ اشک جس کو آنکھوں میں جگہ لی ہے اگر اس کی ہمت جبکہ وہ



دریا میں تھا موتی بن جانے پر قانع ہو جاتی تو اُس کو جیسا کہ ظاہر ہے یہ درجہ یعنی آنکھوں میں جگہ ملے کا حاصل نہ ہوتا (از یادگار غالب)

جب تک کہ نہ دیکھا تھا قندیار کا عالم میں مستقدِ فتنہ محشر نہ ہوا تھا قندیار کو ہمیشہ نقض، مشر یا سرود ششاد گلستان سے تشبیہ دی جاتی ہے فرماتے ہیں کہ جب تک میں نے قندیار کا اندازہ اور اس کی خسر خرومی کا تماشا اپنی آنکھوں سے نہ دیکھا نقضِ قیامت کا دل سے مستقد نہ ہوا تھا۔

میں سادہ دل آزدگی یا رے خوش ہوں یعنی سبقِ شوق مکر نہ ہوا تھا سادہ دل یا سادہ لوح یہ قوتِ آدمی کو کہتے ہیں فرماتے ہیں۔ میں اپنی سادہ دلی سے آزدگی یا رے کو بھی موجبِ عیش و مسرت سمجھتا ہوں اور دل میں خوش ہوں کہ میں سبقِ شوق کی ایک مرتبہ لذت نصیب ہو چکی ہے دوبارہ بھی اس کا لطف حاصل ہو گا یعنی یا رے سے جب صلح ہو جائے گی تو پھر سبقِ شوق کو دہراؤں گا اور وہ باتیں جو ایک مرتبہ دل کو مزادے چکی ہیں مکر یعنی دوسری بار بھی مزادیں گی۔ یہ فہرہ نہیں کہ اب اُس سے صلح ہونی ممکن نہیں۔ دریائے معاصی تنگ آبی سے ہوا خشک میرا سردامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا فرماتے ہیں۔ گناہ کرنے میں ہمارا حوصلہ اس قدر فراخ ہے کہ باوجودیکہ دریائے معاصی خشک ہو گیا مگر ابھی ہمارے دامن کا کو نہ تک بھی نہیں بھیگا (از یادگار غالب) گناہ کی تکمیل کے حوصلہ گناہ کا باقی رہنا اور شوقِ گناہ میں یہ کہنا کہ دریائے معاصی تنگ آبی سے خشک ہو گیا بالکل اچھوتا خیال اور نئی جہت ہے۔ سنا گیا ہے کہ اُستادِ ذوق کو مرزا صاحب کا یہ شعر بہت پسند تھا۔

جاری تھی آسداغ جگر سے مری تحصیل آتشکدہ جاگیرِ سمندر نہ ہوا تھا سمندر ایک جانوریہ بیان کیا جاتا ہے جو نیلے کی قسم کا مگر نیلے سے کسی قدر چھوٹا ہوتا ہے آگ میں پیدا ہوتا ہے۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں۔ میں اُس وقت سے اپنے داغ جگر

سے فائدہ حاصل کر رہا تھا کہ جب آفتکدہ میں سمندر پیدا بھی نہ ہوا تھا یعنی جب سمندر کا وجود بھی نہ تھا۔

### غزل

شب کہ وہ مجلسِ فردِ خلوتِ ناموس تھا رشتہ ہر شمعِ خارِ کسوتِ فانوس تھا  
رشتہ شمع سے وہ تانکا مراد ہے جو مومِ بچی کے درمیان میں ہوتا ہے اور موم کی وساطت سے روشن ہو کر جلتا رہتا ہے۔ ناموس۔ شرم و حیا۔ کسوت لباس۔ خاور و پیرا میں بون  
فارسی محاورہ ہے۔ مرزا صاحب نے اُردو شعر میں نظم کیا ہے۔ فانوس کا ڈھانچہ اکثر وہ  
کے تاروں کا بنا کر اُس پر باریک کپڑا چڑھا دیتے ہیں شعر کا مطلب یہ ہے کہ رات کو  
حیا و شرم کی محفلِ خلوت میں معشوقِ بزمِ افروز تھا اس کے سامنے شمعِ خیالات سے پانی پانی  
ہو رہی تھی اور شمع کے حق میں رشتہ شمعِ خارِ پیرا میں بن گیا تھا۔

مشہدِ عاشق سے کوسوں تکبہ اُگتی ہے حنا کس قدر یاربِ ہلاکِ حسرتِ پابوس تھا  
مرزا صاحب فرماتے ہیں۔ شہادتِ گاہِ عاشق میں کوسوں تک مہندی کے درخت پیدا ہوتے  
ہیں یہ اس خون کے اثر سے ہیں جو وقتِ قتل بہا یا گیا تھا۔ اور حنا کا پیدا ہونا یہ بتا رہا ہے کہ  
شہید کس قدر حسرتِ پابوس کا خواہشمند تھا۔ زندگی میں تو یار کے قدموں تک اس کی  
رسائی نہ ہوئی مگر اس آرزو میں خاک ہو جانے کے بعد اب اس نے حنا کے لباس میں  
ظاہر ہو کر قدموں کی آرزو و ظاہر کی ہے۔ اگر معشوقِ مہندی پاؤں میں لگالے گا تو یہ  
خوابش پوری ہو جائے گی۔

جہلِ الفت نہ دیکھا جز شکستِ آرزو دل بدل پیوستہ گویا اک لبِ افسوس تھا  
فرماتے ہیں۔ ہم نے عشق و محبت کا انجام اس کے سوا اور کچھ نہ دیکھا آخر کار حسرت و  
آرزو کا خون ہو گیا۔ عاشق و معشوق کا اگر دل سے دل مل بھی گیا تو وہ بھی گویا اک لبِ  
افسوس بن کر اخیر میں ہاتھ ملتا ہی نظر آئے گا۔

کیا کموں بیماری غم کی فراغت کلیاں جو کہ کھایا خون دل بے منت کیسوں تھا  
 کیسوں اصطلاح طب میں ہضم جگر کا نام ہے جس میں غذا ہضم ہو کر خون بن جاتی ہے۔  
 میرزا صاحب فرماتے ہیں کہ بیماری غم کی فارغ ابالی کی کیا تعریف بیان کروں۔  
 جو کچھ میں نے اسے کیسوں ہو رہے خون جگر ہو گیا۔ مطلب یہ ہے کہ بیماری غم میں  
 میں نے ہمیشہ خون دل نوش فرمایا۔ اور خون دل کھا، غم وہ غذا نہ کھانے کے تمام  
 پر امتثال ہوتا ہے۔ درد رت معنی اس شعر میں یہ بھی پیدا ہوتے ہیں کہ بیماری غم میں  
 مجھ کو اس قدر فارغ ابالی حاصل تھی کہ جو غذا میں کھاتا تھا ایسی معلوم ہوتا تھا  
 کہ خون دل کھا رہا ہوں۔

### غزل

آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے بگئے صاحب کو دل دینے پہ کتنا غور تھا  
 مرزا صاحب، مشق سے کہتے ہیں کہ تم میرا عاشقی پر طہ نہ دین تھے اور میرا مذاق  
 اڑاتے تھے آئینہ دیکھ کر اپنا، ورت پر خود بھی ماضی ہو گئے اب وہ دل نہ دینے کا  
 غور کہاں گیا۔

قاسم کو اپنے ہاتھ سے گردن مارے اُس کی خطانہ تھی یہ سیرا قصور تھا  
 عشق اباز ہے، نہیں دیر کہ مشق اپنے ہاتھ سے کسی کو نکل کرے اور ماضی دیکھے  
 اس مشق کو مرزا صاحب نے اس لطیف سیرا میں بیان کیا ہے اور قاسم کی  
 خطا کو اپنی خطا کا ہر کرنے سے یہی مراد ہے کہ وہ ہم کو اپنے ہاتھ سے قتل کر دے اُس نے  
 ہاتھ سے دوسرے شخص کا قتل ہوا دل محبت کسی طرح گوارا نہیں کر سکتا۔

### غزل

عزیز نیاز عشق کے قابل نہیں رہا جس پل پہ از تھا مجھے وہ دل نہیں ہا  
 فرماتے ہیں کہ میں دل کو نہ از عشق کے لئے نہیں کیا ہا، وہ دل اب ہرے پا ۱۶

نہیں رہا یعنی حجر کے صدمے۔ یونانی کے رنج۔ بے اعتنائی کے قطن اتنے اٹھلے  
ہیں کہ میں عشق کی خدمت بجالانے کے قابل نہیں رہا۔ دوسرے مصرعہ میں فخریہ  
کتنے ہیں میرا دل درحقیقت عشق کی بارگاہ میں پیش کرنے کے قابل تھا اور پیش  
بھی کیا گیا تھا اور مجھ کو اس دل پر کسی زمانہ میں ناز بھی تھا مگر اب وہ دل صدمے اٹھاتے  
اٹھاتے کسی قابل نہیں رہا۔

جاتا ہوں داغِ مسرتِ سہی لئے ہوئے ہوں شمعِ گشتہ درخورِ محفل نہیں رہا  
فرمانے ہیں۔ میں دُنیائے جاتا ہوں مسرتِ سہی کا داغ لئے ہوئے یعنی قضاے مجبور ہو کر  
میں نے جان دی ہے۔ میرا دل مرنے کو نہ چاہتا تھا۔ دوسرے مصرعہ میں دعویٰ تسننِ دل  
واقع ہوا ہے۔ یعنی میں کبھی ہوئی شمع ہوں محفل کے قابل نہیں رہا۔ قاعدہ یہ ہے کہ جب  
شمع بجھتی ہے تو جتنی بہت دیر تک جھلکتی رہتی ہے اور وہ گویا داغِ مسرتِ سہی ہے۔  
مرنے کی اسے دل اور سہی تدبیر کر کہ میں شایانِ دست و بازو سے قاتل نہیں رہا  
فرماتے ہیں۔ عاشق کی حالت زار و زار دیکھ کر قاتل کو رحم آگیا اور اس نے قتل نہ کیا اور ہوا  
کے بعد قتل کرنے سے اتھ کھینچ آیا ہے اس منہوں کو اس ملت فرماتے ہیں، مگر یہاں شایانِ دست  
و بازو سے قاتل نہیں رہا۔ اب مجھ کو اپنے مرنے کی اومہی کچھ تدبیر کرنی چاہئے قاتل کا سہارا  
تو میری حالت زار سے مناسبی دیا اور حالت زار اس بات کی مشفق ہے کہ کسی نہ کسی طرح  
مر جائیگا۔

بر روئے ششِ جہت در آئینہ باز ہے یاں امتیازِ ناقص و کامل نہیں رہا  
فرماتے ہیں آئینہ جس طرح عکس قبول کرتا ہے کچھ امتیاز نہیں کرتا اس نے ابھارنے کی کڑاوت  
دلِ عادت اور اہل دنیا کی ہے۔ یہ شعر حقیقت، و مجاز دونوں پہلوئے ہوئے ہے۔  
اگر حقیقت کی طرف اس شعر کو لے جانا چاہو۔ تو مطلب یہ ہوگا کہ دلِ عادت پر اچھی  
بُری دونوں کیفیتیں پراگٹن ہوتی ہیں۔ اور اگر اس شعر کے معنی مجازی لے جائیں گے تو

یہ مطلب نکلتے گا کہ اہل دنیا کو اپنے بُرے کلام کا فرق محسوس نہیں ہوتا جس کی وجہ سے وہ ناقص و کامل کا فرق سمجھ نہیں سکتے۔

داگر دیئے ہیں شوق نے بند نقابِ حسن غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا  
فرماتے ہیں۔ شوق خود نمائی نے نقابِ حسن کے بند کھول دیئے ہیں یعنی قدرہ قدرہ۔ پتہ پتہ  
قطرہ قطرہ مظہرِ تجلیات الہی ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ ناظر کی ظاہری آنکھ اس کو دیکھ نہیں سکتی۔  
اس لئے کہا گیا ہے کہ سوائے نظر کے کوئی حجاب درمیان میں باقی نہیں ہے چشمِ باطن دا  
ہو جائے تو حجابِ ظاہری اٹھ سکتے ہیں۔

گو میں رہا رہیں ستمائے روزگار لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا  
فرماتے ہیں۔ باوجود اس کے کہ میں رنج و کامِ دنیا میں مبتلا رہا لیکن تیری یاد کسی وقت کسی  
حالت میں میرے دل سے نہیں مٹتی اور میں کبھی تیرے خیال سے غافل نہیں رہا یہ اور  
اس سے اوپر کا شعر خاص فقرات کے رنگ میں ہیں۔

دل سے ہوائے گشتِ فاسٹ گئی کہ دل حاصل سوائے حسرتِ ساحل نہیں رہا  
فرماتے ہیں اب دل سے بلوغِ وفا کی کر ز بھی مٹ گئی۔ حوصلہ پست ہو گیا۔ بہت نے خواب  
دے دیا اور اس کا سبب یہ ہے کہ وفا کے بعد وفا کا جملہ حسرت و افسوس کے سوائے کچھ  
نہیں پایا۔

بیدارِ عشق سے نہیں ڈرتا مگر اسد جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا  
مطلع کے مصرعہ ثانی پر دوبارہ مصرعہ لگایا ہے۔ فرماتے ہیں۔ بیدارِ عشق سے میں نہیں ڈرتا  
اور یہ گریزِ خوف کے سبب سے نہیں ہے بلکہ اے اسد ظلم اٹھانے والا دل جو میرے پہلو میں  
تھا اور جس پر مجھ کو ناز تھا وہ دل باقی نہیں رہا۔ اب بیدار کون اٹھائے۔

غزل  
ریشم کتا ہے کہ اُس کا غیر سے اخلاصِ عقل کستی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا

فرماتے ہیں عشق نے تو میرے دل میں یہ وہم پیدا کر دیا ہے کہ ہائے غیر سے وہ محبت کے ساتھ کتاب ہے اور عقل ساری عمر کے تجربہ کے بعد یہ کہتی ہے کہ بھلا وہ بے مہر جس کی خلقت میں محبت رکھی ہی نہیں گئی کس کا آشنا ہو سکتا ہے۔

ذرہ ذرہ ساغر میخانہ نیرنگ ہے گردش مجنوں بچشک ہائے لیلی آشنا فرماتے ہیں۔ دنیا کا ایک ایک ذرہ میخانہ مکرو فریب کے ایک ایک ساغر کا حکم رکھتا ہے اور یہ ساری نیرنگ سازی دنیا میں آسمان کے اشارے سے ہو رہی ہے۔ مثال دہلی یہ ہے کہ مجنوں کو دیکھ لو جنوں کی حالت میں اس کی باگ ڈور لیلی ہی کے اشارے سے ہے۔ شوق ہے سامان طراز نازش رباب عجز ذرہ صحرا دستگاہ و قطرہ دریا آشنا فرماتے ہیں۔ رباب عجز یعنی انسان خاکی کا سراپہ ناز عشق ہے جس کے سبب سے ایک ذرہ نایز صحران جاتا ہے اور قطرہ بے حقیقت دریا ہو جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ انسان خاکی جو ایک بے اعتبار ہستی رکھتا ہے عشق الہی تک ترقی بہم پہنچا کر جس طرح ذرہ صحرا میں اور قطرہ دریا میں مل کر عین صحرا اور عین دریا کہلانے کا سزاوار ہو جاتا ہے۔ اسی طرح انسان ذات باری تعالیٰ تک عشق کی بدولت رسائی حاصل کر لیتا ہے۔

شکوہ سنج رشک ہمہ گیر نہ رہنا چاہئے میرا زانو موس اور آئینہ تیرا آشنا فرماتے ہیں۔ رشک و بدگمانی دونوں بے لطف کر دینے والی باتیں ہیں۔ باہم ہم دونوں کہ ان دونوں بلاؤں سے قطع نظر کر لینی چاہئے اس لئے کہ زانو میرا رفیق ہے میں ہمیشہ سر پہ زانو رہتا ہوں اور آئینہ تمہارا آشنا ہے۔ اس سے تم ہر وقت مشغول رہتے ہو۔ بہتر یہ ہے نہ تم شکایت کرو نہ میں بُرا مانوں۔

میں اور اک آفت کا مظاہرہ دل حسی کہے عاقبت کا دشمن اور آوارگی کا آشنا مجھے اس وحشی دل سے پالا پڑا ہے جو ایک آفت کا مظاہرہ اور عاقبت کا دشمن ہے یعنی آرم ہے مجھ کو اپنے گھر میں بیٹھنے ہی نہیں دیتا۔ عشق کے سودا میں آوارہ کر کے علم علم

کو کہہ کر نہ لے پھرتا ہے۔  
 کو کہن نقاش یک نمثال شیریں تھا آئندہ سنگ سے سر بار کر ہوئے نہ پیدا آشنا  
 فرماتے ہیں۔ اب آئندہ کو کہن نے جو کہہ بے ترقی کو تراشا اس سے اس کی یہ غرض تھی کہ ایک  
 تصویر سایہ دار شیریں کی بناوٹ وہ نادان یہ نہ سمجھا کہ بھلا کیسے چہرے سر بار کر بھی  
 مشوق پیدا کئے جاسکتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اس کا عشق کامل نہ تھا۔

### غزل

ذکر اُس پر پوش کا اور پھر بیاں اپنا بن گیا رقیب آخر تھا جورا زواں اپنا  
 فرماتے ہیں۔ میں نے جو مشوق کے حسن کی تعریف کی تو جو شخص میرا محرم راز اور مہنشین  
 تھا وہ بھی مٹ کر میرا رقیب بن گیا اس واسطے کہ اول تو ایسے پر پوش کی تعریف تھی  
 اور وہ بھی مجھ جیسے جادو بیان کی زبان سے پہلے مصرعہ کا دوسرا لکھ لینی اور پھر  
 بیان اپنا یہ مرزا صاحب کی خصوصیات میں سے ہے۔ (از یادگار غالب)

مے وہ کیوں بہت پیٹے بزم غیر میں یارب آج ہی ہوا منظور اُن کو امتحاں اپنا  
 فرماتے ہیں۔ اگر اُن کو اپنی عالی ظرفی کا امتحاں منظور نہ ہوتا تو وہ بزم غیر میں شراب  
 مقدار سے زیادہ کیوں پیٹے اس کے بعد صحت سے یہ فرماتے ہیں کہ یارب اُن کو اپنی  
 عالی ظرفی کا امتحاں آج ہی منظور ہوا۔ کاش یہ امتحاں میری بزم میں ہوا ہوتا تو میں کئی  
 زیادہ بخود ہی سے لطف و دل زیادہ ملال کر سکتا۔ دوسرا رشک کا پہلو یہ بھی مطلب کہ  
 میری موجودگی میں کیوں اُن کو اپنا امتحاں منظور ہوا۔ یہ قسمی سے میرے واسطے یہ نظارہ  
 نہایت دلخراش اور ضبط آزار تھا۔

منظر اک بلند می پر اور ہم بنا سکتے عرش سے ادھر ہوتا کاش کہ مکان اپنا  
 مطلب یہ ہے۔ ہم اپنی حقیقت و اسیت سے بالکل بے خبر ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارا  
 مکان عرش اعلیٰ پر واقع ہوا ہے۔ کاش ہمارا مکان عرش سے اس طرف ہوتا کہ ہم عرش

پر منظر بنا کر اپنے مقام کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے لیکن افسوس یہ ہے کہ مکان ایسی جگہ ہی پر واقع ہوا ہے جس سے بلند تر اور کوئی جگہ ہی نہیں ہے۔

جسے وہ جس قدر ذلت ہم ہنسی میں ڈالیں گے بارے آشنا نکلا اُن کا پاساں اپنا یعنی خوب ہی ہوا کہ مشوق کے در کا پاساں ہمارا جان پہچان نکلا اب ہمارے لئے اس بات کا موقع حاصل ہے کہ وہ جس قدر چاہے ہم کو ذلت دے ہم اُس کو ہنسی میں ڈالتے رہیں گے اور یہ ظاہر کریں گے کہ ہمارا قدیم آشنا ہے اور ہمارا اس کا قدیم سے ہی برادر ہے۔ (از ادکار غالب)

دردِ دل کھوں کتبِ جاوید اُنکو دکھلاؤں انگلیاں نگار اپنی خامہ چوچکاں اپنا فرماتے ہیں۔ خط میں اپنا دردِ دل کب تک کھتا رہوں۔ یہ کجخت تو ختم ہی نہیں ہوتا اور اس طولانی تحریر کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگلیاں زخمی ہوئیں اور قلم سے خون چپکنے لگا۔ ستر یہ ہے کہ میں خود ان کے پاس چلا جاؤں۔ اپنی انگلیاں اور اپنا چوچکاں خامہ اُن کو دکھلا دوں۔ اُسید تو یہ ہے کہ دونوں حالتیں دیکھ کر وہ خود اپنے دل میں برسے دردِ دل یعنی میری مصیبتوں کو سمجھ لیں گے۔

گھستے گھستے مٹ جاتا اپنے عبث بدلا ننگِ سجدے سے میرے ننگِ آستان اپنا فرماتے ہیں۔ آپ نے اپنا ننگِ آستان اس لئے بلا ہے کہ میرے سجدے سے میرے اُسے خراب یا ناپاک کر دیا تھا مگر آپ نے ایسا کیوں کیا وہ خود ہی کثرتِ سجدے سے گھس جاتا اس وقت نیا پتھر اس جگہ لگا دیا جاتا۔

تاکرے نہ غمازی کر لیا ہے دشمنِ گور دوست کی شکایت میں ہم نے ہمزیاں اپنا فرماتے ہیں۔ ہم دشمن کی زبان سے دوست کی شکایت اگلا لیتے ہیں اور پھر خود بھی اُس کی باں میں ہاں ملاتے جاتے ہیں۔ اور یہ اس غرض سے ہے کہ وہ کہیں ہماری پختی یا رے سے جا کر نہ کھلے۔ گویا ہم نے شکایتِ یار میں اُس احمق کو اپنا ہمزیاں بنالیا ہے۔



ہم کہاں کے دانائے کھلے کس ہنر میں کیاتھے بے سبب ہوا غالب دشمن آسمان اپنا  
 یہ بات مشہور ہے کہ آسمان اہل کمال کا دشمن ہوا کرتا ہے۔ مرزا صاحب اپنی کسریٰ سے  
 فرماتے ہیں۔ ہم ایسے کہاں کے عقلمند اور فن سخن میں یکتائے روزگار تھے۔ اے غالب  
 ہمارا دشمن تو آسمان ہے سبب ہو گیا ہے۔ اور یہ بات اوپر بتا دی ہے کہ بے سبب  
 آسمان دشمن ہوا نہیں کرتا۔ آسمان کی دشمنی کے سبب دانائی اور کینائی ہوا کرتے  
 ہیں۔ لہذا اپنی دانائی اور ہنرمندی میں خوبی کے ساتھ ظاہر کی ہے اس کی تعریف  
 نہیں ہو سکتی۔

### عزل

سُرمہ مفت نظر ہوں مری قیمت یہ ہے کہ رہے چشم خریدار پہ احساں میرا  
 مرزا صاحب نے یہ شعر اپنے حسن کلام کی تعریف میں لکھا ہے۔ یعنی میرے کلام کا فیض عام  
 ہے اور اس سے مفت نفع حاصل ہو سکتا ہے اور وہ صرف اس غرض سے ہے کہ خریدار  
 کی آنکھ پر میرا احسان رہے۔ یعنی بصارت سخن فہمی اس سُرمہ سے حاصل ہوتی ہے۔  
 رخصت نالہ مجھے دے کہ مبادا ظالم تیرے چہرے سے ہو ظاہر غم نہیاں میرا  
 یعنی اگر نالہ کی اجازت نہ ہوگی تو ہم ضبط نالہ کریں گے اور اس کا اثر ضرور ہے کہ تجھ تک  
 پہنچے گا۔ نالہ دل سے نکلتا ہے اور ضبط کی حالت میں وہ دل ہی میں دھڑکن کی طرح کھٹکے گا  
 مثل مشہور ہے کہ دل سے دل کو راہ ہوتی ہے۔ تیرے دل تک اس کا اثر پہنچے گا اور  
 انجام کار تیرے چہرے سے وہ اثر ظاہر ہوگا۔

### غزل

غافل بہ دہم ناز خود آرا ت در دنیاں بے شائبہ صدا نہیں لڑہ گیا ہ کا  
 فرماتے ہیں۔ اہل دنیا را ز بے شائبہ۔ ہر شخص کی بیعت و بیعت  
 دنا کا ایک آوہ ہے جو سب کے دلوں میں یہ دہم پیرا کر دیتا ہے کہ ہم نے یہ کام۔

اچھا کیا اور ہماری تدبیر سے یہ کام بن پڑا۔ حالانکہ جو کچھ ہے سب اُس کی طرف سے ہے۔ بغیر حکم الہی کے یہاں کچھ نہیں ہوتا۔ لطف الہی کو باریک سب سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ بزم قدح سے عیشِ تمنا نہ رکھ کر رنگِ صیدِ زوامِ جستہ ہے اس دامِ گاہ کا بزمِ قہقہ۔ بزمِ شراب۔ صیدِ زوامِ جستہ۔ وہ شکار جو جال میں پھنس کر نکل گیا ہو مطلب یہ ہے کہ بزمِ نوشی سے عیش و عشرت کی تمنا کتنی ایک ایسا شکار ہے جس پر قبضہ نہیں رہ سکتا عیش و عشرت کو دُنیا میں ثبات حاصل نہیں ہے۔ نازک خیالی اس شعر میں یہ ہے کہ شرابخواری سے تھوڑی دیر کے لئے جو رنگ چہرے پر آ جاتا ہے وہ نشہ اُتر جانے کے بعد قائم نہیں رہتا۔

رحمت اگر قبول کرے کیا بعید ہے شرمندگی سے عذر نہ کرنا گناہ کا فرماتے ہیں گناہ کا عذر کرنا ایک آسان بات ہے مگر ہم عذر گناہ بہ تر از گناہ جانتے ہیں اس لئے عذر گناہ بھی نہیں کر سکتے مگر ہماری مذمت اور شرمندگی اس درجہ کو پہنچ گئی ہے کہ اگر رحمت اس کو عذر گناہ کی جگہ قبول کرے تو کیا بعید ہے۔

مقتل کو کس نیش طے جاتا ہوں میں کہ ہے رُگل خیالِ زخم سے دامنِ نگاہ کا فرماتے ہیں۔ شوقِ شہادت میں قتل گاہ کو اس خوشی کے ساتھ جاتا ہوں کہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ لہا سہرا بندھے ہوئے چلا جاتا ہے۔ میں نے گریا خیالی زخموں سے ٹھکاکے دامن کو بھر لیا ہے۔

جاں در ہوائے یک نگہ کرم ہے اسدِ پروانہ ہے وکیل ترے داد خواہ کا فرماتے ہیں۔ اسد تیری نگاہِ لطف کے شوق و آرزو میں اپنی جان دینی چاہتا ہے اور پروانہ کو اپنا وکیل بنا کر تیری بزم میں داد چاہنے آیا ہے۔ جان دینے کا تماشہ پروانہ شمع پر جل کر تجھ کو دکھا دے گا۔ اسی طرح تو ایک ٹھکاکہ کرم سے اس کی یعنی اسد کی جان لے لے۔

## غزل

جور سے باز آئے پر باز آئیں کیا کہتے ہیں ہم تجھ کو منہ دکھلا میں کیا  
 فرماتے ہیں۔ وہ جور سے باز آگئے ہیں مگر ایسے ظالم ہیں کہ جور سے کیا باز آئیں گے یعنی  
 ہرگز ہرگز ستم نہ چھوڑیں گے اس لئے کہ جور سے باز آکر یہ فرماتے ہیں کہ اب ہم شرمندگی  
 ستم کی وجہ سے تجھ کو منہ نہیں دکھا سکتے۔ عاشق سے چھپنا اس کے سامنے نہ آنا بھی  
 ایک طرح کا ظلم و ستم ہے۔

رات دن گردش میں ہیں آسمان ہورے گا کچھ نہ کچھ گھبرا میں کیا  
 اس شعر میں شانِ توکل دکھا کر فرماتے ہیں کہ سات آسمان دن رات ہمارے کاموں  
 میں مصروف رہتے ہیں۔ ہمارے لئے جو کچھ حکم الہی ہے اس کے سامان خود بخود دھتیا  
 جو جائیں گے ہم کیوں گھبرائیں اور پریشان ہوں۔

لاگ ہو تو اُس کو ہم سمجھیں لگاؤ جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا  
 لاگ۔ دشمنی۔ اور لگاؤ۔ محبت۔ یہ مضمون عجب نہیں کہ کسی اور نے بھی باندھا ہو مگر ہم نے  
 آج تک نہیں دیکھا۔ اگر باندھا بھی ہو گا تو اس خوبی اور لطافت سے ہرگز نہ بندھا  
 ہو گا۔ مطلب یہ ہے کہ معشوق کو نہ ہمارے ساتھ دشمنی ہے نہ دوستی اگر دشمنی بھی  
 ہوتی تو اس لئے کہ اس میں بھی ایک نوع کا تعلق ہوتا ہے ہم اس کو دوستی سمجھنے لیکن  
 جب نہ دوستی ہو اور نہ دشمنی تو پھر کس بات پر دھوکا کھائیں۔ قطع نظر خیال کی عمرگی  
 اور ندرت کے لاگ اور لگاؤ ایسے دو لفظ ہم پہنچائے ہیں جن کا مادہ متحد اور معنی  
 متضاد ہیں اور یہ ایک عجیب اتفاق ہے جس نے خیال کی خوبی کو دو چہ نہ کر دیا ہے  
 (از یادگار غائب)

ہوئے کیوں نامہ بر کے ساتھ ساتھ یارب اپنے خط کو ہم پہنچائیں کیا  
 خط کا جواب حاصل کرنے کا شوق اس قدر بڑھا ہوا ہے کہ نامہ بر کے ساتھ ساتھ چلے

جلتے ہیں اور اس شوق میں ایسے محو ہیں کہ یہ بھی یاد نہیں رہا کیوں تاہم ہر کے ساتھ ہونے ہیں۔ دوسرے مصرعہ میں تعجب سے ارشاد ہوتا ہے یا رب اپنے خط کو ہم خود کیا پہنچائیں یہ تو ایک خرمناک بات ہے۔ اس بیان میں جو لطف ہے وہ محتاج شرح نہیں۔ موجِ خوں سرے گزری کیوں نہ جائے آستانِ یار سے اٹھ جائیں کیا موجِ خوں سے یہاں ایذا و تکلیف مراد ہے۔ فرماتے ہیں۔ ہمیں خواہ کتنی ہی تکلیف کیوں نہ پہنچے مگر اب آستانِ یار پر آجے ہیں اور ڈھکی دے دی ہے تو یہاں سے اٹھ کر کیا جائیں گے اب تو مر ہی گئے اٹھیں گے۔

عمر بھر دیکھا کئے مرنے کی راہ مر گئے پر دیکھئے دکھلائیں کیا دکھلائیں کیا مرجعِ خدا کو ٹھہرایا ہے۔ فرماتے ہیں کہ عمر بھر موت کا منتظر رہا کہ وہ حالتِ زندگی سے ضرور بستر ہوگی اب دیکھئے مرنے کے بعد کیا حالت دکھاتے ہیں جس کا تمام عمر منتظر رکھا ہے (از یاد گار غائب)

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلا میں کیا اس مقطع میں دو معنی پیدا ہوتے ہیں اور دونوں لطف سے خالی نہیں۔ ایک معنی یہ ہیں کہ وہ دریافت کرتے ہیں غالب کون شخص ہے اور کیسا آدمی ہے۔ مشورہ طلب یہ بات ہے کیا ہم صاف صاف یہ کہہ دیں کہ وہ تمہارا عاشق اور دلدادہ ہے۔ اس میں کچھ قیامت تو نہ ہوگی۔ دوسرے معنی یہ پیدا ہوتے ہیں کہ وہ غالب کو اچھی طرح جانتے پہچانتے ہیں اور پھر پوچھتے ہیں معنی تجاہلِ عارفانہ کرتے ہیں۔ اب ہم کو کوئی صلاح بتائے کہ ہم اس کا جواب اُن کو کیا دیں۔

### غزل

لطافت کے کثافتِ جلوہ پیدا کر نہیں سکتی چمن زنگار ہے آئینہ بادِ بہاری کا فرماتے ہیں لطافت میں جب تک کثافت شامل نہ ہو جائے جلوہ ثنائی کی قابلیت پیدا

نہیں کر سکتی۔ مصرعہ ثانی اس بات کا تخیلی ثبوت ہے۔ یعنی بادِ بہاری کا جلوہ چمن کے ذریعہ سے نمود ہوا کرتا ہے، گویا چمن اپنی سبزی کے اعتبار سے آئینہ بادِ بہاری کا زنگار ہوا کرتا ہے۔ مطلب یہ ہے کثافتِ زنگارِ چمن لطافتِ جلوہ بادِ بہاری کے باعث ہے۔

حریفِ جوشِ دیارِ نہیں خمِ داریِ ساحل جہاں ساقی ہو تو دعویٰ ہے باطل ہوشیاری کا  
یعنی ساحل لاکھ اپنے کو بچائے مگر جب دریا طغیانی پر آتا ہے تو ساحل محفوظ نہیں رہ سکتا۔ اسی طرح جہاں تو ساقی ہو وہاں ہوشیاری کا دعویٰ جیل نہیں سکتا۔ یہ شعر حقیقت و مجاز دونوں پر محمول ہو سکتا ہے (از یادگار غالب)

### غزل

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں ننا ہو جانا درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا  
یعنی جب دردِ حد سے گزر جائے گا تو مرجائیں گے یعنی ننا ہو جائیں گے۔ گویا قطرہ دریا میں کھپ جائے گا اور یہی اس کا مقصود ہے پس درد کا حد سے گزر جانا بھی اس کا دوا ہو جانا ہے۔ (از یادگار غالب)۔

تجھ سے قسمت میں مری صورتِ قفلِ ابجد تھا لکھا بات کے بنتے ہی جدا ہو جانا  
فرماتے ہیں میرا توشہ قسمت قفلِ ابجد کی طرح واقع ہوا تھا قفلِ ابجد اس کو کہتے ہیں جس کے حلقوں پر حروفِ ابجد کندہ ہوتے ہیں۔ قفل کا بننے والا حروفِ مفرد سے ایک فقرہ ترتیب دے لیتا ہے۔ کھولتے وقت جب وہ فقرہ مرتب ہو جاتا ہے تو قفل کھل جاتا کرتا ہے۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ میرا توشہ قسمت یہی تھا کہ جب تجھ سے ربطِ دلی پیدا ہو جائے تو جدائی حاصل ہو۔

دل ہوا کشمکش چارہ رحمت میں تمام مٹ گیا گیسے میں اس عقدہ کا دوا ہو جانا  
فرماتے ہیں۔ دل کی تکلیف رفع کرنے کے واسطے اس قدر تدبیروں کی کشمکش ہوئی کہ دل

کا کام تمام ہو گیا۔ دوسرے مصرعہ میں اس کی مثال پیش کرتے ہیں۔ یعنی مسطرع جھٹکتے  
نہ گرا رہتی ہے نہ ڈوبا باقی رہتا ہے۔ میرے دل کو اس کے علاج نے تمام کر دیا۔

اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ اس قدر دشمن ارباب وفا ہو جانا  
اس شکر کا لطف و ودائی ہے۔ بیانی میں نہیں آ سکتا۔ فرماتے ہیں۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ ہر  
طرح طرح کے لطف اور قسم قسم کی عنایتیں ہوتی تھیں۔ اب ایک یہ وقت ہے کہ ہم پر  
جفا بھی نہیں کرتے۔ بیزاری۔ کھٹکی۔ نفرت اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ ہم کو زنا بھی لگاؤ نظر  
ہے۔ اللہ اللہ اس ندر ارباب وفا کا دشمن ہو جانا۔

ضعف سے گریہ مبتدل بدیم سرد ہوا باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا  
مسئلہ استحالات عناصر کے اب تک ہم قائل نہ تھے مگر یہ دیکھ لیا کہ ضعف اور ناتوانی  
کی وجہ سے ہمارا گریہ دم سرد سے بدل گیا تو استحالی کے بعد ہم کو یقین ہو گیا کہ پانی  
ٹھنڈی ہوا سے بدل جایا کرتا ہے۔

دل سے مٹنا تری گشتِ حنائی کا خیال ہو گیا گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا  
فرماتے ہیں۔ بھلا کیوں گشت سے ناخن بھی جدا ہوا کرتا ہے ہم اپنے دل سے تیری  
فندق جدا انگلیوں کا خیال کیونکر مٹا سکتے ہیں مٹ ہی نہیں سکتا یعنی امرنا کھیں ارفع ہے۔  
ہے مجھے ابر بہاری کا برس کر کھلنا روتے روتے غمِ فرقت میں فنا ہو جانا  
یعنی غمِ فرقت میں روتے روتے تمام ہو جانا میرے نزدیک ایک ایسی معمولی بات ہے  
جیسے ابر بہاری کا برس کر کھلنا۔ یہ بالکل فرالی تشبیہ ہے۔ (از یادگارِ غائب)

گر نہیں بھمت گل کو ترے کوچہ کی ہوں کیوں ہے گردِ رہِ جولاں صبا ہو جانا  
فرماتے ہیں اگر پھولوں کی خوشبو کو تیرے کوچہ میں پہنچنے کی ہوس و آرزو نہیں ہے تو کس لئے  
یہ بادِ صبا کے ساتھ ساتھ جگر کا شئی بھرتی ہے۔

تا کہ تجھ پر کھلے اعجاز ہوائے صیف گل دیکھ برسات میں سبز آئینہ کا ہو جانا

آئینہ فولادی پر برسات کی ہوا سے رنگ آجاتا ہے۔ مرزا صاحب مثال کے طور پر فرماتے ہیں کہ صرف بارغ اور صحرا ہی میں موسم بہار کا اثر ظاہر نہیں ہوتا بلکہ آئینہ فولاد تک اس سے متاثر ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ موسم بہار کی ہوا سے فرصت و انبساط حاصل کرنی چاہئے۔

بخشنے ہے جلوہ گل ذوق تماشا غائب چشم کو چاہئے ہر رنگ میں وا ہو جانا فرماتے ہیں اے غائب بارغ میں رنگ رنگ کے پھولوں کو کھلا ہوا دیکھ کر یہ شوق پیدا ہوتا ہے کہ چشم حقیقت میں کو ہر رنگ میں وا ہو جانا چاہئے۔ یعنی ہر طرح کے سیر و تماشے سے اچھا بُرا نتیجہ اخذ کرنا چاہئے۔

## ردیف بائے موحده

### غزل

پھر ہوا وقت کہ ہوا بال کشامیج شراب سے بڑے کو دل دست شناسامیج شراب فرماتے ہیں وہ وقت آگیا ہے کہ موج شراب اڑنے کے لئے اپنے بازو کھولے اور بڑے کو تیراکی کا شوق رکھنے والا دل موج شراب عطا کرے ایران میں قاعدہ ہے کہ جب انگور پک جاتا ہے تو سنگ مرمر کے حوضوں میں بھر دیا جاتا ہے۔ آفتاب کی تیزی سے درچار دن کے بعد اس کا عرق نکھنا شروع ہو جاتا ہے۔ اس وقت نو عمر لڑکے ان حوضوں میں اُتر کر پاؤں سے روندتے ہیں۔ اس کے بعد مٹی کی مُنہ بند صراحیوں اس میں ڈال دی جاتی ہیں۔ بڑے اس صراحی کو کھتے ہیں۔ سامات کے ذریعہ سے عرق انگور ختم کر صراحیوں میں بھر جاتا ہے۔ شراب اب خاص اس شراب کو کہتے ہیں۔ مطلب شعر کا یہ ہے کہ پھر بہار آگئی ہے اور شراب کی خوشبو ہوا پر پھراڑنے لگی ہے پھر صراحیوں بظوں کی طرح سے حوضوں میں تیرتی پھرتی ہیں۔

پوچھتے ہیں کہ یہ سستی اربابِ چمن سایہِ تاک میں ہوتی ہے ہوا موجِ شراب اربابِ چمن۔ درختانِ چمن فرماتے ہیں۔ تاک کے سایہ میں ہوا اس قدر نشاط اٹھنے لگی ہے گویا موجِ شراب بن گئی ہے۔ درختوں کا جھومنا ہوا کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ یہ سستی نشہ کی وجہ سے فنییاں جھوم رہی ہیں۔

جو ہوا غرقہ سے بخت رسا رکھتا ہے سر سے گزرے پر بھی ہے بالِ ہما موجِ شراب فرماتے ہیں۔ اعتدال سے شراب پینے والوں کا ذکر نہیں ہے وہ تو تعریف سے مستثنیٰ ہیں۔ وہ لوگ جو شراب بے انتہا پیتے ہیں اور دماغ ان کا شربتِ نثار سے معطل ہو جاتا ہے اس صورت میں بھی ان کو بادشاہی کا وجہ محال ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ شراب کا نشہ پیش کر دینے کے بعد بھی بالِ ہما کا حکم رکھتا ہے۔ مشور ہے کہ جس شخص کے سر پر ہما کا سایہ پڑ جاتا ہے وہ بادشاہ ہو جاتا ہے۔

یہ برسات وہ موسم کہ عجب کیا ہے اگر موجِ ہستی کو کرے فیض ہوا موجِ شراب فرماتے ہیں کہ برسات کے زمانہ میں آفتادہ زمینوں پر بھی سبزہ پیدا ہو جایا کرتا ہے کیا عجب ہے کہ بادِ ہماری موجِ ہستی کو موجِ شراب بنادے۔ مطلب یہ ہے بہار کا موسم طبعیوں میں جوش و ولولہ پیدا کر دیتا ہے۔

چار موجِ اُٹھتی ہیں طوفانِ طرے ہر سو

فرماتے ہیں۔ جوشِ طرب ایک دریائے طوفانِ خیز ہے جس میں یہ چار موجیں یعنی موجِ گل، موجِ شفق، موجِ صبا، موجِ شراب بلند ہوا کرتی ہیں۔

جس قدر روح بناتی ہے جگر تشہِ ناز وے ہے تسکینِ بزمِ آب بقا موجِ شراب فرماتے ہیں۔ بارش سے درختوں میں جس طرح قوتِ نو پیدا ہو جاتی ہے اسی طرح موجِ شراب سے شرابخواروں کے دلوں میں اُتک اور جوش پیدا ہو جایا کرتا ہے یعنی شراب ایک قیَم کی قوتِ نامیہ ہے جو انسان کے دل میں نشہ و حما کے ساتھ فخر و ناز کا مادہ پیدا کر دیتی



بسکہ روٹے ہے گرناک میں خوں ہو بوکر خیمہ رنگ سے ہے بال کشا موج شراب  
 فرماتے ہیں۔ انگور کی بیلوں میں مادہ شراب اسی طرح دوڑ رہا ہے جس طرح رگوں میں  
 خون تودہ کرتا ہے اور خون کے دورے سے جیسے انسان کا چہرہ گل رنگ ہو جاتا  
 ہے ویسے ہی انگور کی بیلوں میں موج شراب سے سبزی و شادابی پیدا ہو گئی ہے گویا  
 سبزی و شادابی کا پیدا ہونا پیر پر دانا ہے۔

موجہ گل سے چراغاں ہے گزرا گاہ خیال ہے تصور میں زمیں جلوہ نما موج شراب  
 فرماتے ہیں رنگ برنگ کے پھولوں نے کھل کر خیالی رستوں پر چراغاں کی بہار پیدا  
 کر دی ہے۔ اور یہ اس وجہ سے ہے کہ تصور میں موج شراب جلوہ نما ہے۔

نشہ کے پردے میں محو تماشائے دماغ بسکہ کھتی ہے سر نشو و نما موج شراب  
 فرماتے ہیں موج شراب نشہ کے پردے میں محو تماشائے دماغ ہے اور یہ اس واسطے ہے  
 کہ نشو و نما کا شوق رکھتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح خیال ترقی کرتے کرتے بہت  
 بڑھ جاتا ہے اسی طرح شراب کا نشہ دماغ میں پہنچ کر بڑھتا رہتا ہے۔

ایک عالم پہ میں طوفانی کیفیت فصل موجہ سبزہ نو خیز سے تا موج شراب  
 فرماتے ہیں۔ کیفیت فصل بہاری اور کیفیت موج شراب نے زمانہ بھر میں طوفان اٹھا رکھا  
 ہے یعنی فصل بہاری نے سبزہ و گل بے انتہا پیدا کر دیئے ہیں اور نشہ شراب نے نشاط و  
 طرب بے حد مینا کر دی ہے گویا دنیا میں ان دونوں چیزوں کا طوفان آگیا ہے۔

شرح ہنگامہ ہستی ہے زہے موبہم گل رہبر قطرہ بدریا ہے خوشا موج شراب  
 فرماتے ہیں موبہم گل کا بوش بتا رہا ہے کہ ہنگامہ ہستی کی گرم بآزاری خاص میرے ہی  
 دم سے دنیا میں قائم ہے۔ گویا میں ہنگامہ ہستی کی شرح ہوں اور اسی طرح موج شراب  
 دعویٰ کر رہی ہے کہ میں قطرہ کو دریا تک پہنچانے کے لئے خضر راہ کا حکم رکھتی ہوں۔  
 یعنی جس طرح قطرہ فنا ہو کر دریا میں جا ملتا ہے۔ اسی طرح نشہ شراب روح کو بخود

کے عالم میں اس کے مرجع تک پہنچا دیتا ہے۔

ہوش اُڑتے ہیں مئے جلوہ گل دکھیا آسہ پھر ہوا دقت کہ ہو بال کشاموج شراب  
 فرماتے ہیں ساء آسہ جلوہ گل دیکھ کر میرے ہوش اُڑنے شروع ہو گئے ہیں۔ ایسا معلوم  
 ہوتا ہے کہ بہار کے ساتھ ہی وہ دقت آنے والا ہے کہ جب موج شراب ہوا پر اُڑنے  
 لگے یعنی جگہ جگہ شراب کی بہشیاں بن جائیں۔

## ردلیف (ت)

افسوس کہ دیدن کیا رزق فلک نے جن لوگوں کی تھی درخور عقدِ گہ انگشت  
 غزل  
 دیدن جمع دودیا کسر بمعنی کرم۔ فرماتے ہیں جن لوگوں کی آنکھیاں موتیوں کے چھتوں کے  
 قابل تھیں اُن کو آسمان نے مرنے کے بعد دیدن کا رزق بنا دیا ہے۔ یعنی افسوس ہے  
 چھوٹے چھوٹے کپڑے اُن نازک نازک آنکھوں کو قبر میں نوش فرما رہے ہیں جو موتیوں کے  
 چھتوں میں رستی تھیں۔

کافی ہے نشانی تری چھلے کا نہ دینا خالی مجھے دکھلا کے بوقتِ سفر انگشت  
 قاعدہ ہے کہ بوقتِ سفر یاد تازہ رکھنے کے لئے نشانی کے طور پر اکثر چھلے دیا جاتا ہے۔  
 مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ اس نے مجھ کو بوقتِ سفر چھلانے کے لئے بجائے چھلے کے خالی  
 انگلی دکھا دی اور یہ بات میرے لئے چھلے کے داغ سے زیادہ ہو گئی۔ میں یہ نشانی اس کی  
 یاد رکھوں گا کہ اُس نے مجھے نشانی کا چھلہ بھی نہ دیا۔

لکھتا ہوں آسہ سوزِ دل سے سخن گرم تار کھ نہ سکے کوئی برسِ حزن پر انگشت  
 سخن گرم باشعارِ نغمہ۔ فرماتے ہیں ساء آسہ میں ایسے لطیف اور پاکیزہ اشعار لکھتا ہوں کہ  
 میرے کلام میں مخالف عیب نکال ہی نہیں سکتے۔ حزن پر انگلی رکھنی عیب جوئی کرنے کو

## غزل

رہاگر کوئی تا قیامت سلامت پھر اک روز مرنا ہے حضرت سلامت  
مرتا ہے۔ یعنی موت لازمی اور ناگزیر ہے۔ فرماتے ہیں۔ اگر کوئی شخص قیامت تک بھی  
زندہ رہا تو پھر کیا۔ مرنا لازمی ہے۔ قیامت کے دن مرے گا۔ قیامت کے دن  
مرنے میں یہ لطف پیدا ہو گیا ہے کہ روز قیامت زندہ ہونے کا دن ہے۔ اس  
دن کسی شخص کا مرنا لطف سے خالی نہ ہوگا۔

جگر کو مرے عشقِ خونابہ مشرب لکھے ہے خداوندِ نعمت سلامت  
عشقِ خونابہ مشرب یعنی عشق کے مذہب میں خون کھانا جائز ہو۔ فرماتے ہیں۔ عشق  
کی خوراک خون ہے۔ میرے جگر کا خون پی کر عشق نے پرورش پائی ہے۔ اسی سے  
میرے جگر کو خونابہ مشرب خداوندِ نعمت تحریر کرتا ہے۔

علیٰ الرغمِ دشمنِ شہیدِ وفا ہوں مبارک مبارک سلامت سلامت  
فرماتے ہیں۔ برخلاف دشمنِ شہیدِ وفا ہوں۔ مبارک ہو اور شہیدِ وفا ہوں۔ یعنی  
شہادت پانے سے زندہ جاوید ہو گیا ہوں اس لئے سلامت رہوں گا۔

نہیں اگر سروِ برگِ ادراکِ معنی تماشا ہے نیزنگ صورتِ سلامت  
فرماتے ہیں۔ اگر مشاہدہ ذاتِ باری تعالیٰ نہ ہوا اور کتبہ ذاتِ کلا ادراکِ حاصل نہ  
ہو سکا نہ سہی۔ وجودِ اشیا کی رنگ برنگ صورتیں دیکھ کر اللہ تعالیٰ کے ہونے کا کامل  
یقین تو حاصل ہو گیا۔ ہمارا یہ یقین ہی سلامت رہے کہ اس دنیا کا پیدا کرنے والا

کوئی ہے کھولتے ہی کھولتے آنکھیں بیا رلائے مری بالیں پہ اُسے پر کس وقت  
مُندھ گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں بیا رلائے مری بالیں پہ اُسے پر کس وقت  
فرماتے ہیں۔ میرے احباب میری بالیں پر اس کو اس وقت لائے کہ جب میں نزع کی  
کشمکش میں مبتلا تھا۔ جس طرح چراغِ ٹٹھا کر گل ہو جاتا ہے اسی طرح آنکھیں کھولتے ہی

کھوتے ہمیشہ کے لئے بند ہو گئیں۔ مطلب یہ ہے کہ یاروں نے بے وقت کو خوش کی اور دوست نے بے موقع غنایت فرمائی۔

### غزل

آہِ خط سے ہوا ہے سرد جو بازارِ دوست    دودِ شمع کشتہ تھا شاید خطِ رسا دوست  
فرماتے ہیں۔ رسا دل پر ہنوا آغاز ہو جانے سے گزئی حسن کی سردِ بازارِ ہو گئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ خطِ رسا دوست کبھی ہوئی شمع کا ڈھواں تھا جس کے پیدا ہوتے ہی شمع کے بازار میں اندھیرا چھا گیا اور سارے خریدار چنیت ہو گئے۔

اے دلِ ناعاقبت! نیشِ ضبطِ شوق کر    کون لا سکتا ہے تابِ جلوہ دیدارِ دوست  
فرماتے ہیں۔ اے انجام کار نہ سوچنے والے دل اپنے شوق دیدار کو ضبط کرنے کی کتا تھ کو یاد نہیں ہے کہ طور پر حضرت مولائی کا قداسی دیدار کی جھلک دیکھ کر کیا حال ہو گیا تھا۔ جلوہ دیدارِ دوست کی تاب کون لا سکتا ہے۔

خانہِ ویراں سازیِ حیرت تماشا کیجئے    صورتِ نقشِ قدم ہوں رفتہ رفتہ رسا دوست  
فرماتے ہیں۔ حیرت کی خانہ ویرانی کو ملاحظہ کیجئے۔ یعنی ہم حیرت میں مبتلا ہو کر اپنے گھر کو بھول گئے ہیں اور وہ گھر بغیر ہمارے ویران ہو گیا ہے۔ ہم نے دوست کی رفتار کا تماشا لکھ لیا تھا اس کا اثر یہ ہوا کہ نقشِ قدم کی طرح بخود و مدد ہوش ہو کر زمین پر گر پڑے ہیں اور یقین ہے تھوڑی دیر میں مٹ جائیں گے۔

عشق میں بیدارِ تنگِ غیر نے مارا تجھے    کشتہ از دشمن ہوں آخر گر جہ تھا بیمارِ دوست  
فرماتے ہیں۔ میں دوست پر مبتلا ہو کر مدت سے عشق کے آزار کا بیمار تھا۔ بیمارِ دوست پہلے ہی سے تھا۔ اب رنجِ دشمنی کے ظلم نے رہا سہا بھی ہلاک کر دیا پہلے میں بیمارِ دوست تھا اب کشتہ از دشمن ہی گیا۔ افسوس کہ میرا انجام اچھا نہ ہوا۔

چشمِ مارِ دشمن کہ اس بیدار کا دل شاد ہے    دیدہ پر خونِ ہمارا ساغرِ سرشارِ دوست

فرماتے ہیں۔ باوجودیکہ ہم عشق میں خون کے آنسو رو رہے ہیں مگر صحت اس وجہ سے کہ اس بیدرد کا دل ہمیں خون کے آنسو سے روتا دیکھ کر شاد ہے۔ اس لئے ہم بھی کہتے ہیں چشم مار دشمن۔ یعنی ہم بھی اپنے دیدہ پُر خون سے خوش ہیں۔ اس واسطے کہ ہمارا دیدہ پُر خون ساغر شرارِ دوست بن گیا ہے۔ مطلب یہ ہے جس طرح شراب پی کر سوہا حاصل ہوتا ہے اسی طرح اس بیدرد کا دل ہم کو خون کے آنسو روتا ہوا دیکھ کر مسرور ہوتا ہے اور اس کے خوش ہونے سے ہم بھی شاد ہیں۔

قطعہ

غیر کبوں کرتا ہے میری پریشانی کے ہجر میں جے کھلت دوست ہو جیسے کوئی غمخوار دوست  
اس قطعہ میں کس خوبی کے ساتھ مرزا صاحب نے دشمن کے منافقانہ برتاؤ کی تصویر کھینچی ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی بتایا ہے کہ دشمن کا اظہارِ اتفاقات اس کی اپنی خبیثی پر مبنی ہونے کے علاوہ کمال و فخرِ ایش بلکہ آتشِ رشک کا بخڑا کانے والا ہے۔

تاکر میں جانوں کہ ہے اسکی رسائی دلِ تاکر مجھ کو دیتا ہے پیامِ وعدہ دیدار دوست  
فرماتے ہیں۔ مذکورہ بالا اتفاقات اس غرض سے بھی ہے کہ میں یہ بات کہوں کہ اسکی رسائی ان تک ہے اس لئے مجھ کو پیامِ وعدہ دیدار دوست کا فریب بھی دیتا ہے۔

جبکہ میں کرتا ہوں اپنا شکوہ ضعفِ دماغ سر کرے ہے وہ حدیثِ زلفِ عنبر بار دوست  
فرماتے ہیں۔ اس کی ڈسگلیں سن کر جو میں اپنے ضعفِ دماغ کی شکایت کرتا ہوں یعنی یہ کہتا ہوں کہ تیری فضول بکواس سے میرا سر پھرا جاتا ہے تو وہ مکار زلفِ عنبر بار دوست کی تعریف شروع کر دیتا ہے اس سے اس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ خوشبو زلفِ بار دماغ کی کمزوری کا علاج ہے پھر تم کون میرے ساتھ باتیں کرنے سے ضعفِ دماغ کی شکایت کرتے ہو۔

چپکے چپکے کورفتے دیکھ پاتا ہے اگر ہنس کے کرتا ہے بیانِ شوخی گفتار دوست

فرماتے ہیں۔ میرے چپکے چپکے رونے کا علاج شوخی گفتار دوست کا بیان سمجھ کر املی  
یعنی دوست کی باتوں کی تفریب شروع کر دیتا ہے۔

مہربانی ہائے دشمن کی شکایت کیجئے یا بیاں سمجھے سپاس لذت آزار دوست  
آپ فرماتے ہیں کہ دشمن کی ختم آمیز مہربانیوں کی شکایت کی: اے انا ظلم دوست کی  
شکر گزاری بیان ہو۔

یہ غزل اپنی سمجھ جی سے پسند آئی ہے آپ ہے روین خمر میں غائب ز بس تکرار دوست  
فرماتے ہیں۔ اے غائب یہ غزل اپنی سمجھ کو دلاتے ہے نہ اس واسطے کہ اس کی روین  
میں لفظ در در بار بار آیا ہے جو لفظ ختم خمر یہ قافیوں کے بعد بار بار آتا ہے اس کو  
روین کہتے ہیں۔

## ردیف جیم

غزل

گلشن میں بند دست بزم گم ہے کج قمری کا طوق حلقہ بیرون ہے آج  
حلقہ بیرون در سے در بازہ کی محراب مراد ہے مرزا صاحب فرماتے ہیں۔ گلشن  
میں ہمارا گئی ہے اس لئے دورا بند دست کیا گیا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ حلقہ  
بیرون در یعنی محراب در قمری کا طوق بن گئی ہے کج جو شخص چمن کی سیر کو باغ چن  
آئے گا وہ قمری کی طرح گزرتا چمن ہو جائے گا۔ قاعدہ ہے ہمارے موسم میں جوش  
جنوں ہوا کرتا ہے۔ آج کل باغ کی ہوا اور میر چمن جنوں شیر ہے۔

آتا ہے ایک پارہ دل ہر فغان کے ساتھ تارِ تنص کند شکار اثر سے آج  
فرماتے ہیں۔ آج میری ہر آہ کے ساتھ ایک میرے دل کا کھڑا باہر آتا ہے۔ تنص  
کی کند نے اثر کو شکار کر لیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آج میری آہ میں اشیاء پیدا ہو گئی ہے

اور اس کا اثر خود میرے دل پر ہو رہا ہے اس لئے مجھ کو اپنی آہوں سے کامیابی کی امید پیدا ہو گئی ہے۔

اے عاقبت کنارہ کراے انتظامِ حلِ سیلاب گریہ درپے دیوار و در ہے آج فرماتے ہیں۔ اے عاقبت یعنی آرام و راحت سے زندگی بسر کرنے کے زمانے میرے پاس سے دور ہو جا اور اس انتظام تو بھی اس گھر سے رُو پا کر ہو۔ میرا سیلاب گریہ یعنی میرے اٹھکوں کا طوفان اب میرے گھر کو گرائے والاب۔ تن سے بد میری زندگی کے دن مصائب و کالیف میں گزر رہے۔ تم دونوں میرے ساتھ کیوں ایذاستے ہو۔

لو ہم مریضِ عشق کے تیمار دار ہیں اچھا اگر نہ ہو تو مسیحی کا کیا علاج فرماتے ہیں۔ معشوق مریضِ عشق پر یہ الزام لگاتا ہے کہ تیرا کوئی تیمار دار نہیں ہے جو وقت پر دوا پلائے اور پر زرقِ غذائیں کھلائے۔ بے تدبیری اور بد پر زرق سے مرعہ بڑھتا جا رہا ہے۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ ہم مریضِ عشق کے تیمار دار بننے ہیں اور اس کی دوا وغیرہ کی گمرانی ہمارے ذمہ ہے۔ لیکن پہلے یہ بات طے ہو جانی چاہئے کہ مریضِ عشق اگر اچھا نہ ہو یعنی دوائے وصل سے بھی اس کا مرضِ عشق زائل نہ ہو تو مسیحا یعنی معشوق کی کیا سزا تجویز کی جائے۔ مرزا صاحب کا دعویٰ یہ ہے کہ مریضِ عشق کسی طرح صحت یاب ہو ہی نہیں سکتا۔

## ردیفِ جیم فارسی

غزل

نفس نہ انجمنِ آرزو سے باہر کھینچ اگر شراب نہیں انتظارِ ساغر کھینچ فرماتے ہیں۔ انسان کو امید اور آرزو اتنا رہانی کی حالت میں بھی ترک نہ کرنی چاہئے۔ اگر شراب نہیں ہے تو بھی ساغر کا انتظار کھینچنا چاہئے۔ مطلب یہ ہے کہ انسانی کی زندگی

حالت میں نہ چھوڑنی چاہئے۔ انتظار کھینچنا اور شراب کھینچنی دو محاورے ہیں۔  
 کمال گزنی سخی تلاش دید نہ پوچھہ برگاہ خار مرے آئینے سے جوہر کھینچ  
 فرماتے ہیں۔ میرے آئینہ کمال کی گزری دسی کا حال مجھ سے نہ پوچھو۔ اہل نظر کی تلاش  
 اور جستجو میں اتنی صورتیں اور تکلیفیں میں نے اٹھائی ہیں کہ اب میرے آئینہ کمال کا  
 جوہر میری آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹک رہا ہے۔ قدم دان کا لہکے نہ لے۔  
 یاروں ہو کر مروت یہ پابتا ہوں کہ کوئی شخص ابرائیم کو نہ بلے جو جوہر کمال کو یہ  
 آئینے کمال سے کانٹے کی طرح کھینچ لے۔

تجھ بہا بد را حسیہ انتظار است دل کیا ہے کس نے اشارہ کہ ناز و کھینچ  
 فرات تو۔۔۔ تر پہ یہ ٹیپے۔۔۔ رقی کا انتظار کھینچنا یا نیند کا انتظار کھینچنا  
 ہوئی را۔۔۔ ہے۔ وعدہ یا رکاوٹ اشارہ نہیں ہے کہ عاشق پانچ پیر یا  
 ہوا بستر کے ناز اٹھا لے۔ اگر معشوق وعدہ پہ نہ آئے اب تو نہ کٹ کی وجہ  
 دریافت کرنے میں کوشش کی جائے۔ بلکہ ناامیدی کی صورت میں باورِ گہرا  
 صحرانوردی، باسروں، اندکشم بہت سے کام ایسے ہیں کہ جنہیں ضرورت ہو تو  
 عاشق وقت گزار کر کتاب۔ اور اگر مروت نیند کے انتظار میں آدمی پڑا کر وہیں  
 بدل رہا ہے تو اس کے لئے بھی بہت سے شغل ممکن ہوتے ہیں، مطلب یہ ہے ہر قسم  
 کے آدمی کے واسطے راحت طلب، منور، سنجیدہ جاتی ہے۔

تری طرف سے بہ حسرت انتظارِ زکس بجوری دل و چشم رقیب سلغ کھینچ  
 فرماتے ہیں۔ زکس نہنگ کی باندھے ہوئے بہ نگاہ حسرت تیرا نگہ کھٹک رہا ہے اور یہ  
 سلغ تجھ کو کسی کا دیکھنا انتظارِ رقابت ہے۔ لیکن یہ میری رقیب یعنی زکس  
 کی بھی اندھی ہے اور آنکھوں کی بھی اندھی ہے۔ اس خوشی کے موقع پر تجھ کو شراب  
 پینی چاہئے۔



یہ نیم غمزہ ادا کر حق و دلیعت ناز نیام پر درہ زخم جگر سے خنجر کھینچ  
 فرماتے ہیں۔ ادا کر ناز جو خنجر کو اللہ تعالیٰ نے بنائے ہیں وہ گویا اس کی امانت ہے۔  
 اس امانت کا حق نیم غمزہ سے ادا کر رہا اگر پورا غمزہ ہو جائے گا تو فوراً عاشق کی جلا  
 نکل جائے گی۔ اس لئے خنجر کو لازم ہے کہ نیم غمزہ سے کام لے اور اس کی مثال ایسی ہے  
 کہ اگر زخم جگر میں وار کرنے کے بعد خنجر چھوڑ دیا جائے گا تو بسمل فوراً جان بحق ہو جائیگا  
 اور اگر وار کرنے کے بعد خنجر زخم میں سے کھینچ لیا جائے گا تو مجروح کے منہ میں ضرور  
 دیر لگے گی اور شاید جانبر بھی ہو جائے۔ اس لئے نیم غمزہ سے کام لینا بہتر ہے۔ دوسری  
 صنعت الفاظ اس شعر میں یہ بھی رکھی گئی ہے کہ نیام کا الف نکال ڈالنے کے بعد نیم  
 رہ جاتا ہے۔ اور نیم غمزہ ہی سے کام لینے کو عاشق کو کتنا بھی ہے۔

میرے قہق میں ہے صہبائے آتش نہاں بروئے سفرہ کباب دلِ سمندر کھینچ  
 فرماتے ہیں۔ میرے پیالہ میں صہبائے آتش چھپی ہوئی ہے جس میں آتش سیال تھے  
 زیادہ گرمی ہے۔ اس کی مناسبت سے کباب بھی دلِ سمندر کا ہونا چاہئے (سمندر  
 ایک جانور ہوتا ہے جو آتشکدہ میں پیدا ہوتا ہے اور آگ سے باہر آکر فوراً مرجاتا  
 ہے) کہتے ہیں سمندر کے سینے میں سے کبابِ دلِ سمندر کھینچ۔

## ردیف دال

### غزل

مُسنِ غم نے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد بارے آرام سے ہیں اہلِ جفا میرے بعد  
 فرماتے ہیں۔ مُسن کو ناز و انداز کی کشاکش سے میرے مرجانے کے بعد رہائی ہو گئی۔ بارے  
 اہلِ جفا و اہلِ ستم۔ یعنی تمام معشوق آرام سے ہو گئے جب تک میں زندہ تھا تو ہر حسین  
 مجھ کو اپنا فریضہ بنانے کے واسطے اظہارِ غمزہ و ناز میں پھنسا رہتا تھا۔

منصب شیفنگی کے کوئی قابل نہ رہا۔ ہوئی معزولی انداز وادامیرے بعد  
فرماتے ہیں۔ اب کوئی آدمی منصب عشق کے قابل نہ رہا۔ یہ عہدہ خالی ہو گیا اور اسی کے  
ساتھ ناز وادائے مشوقان بیکار و معطل ہو گئے۔

شمع کبھتی ہے تو اُسمیں دُھواں اُٹھتا ہے شعلہ عشق سیر پوش ہوا میرے بعد  
فرماتے ہیں۔ شمع کے بجھنے وقت جو شعلہ آتش دُھواں بن کر ظاہر ہوتا ہے وہ حقیقت  
دُھواں نہیں ہوتا بلکہ شمع گشتہ کے سوگ یں شعلہ سیر پوش ہو جاتا ہے۔ اسی طرح عشق کا  
شعلہ سیر مرجانے کے بعد غم میں سیر پوش ہو گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میں سوز و گداز  
عشق کا مرتبہ رکھتا تھا۔

خون کا دل خاک میں حوالِ تباں پر یعنی اُن کے ناخن ہوئے محتاجِ خمائیے بعد  
فرماتے ہیں۔ خاک قبر میں ہمارا دل خون ہو گیا ہے اس غم میں کہ مشوقوں کے ناخن ہمارے  
مرجانے کے بعد خاک کے محتاج ہو گئے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ عام حسین ہمارے خون کی ہندی  
ہاتھوں میں لگاتے تھے اس لئے کہ حنا میں ہمارے خون کا سا خوش رنگ نہ ہو جاتا تھا۔  
ہمارے مرجانے کے بعد انہیں ہندی لگانی پڑی۔

درِ خورِ عرض نہیں جو ہر بیداد کو جا نگہِ ناز ہے سُرے سے خفا میرے بعد  
فرماتے ہیں جو ہر ظلم بیداد کے ظاہر کرنے کا موقع باقی نہ رہا۔ یعنی میں مر گیا اس لئے  
نگہِ ناز میرے بعد سُرے سے خفا رہنے لگی مطلب یہ ہے کہ مجھ سے قدر دانِ حسن کے  
مرجانے کے بعد مہینوں کو بناؤ سنگھار سے نفرت ہو گئی۔

ہے جنوں اہل جنوں کیلئے آغوشِ داغ چاک ہوتا ہے گریباں سے جد امیرے بعد  
فرماتے ہیں۔ ان دیوانوں کے گریبانوں سے جو ہمیشہ گریبانوں کو چاک رکھتے ہیں۔  
چاک گریباں جُدا ہوتا ہے۔ یعنی میرے مرجانے کے بعد چاک کسی گریباں کے  
پاس آ کے بھی نہ پچھنے لگا۔ اس لئے چاک گھل کر گریبانوں سے جُدا ہو رہا ہے

مطلب یہ ہے کہ میرے بعد کالوں سے زمانہ خالی ہو جائے گا پھر کوئی میرا سا عاشق کامل پیدا نہ ہو گا۔

کون ہوتا ہے حریفِ مردِ افکنِ عشق ہے مگر لبِ ساتی یہ صلا میرے بعد اس شعر کے ظاہری معنی یہ ہیں کہ جب سے میں مر گیا ہوں سے مردِ افکنِ عشق کا ساتی یعنی معشوق بار بار صلا دیتا ہے یعنی لوگوں کو شرابِ عشق کی طرف بلا تا ہے مطلب یہ ہے کہ میرے بعد شرابِ عشق کا کوئی خریدار نہیں رہا اس لئے اس کو بار بار صلا دینے کی ضرورت ہوتی ہے مگر زیادہ غور کرنے کے بعد جیسا کہ مرزا خود بیان کرتے تھے اس میں ایک نہایت لطیف معنی پیدا ہوتے ہیں اور وہ یہ ہیں کہ پہلا مصرعہ بھی ساتی کی صلا کے الفاظ ہیں اور اس مصرعہ کو وہ مکرر پڑھ رہا ہے ایک دفعہ بلانے کے بعد میں پڑھتا ہے۔ کون ہوتا ہے حریفِ مردِ افکنِ عشق؟ یعنی کوئی ہے جو 'مردِ افکنِ عشق' کا حریف ہو۔ پھر جب اس آواز پر کوئی نہیں آتا تو اس مصرعہ کو دوسری کے بعد میں مکرر پڑھتا ہے۔ کون ہوتا ہے حریفِ مردِ افکنِ عشق! یعنی کوئی نہیں ہوا۔ اس میں بعد اور طرزِ آواز کو بہت دخل ہے کسی کو بلانے کا بعد اور ہے اور دوسری سے چپکے چپکے کہنے کا اور انداز ہے جب اس طرح مصرعہ مذکور کی تکرار کر دے فوراً یہ معنی ذہن نشین ہو جائیں گے (از یادگار غالب)

غم سے مریا ہوں کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی کہ کرے تعزیتِ مہر و وفا میرے بعد فرماتے ہیں میں اس غم سے مریا ہوں کہ میرے مری جانے کے ساتھ ہی مہر و وفا کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔ اور پھر اتنا بھی کوئی نہیں ہے کہ مہر و وفا کی تعزیت میرے بعد کرے گا۔

کئے ہے یکسی عشق یہ رونا غالب کس کے گھر جائیگا سیلابِ بلا میرے بعد فرماتے ہیں۔ اسے غالب مجھ کو عشق کی تمنائی اور یکسی پر رونا آتا ہے۔ میرے مری جانے کے بعد کون اس کا میزان بنے گا اور یہ سیلابِ بلا یعنی عشق کس کے گھر جائے گا۔

## ردیف آ

### عَنْزَل

بلایاے ہیں جو پیش نظر درو دیوار نگاہ شوق کو ہیں بال و پر درو دیوار  
 فرماتے ہیں۔ یہ درو دیوار جو حائل نظر ہیں اور نگاہ معشوق تک پہنچنے نہیں دیتے  
 ہیں ان کے حاجب بن جانے سے ہمارا کچھ حرج نہیں ہے۔ ہماری نگاہ شوق تصور  
 میں یا رنگ پہنچنے لگی ہے اور مشق تصور کا سبب بھی درو دیوار کا حجاب ہے گویا یہ  
 حائل ہو کر نگاہ شوق کے بال و پر بن گئے ہیں یعنی ان ہی کی وجہ سے چشم تصور میں یہ قوت  
 پیدا ہو گئی ہے۔

و فوراً شکستے کا شانے کا کیا یہ رنگ کہ ہو گئے مرے دیوار و درو دیوار  
 فرماتے ہیں۔ میرے جوشِ گریہ نے ترقی کر کے گھر کا یہ حال کر دیا ہے کہ دیوار گر کر دروازہ  
 بن گئی ہے اور دروازہ لمب پڑ کر دیوار بن گیا ہے۔

نہیں ہے سایہ کہ سن کر نویدِ مقدم یار گئے ہیں چند قدم پیشتر درو دیوار  
 فرماتے ہیں۔ یہ سایہ درو دیوار نہیں ہے جو درو دیوار سے تھوڑے فاصلہ پر نظر  
 آ رہا ہے بلکہ یار کے قدم رنجہ کرنے کی خوشخبری سن کر خود درو دیوار مہمان کے استقبال  
 کے واسطے چند قدم آگے بڑھ گئے ہیں۔

ہوئی ہے کس قدر از زانیئے جلوہ کہ مست ہے تھے کوچہ میں ہر درو دیوار  
 فرماتے ہیں۔ بڑے انوس کی بات ہے۔ خراب جلوہ کو تو نے اس قدر مست کر دیا ہے  
 کہ تیرے کوچہ کے درو دیوار بھی تیری خراب دیدار سے مست ہو گئے ہیں۔

جو ہے تجھے سر سودائے انتظار تو آ کہ ہیں دکانِ ستاعِ نظر درو دیوار  
 فرماتے ہیں۔ اگر تجھے کو انتظار کا سودا سلفِ خریدنا منظور ہے تو آ اور حماشا دیکھ کہ عالم

انتظار میں میری نگاہیں درو دیوار پر اس طرح جمی ہوئی ہیں جیسے دوکانداروں کے ہاں بیچنے کا سامان دکانوں میں سجا ہوا ہوتا ہے۔ متاعِ نظر کی خریداری اگر کچھ کو منظور ہو تو چلا آ۔

وہ آ رہا میرے ہمسایہ میں قسائے سے ہوئے قد درو دیوار پر درو دیوار فرماتے ہیں۔ وہ میرے ہمسایہ میں اگر آباد ہو گیا تو میرے درو دیوار کا سایہ اس کے درو دیوار پر قربان ہونے لگا۔

نظر میں کھٹکے جے بن تیرے گھر کی آبادی ہمیشہ روتے ہیں ہم دیکھ کر درو دیوار فرماتے ہیں۔ تیرے فراق میں ہمارے گھر کی آبادی ہماری آنکھوں میں کھٹکتی ہے (آنکھ میں کسی چیز کے کھٹکنے کا لازمی نتیجہ آنسو کا جاری ہونا ہے) ہم اپنے درو دیوار کو دیکھ کر ہمیشہ تیری یاد میں رو پا کرتے ہیں۔

بحجمِ گریہ کا سامان کم کیا میں نے کہ گر پڑے نہ جڑے پاؤں پر درو دیوار فرماتے ہیں میں نے جب کبھی دل کھول کر رونے کا ارادہ کیا ہے تو فوراً درو دیوار میرے قدموں پر گر پڑے ہیں۔ مطلب شعر کا یہ ہے کہ میرے رونے میں ایسا اثر ہے کہ تکمیلِ ارادہ سے پہلے تاثیر ظاہر ہو جاتی ہے۔

نہ پوچھ بیخودی عیشِ مقدمِ سیلاب کہ ایتھے ہیں پڑے سر بسر درو دیوار فرماتے ہیں۔ سیلاب آنے کے وقت بیخودی عشق کی کیفیت مجھ سے نہ پوچھ گویا درو دیوار کو حال آجاتا ہے اور وہ مصروفِ رقص ہو جاتے ہیں۔

نہ کہہ کسی سے کہ غائب نہیں بنائے میں حریفِ رازِ محبت مگر درو دیوار افشائے راز کی نسبت فارسی کا مقولہ مشہور ہے کہ ”دیوار ہم گوش دارد“ مرزا صاحب اس مقولہ کی مخالفت میں فرماتے ہیں کہ اپنا رازِ محبت اسے غائب زمانہ میں کسی سے نہ کہہ سوائے درو دیوار کے یعنی اگر تو اپنا رازِ محبت چھپا نہیں سکتا اور کسی کے سامنے

کنا ضروری سمجھتا ہے تو بجائے انسان کے درد دیوار سے کہ۔ مطلب شعر کا یہ ہے کہ راز محبت کبھی منہ سے نکالنا نہ چاہئے۔

### غزل

گھر جب بنا لیا ترے در پر کے بنیر جانے لگا اب بھی تو نہ مرا گھر کے بنیر  
مرزا صاحب نے اس مطلع میں نئی قسم کی شوخی برتی ہے۔ فرماتے ہیں میں نے جب کبھی  
مشوق سے یہ شکایت کی ہے کہ تو کبھی میرے گھر نہیں آتا تو اس نے جواب میں شوخی  
سے یہ کہہ دیا ہے کہ میں تمہارا گھر نہیں جانتا درد ضرور آگے اب مرزا اپنا قدیمی گھر  
چھوڑ کر مشوق کے دروازہ پر آپڑے ہیں اور اس سے یہ کہتے ہیں کہ میں نے ترے  
دردوازے پر بنیر تجھ سے اجازت لئے گھر بنایا ہے لیکن اب بھی تو میرے گھر کو بنیر سے  
کہے ہوئے نہیں جان سکتا۔

کہتے ہیں جب ہی نہ مجھے طاقتِ سخن۔ جانوں کسی کے دل کی میں کیونکر کے بنیر  
کہتے ہیں کا اشارہ مشوق کی طرف ہے۔ یعنی وہ کہتے ہیں اور اس وقت کہتے ہیں کہ جب  
مجھے اپنی طاقتِ تجویزی نہ رہی کہ میں اپنا حال دلِ مفصل اور مشعر بیان کر سکوں۔ میں  
کسی کا مدعا دلی بیان کئے بغیر کیونکر سمجھ سکتا ہوں۔ مطلب شعر کا یہ ہے کہ جب مجھ میں  
حال بیان کرنے کی طاقت نہ رہی تو وہ تم ظریف شوخی سے مجھ پر یہ الزام لگا تا ہے  
کہ تو اپنے دل کی بات بیان کرتا ہی نہیں میں بنیر کے تیز مدعا دلی کس طرح سمجھ سکوں۔  
کام اُس سے آپڑا ہے کہ جس کا جہان میں لیوے نہ کوئی نام سنگمر کے بنیر  
فرماتے ہیں۔ میں ایسے مشوق ستم شعار پر عاشق ہوا ہوں جس کے نام کے ساتھ  
ہر شخص سنگمر کا لفظ ضرور استعمال کرتا ہے۔ ایسے ظالم سے کس طرح مدعا برآری ہو سکے گی۔  
"لیوے" کا لفظ بہت قدیمی زبان کا ہے۔ مرزا صاحب کو یہ اردو دیوان کہتے ہوئے  
تقریباً ایک سو بارہ برس گزرے۔ اب یہ اور اس کے ساتھ اور بہت سے الفاظ

متروک ہو گئے۔ آخر عمر میں مرزا صاحب نے بھی ایسے صد ہا لفظ ترک کر دیے تھے۔ جی میں ہی کچھ نہیں، ہمارے دیگر نہ ہم سر جائے یا رہے نہ رہیں پر کے بغیر فرماتے ہیں۔ میرے دل میں کسی کی طرف سے بغض و عداوت نہیں ہے۔ میں ایک صحت باطن آدمی ہوں۔ سب سے صحت ملتا ہوں۔ اگر کسی کی طرف سے میرے دل میں کچھ بُلائی ہوئی تو فوراً اس کو ظاہر کر دیتا۔ اگر اس کے اظہار میں میری جان پر ہی بن جاتی تو میں ہرگز کچھ پردہ نہ کرتا۔ سچ یہ ہے کہ مرزا صاحب اپنی زندگی میں حسن اخلاق کا ایک نمونہ تھے۔ شعر کی خوبی میں کس کو کلام ہو سکتا ہے۔

چھوڑوں گا میں اُس بُتِ کافر کا پوجنا چھوڑے نہ خلق گو مجھے کافر کے بغیر چھوڑے گا لفظ دونوں مصرعوں میں اس بے تکلفی کے ساتھ باندھنا حسن بیان پر دل ہے۔ معنی شعر کے بالکل صحت میں۔ جو شخص کسی بُتِ کافر کو پوجے گا خلق خدا ضرور اُس کو کافر کرے گی۔

مقصد ہے از دغزہ دے گفتگو میں کا چلتا نہیں ہے دشمن و خنجر کے بغیر فرماتے ہیں۔ دشمن و خنجر سے میری مراد ناز و غزہ ہے۔ یعنی محسوسات سے تشبیہ دیے بغیر ہر کس و نا کس مطلب سمجھ نہیں سکتا۔

ہر چند ہو مشاہدہ حق کی گفتگو بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کے بغیر اس شعر میں بھی مسطورہ بالا شعر کا مضمون دوسرے الفاظ میں بیان کیا ہے۔ مصرعہ ثانی میں بات کا لفظ محذوف کر کے حسن بیان کو دوبالا کر دیا ہے۔ یعنی بادہ و ساغر کے بغیر بات نہیں بنتی۔

بہرا ہوں میں تم چلے دونا ہوا اتفاقات مُستنا نہیں ہوں بات مکر کے بغیر یہ شعر مرزا صاحب کے حسب حال ہے (آخر میں ثقلِ سماعت بہت بڑھ گیا تھا) نئی قسم کی شوخی برتی ہے۔ فرماتے ہیں آپ کو معلوم ہے میں بہرا ہوں۔ جب تک بلند آواز

سے دو تین مرتبہ کوئی بات نہ کہی جائے میں سن نہیں سکتا۔ اس موقع پر آپ مجھ سے ناراض کیوں ہوتے ہیں یہ موقع تو دو گنا الفتا فرمانے کا ہے نہ کہ آذر وہ ہونے کا ہے۔ غائب نہ کر حضور میں تو بار بار عرض ظاہر ہے تیرا حال سب اُن پر کئے بغیر صنعتِ معنوی کے علاوہ اس مقطع میں بہت بڑی خوبی یہ رکھی گئی ہے کہ سب کچھ عرض حال کر لینے کے بعد بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ گویا کچھ بھی نہیں کہا۔

### غزل

کیوں جل گیا نہ تاب رُخ یار دیکھ کر جلتا ہوں اپنی طاقتِ دیدار دیکھ کر  
کمالِ رشک کا اظہار اس خوبی سے کیا ہے کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔ فرماتے ہیں۔ رُخ یار  
کی چمک دمک دیکھ کر مجھ کو جل جانا چاہئے تھا، کیوں نہ جل گیا۔ اب اس کا نتیجہ یہ نکلا  
کہ اپنی طاقتِ دیدار دیکھ کر چلا جاتا ہوں۔ یعنی رشک و حسد نے میرے دل میں آگ  
لگا دی ہے۔

آتش پرست کہتے ہیں اہل جہاں مجھے سرگرم نالہائے شرر بار دیکھ کر  
فرماتے ہیں جس ارادت سے آتش پرست آگ کی بڑبڑا کرتے ہیں اُسی ذوق و شوق میں  
آہ شرر بار کرنے میں سرگرم رہتا ہوں۔ میری یہ حالت دیکھ کر اہل جہاں مجھ کو آتش پرست  
کہتے ہیں۔

کیا آبروئے عشق جہاں عام ہو جفا رکتا ہوں تم کو بے سبب آزار دیکھ کر  
فرماتے ہیں۔ تم نے جفا کو عام کر دیا۔ کسی قسم کا امتیاز باقی نہ رہا۔ اور تمہارے اس فعل  
نے عشق کی آبر و کو بے لگا دیا یعنی موردِ جفا ہمیشہ عاشق کی ذات ہوا کرتی ہے۔ تم رقیب  
پر بھی جفا کرتے ہو۔ رقیب کے دل میں تمہارا عشق نہیں ہے اُس پر تمہاری جفائیں  
دیکھ کر ہیں کہہ سکتا ہوں کہ تم بے سبب آزار ہوا اور یہی بات میرے کھینچ جانے کا  
سبب ہے۔



آتا ہے میرے قتل کو پر جوش رشک سے مڑتا ہوں اُس کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر فرماتے ہیں۔ باوجودیکہ وہ میرے قتل پر آمادہ ہو کر سامنے سے آ رہا ہے اور میں جانتا ہوں کہ قریب آ کر ضرور مجھ کو قتل کرے گا۔ لیکن اس کے دستِ ازم میں تلوار کو دیکھ کر میں جوش رشک سے مڑتا ہوں (پہلی ندرت تو اس شعر میں یہ ہے کہ ہنگام قتل عاشق کے عاشق کے دل میں بجائے خوشی یا خوف کے رشک پیدا ہو گیا ہے) ہنوز قاتل کے قریب آنے اور تلوار کے وار کرنے کی نوبت بھی نہیں آئی ہے۔ یہاں پہلے ہی آثارِ موت شروع ہو گئے ہیں (دوسری خوبی لفظ رشک نے یہ پیدا کر دی ہے کہ وہ ہاتھ جس میں معشوق نے قتل کرنے کو چھوٹی سی تلوار لے رکھی ہے کیا اس قابل نہ تھا کہ عاشق کی گردن میں حائل ہوتا۔ دل تسکین رکھنے کی غرض سے رکھا جاتا۔ ان دونوں باتوں کو چھوڑیے۔ کم از کم وہ نازک ہاتھ دستِ عاشق میں تو ہوتا) یہاں رشک کی دلیل یہ بھی پیدا ہو گئی ہے کہ تلوار اس کے دستِ نازک میں کھینچ کر پری بن گئی ہے۔

ثابت ہوا ہے گردن مینا پر خونِ خلیق لڑے ہے موجِ تری رفتار دیکھ کر فرماتے ہیں۔ شیشہ کی گردن پر خلقِ خدا کا خون ثابت ہو گیا ہے اس لئے خوف سے موجِ تیری رفتار کو دیکھ کر کانپ رہی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نشہ کے عالم میں تیری رفتار زیادہ مستانہ ہو گئی ہے اور اس کو دیکھ کر ایک زمانہ قتل ہو رہا ہے اگر تو شراب نہ پیتا تو بہت سے آدمیوں کا خون نہ ہوتا۔ شراب کا نشہ لوگوں کے قتل کا سبب ہوا ہے پس گردن مینا پر خون ثابت ہو گیا نہ تو شراب پیتا نہ لوگ تیری مستانہ چال پر جان قربان کرتے۔

واحسرتا کہ یار نے کھینچی اتم سے ہاتھ ہم کو حریمِ لذتِ آزار دیکھ کر فرماتے ہیں۔ اے افسوس ہم کو ظلم کا خواہشمند دیکھ کر اس سترگار نے جفا کر دی

مطلب یہ ہے۔ عاشق کی بڑی خواہش بھی معشوق رو رہی نہیں کرتا۔

بک جاتے ہیں ہم آپس میں سخن کے ساتھ لیکن عیار طبع حسریہ دار دیکھ کر فرماتے ہیں۔ ہم اپنی جنس سخن کے ساتھ خریدار کے ہاتھ خود بھی بک جاتے ہیں لیکن طبع خریدار کی کسوٹی کو پہلے دیکھ لیتے ہیں کہ یہ کسوٹی کھوٹا کھرا خرید کھنے والی ہے بھی یا نہیں مطلب یہ ہے۔ ہم اپنے قدر دان سخن کو بھی پہلے آزمایاتے ہیں اور دیکھ لیتے ہیں کہ یہ کس حد تک ہمارا شعر کچھ سکتا ہے اس کے بعد ہم خود اس کے قدر دان بن جاتے ہیں۔ حق یہ ہے کہ مرزا کا کلام سمجھنے کو ایک غیر معمولی دماغ کی ضرورت ہے۔ ان کے معمولی سے شعر کی نثر میں بھی ایک ایسی بات چسپی ہوئی ہوتی ہے کہ بہت ہی دلنشوار ہی ہے سمجھ میں آسکتی ہے۔

زناں باندھ سجھ صد دانہ تور ڈال رہا ہر دھچکے بے راہ کو ہموار دیکھ کر فرماتے ہیں۔ زناں اور صبیح میں ایک ہی ڈور ہے یعنی نگاہ عارف میں دونوں رستے ہیں۔ منزل مقصود یک پہنچنے کے رشتہ زناں کو بہ سبب صاف ہونے کے راہ ہموار سے تعبیر کیا ہے۔ اور صبیح کو اس کے دانوں کے اُتار پڑھاؤ کے خیال سے قشيب و فراز کا رستہ قرار دیا ہے جس میں منزل تک پہنچنے کے لئے سٹو ٹھوکریں کھانی پڑتی ہیں۔

ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں جی خوش ہوا ہے راہ کو فرخار دیکھ کر فرماتے ہیں۔ ان آبلوں سے بہت گھبرا گیا تھا مگر جنگل کو کانٹوں سے بھرا ہوا دیکھ کر دل کو خوشی پیدا ہو گئی۔ مطلب یہ ہے جب انسان کے دل کو عشق کی چٹک لگی ہوئی ہوتی ہے تو کیسی ہی تکلیفوں کا سامنا ہو بہت نہیں ہارتا۔

کیا بدگماں ہے مجھ سے کہ آئینہ میں مرے طوطی کا عکس سمجھ بے زنگار دیکھ کر معشوق کی صفات میں سے ایک صفت خوش گلوئی اور خوش بیانی بھی ہے۔ خوش بیانی کی صفت طوطی میں بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ طوطی کی خوشنوائی مشہور ہے۔ رشک کا آواز

جتنا عاشق میں ہوتا ہے اس سے کہیں زیادہ معشوق میں بھی ہوا کرتا ہے۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ وہ مجھ سے ایسا بدگمان ہے کہ میں اگر آئینہ بھی دیکھتا ہوں تو اس میں رنگار کی سبزی کو دیکھ کر میرا معشوق عکس طوطی کی خوشنوائی سے اپنا دل بہلاتا ہے۔ رفتہ رفتہ اس کو میرا عشق جاتا رہے گا اس لئے وہ اپنی بدگمانی سے رنگار آئینہ پر رشک کرتا ہے۔ گرتی تھی ہم پر برق تجلی نہ طور پر دیتے ہیں بادہ ظن قلع خوار دیکھ کر اس شعر میں اس آیت کے مضمون کی ظن اشارہ ہے جس میں ارشاد ہوا ہے کہ ہم نے امانت کو زمین و آسمان اور سہاروں کے سامنے پیش کیا مگر وہ اس کے تحمل نہ ہوئے اور ڈر گئے اور انسان نے اس کو اٹھایا۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں۔ برق تجلی کے گرنے کے ہم مشتق تھے نہ کوہ طوز اس لئے کہ خراب خوار کا ظن دیکھ کر اُس کے موافق اکی شراب دی جاتی ہے۔ پس کوہ طور جو منجملہ جمادات کے ہے وہ کیونکر تجلی الہی کا تحمل ہو سکتا ہے۔ یہ خیال مع اس تشبیل کے جو اس میں بیان ہوئی ہے بالکل اچھوتا خیال ہے (از یادگار غالب) یہ شعر مرزا صاحب کے شعروا میں سے ایک شعر ہے۔

سر بھوڑنا وہ غالب خویہ رہ دال کا یاد آ گیا مجھے تری دیوار دیکھ کر  
مرزا صاحب نے مصرعہ اولیٰ میں ”وہ“ کے لفظ سے واقعہ کی تصویر کھینچ دی ہے۔ سر  
پھوڑنے کا سماں آنکھوں کے سامنے سر بھوڑنے کا وقت اور موقع عجز گیا مگر اس کی  
دیوار کو دیکھ کر اب تک وہ تماشا آنکھوں کے رویرو پھر جاتا ہے اور وہ درو دیوار  
دیکھنے والوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

### غزل

رزا ہے مراد دل رحمت مہر و خشاں پر میں ہوں وہ قطرہ شبنم کہ بوخارِ بیابان  
فرماتے ہیں۔ آفتاب ایک قطرہ ناچیز کے جذب کرنے میں وہ سرگرمیاں دکھا رہا ہے نہ  
اس کے دیکھنے سے میرا دل کانپا جاتا ہے۔ قطرہ اور قطرہ بھی وہ قطرہ جو نوک خار

پر ٹھہر گیا ہے بہت ہی ناپائدار ہستی کا حکم رکھتا ہے۔ اس کے لئے جب ایسی سرگرمی کی ضرورت ہے تو دنیا کے بڑے کام تو بہت ہی دشواری اور محنت سے سرانجام پاتے ہوتے۔ نہ چھوٹی حضرت یوسفؑ یاں محبت خانہ رانی سفیدی دیدہ یعقوب کی بھرتی ہو زنداں پر فرماتے ہیں۔ زنداں میں جس یوسفؑ کے لئے کراہش کا سامان پیدا ہو گیا۔ یعنی حضرت یعقوبؑ کی سفیدی چشم قید خانہ کے درد دیوار پر رہی ہے۔ یہ اشارہ ہے حضرت یوسفؑ کے تصور میں رونے رونے حضرت یعقوبؑ کی آنکھوں کے کور ہو جانے کی طرف۔

فنا تعلیم درس بخود کی ہوں اُس زمانہ سے کہ مجنوں لام الف گھٹتا تھا دیوارِ دستاں فرماتے ہیں۔ میں نے اُس زمانے میں فنا کی تعلیم پائی ہے۔ جب مجنوں طفلِ کتب تھا اور کتب کی دیواروں پر حروفِ مفرد بچوں کی طرح لکیریں کھینچ کر لکھا کرتا تھا۔ لام الف مل کر لفظ لا ہو جاتا ہے اور لا اللہ سے حضراتِ صوفیہ کے اِن نفی و اثبات کی ضرورت نکلتی جاتی ہیں۔ مطلب شعر کا یہ ہے کہ میں درس فنا میں قیس عامری پر سبقت رکھتا ہوں اس لئے کہ مجھ کو فنا کی تعلیم روزِ ازل میں ملی تھی

فراغت کس قدر رستی مجھے تشویشِ مریم بہم گر صلح کرتے پارِ اہائے دل نکلاں پر فرماتے ہیں۔ مجھ کو مریمؑ کے نسخے ڈھونڈنے کی تلاش کرنے۔ میلنے لوگوں سے ملنے سے فارغ الہامی حاصل ہو جاتی۔ اگر دل کے زخم آپس میں نکلاں پر صلح کر لیتے۔ مطلب یہ ہے کہ قناعت اور صبرِ انسان کو تلاش اور جستجو کی تکلیفوں سے چھڑا دیا کرتا ہے۔

نہیں اقلیمِ اُلفت میں کوئی کلو مار تازِ ایسا کہ پشتِ چشم سے جس کے نہ ہوئے مہرِ عنوان مرزا صاحب نے ان دو مصرعوں میں بہت بڑے مضمون کو بیان فرمایا ہے جس کی وسعت کے سامنے بڑے سے بڑا دفتر بھی کچھ حقیقت نہیں رکھتا۔ فرماتے ہیں۔ اقلیمِ عشق میں کوئی دفتر کی کتاب اغماض و ناز اور اندازِ مشوقانہ سے خالی نہیں ہے اور نازِ مشوقانہ ہمیشہ عاشق کے برخلاف حکم جاری فرماتا رہا ہے۔ فرادس پرچہ

خیریں کے عشق میں مر گیا اور وصل نصیب نہ ہوا۔ تیس دیوانہ ہو کر جنگل میں جا پڑا۔  
 مگر ییل نے وصل سے انکار ہی کیا۔ ایسے ہزاروں واقعات دُنیا میں گزرے ہیں مگر  
 دعویٰ یہ ہے کہ عاشق صادق ہمیشہ ناکام اور نامراد ہی ہوا کرتا ہے۔ دُنیا میں ایسا کوئی  
 عاشق پیدا نہیں ہوا کہ جس سے معشوق نے اغماض و انکار نہ برتا ہو اور کشت چشم سے  
 انکار پر مہر نہ کی ہو۔

مجھے اب دیکھ کر ابرہہ شفق آلودہ یاد آیا کہ فرقت میں تیری آتش برستی تھی گلستاں پر  
 مرزا صاحب معشوق سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں۔ مجھ کو اب تیرے سامنے ابرہہ شفق آلودہ دیکھ کر  
 یاد آگیا ہے کہ تیری جُدائی میں اسی طرح گلستاں پر آگ برستی تھی۔ یعنی جب کبھی فرقت  
 کے زمانے میں باغ کی سیر کو جانے کا اتفاق ہوا ہے اور غنچہ رنگل پر نظر پڑی ہے تو یہ  
 معلوم ہوا ہے کہ آگ برس رہی ہے۔ سُرخ رنگ کی مناسبت سے گل کو آگ سے نصیب  
 دینی اور بھر میں باغ کی سیر کا ناگوار گزرتا جس خوبی سے بیان کیا ہے اُس کی قریب  
 نہیں ہو سکتی۔

بجز پرہیز و از شوق ناز کیا باقی رہا ہوگا قیامت اک ہوئے تند بے خاک شہیدان  
 فرماتے ہیں۔ تیرے شہیدانِ ناز کے ڈھیر پر سو بار قیامت آچکی ہے۔ یعنی جب تیرے  
 جلی ہے ان کی خاک اُڑ کر پریشان ہوگئی ہے اگر قیامت میں قیامت آئی بھی تو  
 تیرے شہیدانِ ناز کو کیونکر اٹھا سکے گی۔ ان کی خاک اب باقی کہاں ہے وہ تو پچھلے  
 برباد ہو چکی ہے۔

نہ لڑنا صبح سے غائب کیا ہو اگر اُس شدت کی ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر  
 مجبوری۔ مظلومی اور سبکی کی تصور و لفظوں میں اس سے بہتر نہیں کھینچ سکتی۔ فرماتے ہیں۔  
 اے غائبِ ناصح کی سخت زبانی اور بے رحمی کی کیوں شکایت کرتا ہے اور کس لئے  
 اُس سے لڑتا ہے۔ خاموش ہو رہ۔ صبر کر اس کے مقابلہ میں ہمارا بھی تو زور گریباں

چلتا ہے جب زیادہ مایوس اور مجبور ہو جاتے ہیں تو ہم اس اندوہ و غم کی حالت میں اپنا گریبان پھاڑ لیتے ہیں۔ ناصح کی زبان چلتی ہے وہ ہمیں بُرا بھلا کتا ہے۔ ہمارے ہاتھ چلتے ہیں ہم مظلوم اپنا گریبان پھاڑ لیتے ہیں۔ بے مثل قطع کھاتا۔

### غزل

ہے بسکہ ہر اک ان کے اشارے میں نشان اور کرتے ہیں محبت تو گزرتا ہے کہاں اور فرماتے ہیں۔ اُن کی کوئی بات بناوٹ اور فریب سے خالی نہیں ہوتی۔ محبت کے پردہ میں بھی دشمنی کا اظہار ہوا کرتا ہے اس لئے میں ہمیشہ اُن سے ہوشیار اور بدگمان رہتا ہوں۔ یارِ بُد نہ سمجھے بیشِ سمجھیں گے مری بات فے اور دل اُن کو جو نہ شے مجھ کو زبانی دے اس شعر کے دو معنی ہیں۔ ایک یہ کہ سوالِ وصل پر میری زبان نہیں اُلتی اور صاف غفلتوں میں اپنی وضع کے خلاف مدعا رد لی بیان نہیں کر سکتا۔ اور وہ یا تو اپنے بھولے پن کے سبب سے میرے مطلب کو سمجھ نہیں سکتے یا جانی بوجھ کر نادان بن جاتے ہیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی جاتی ہے کہ اُن کو ہی دوسرا دل عطا فرمائے اگر مجھ کو اور زبان نہیں ملتی۔ دوسرے معنی بقولِ استادِ سی حضرت مولانا حامی مرحوم و منقول یہ ہیں کہ مرزا صاحب در پردہ ان لوگوں کی طرف اشارہ فرما کر کہتے ہیں جو مرزا کے کلام کو بے معنی یا بعید الفہم کہا کرتے تھے۔

ابرو سے ہر کیا اُس نگہِ ناز کو پیوند ہے تیر مقرر مگر اُس کی ہے کہاں اور مرزا صاحب نے تیر و کہاں کی پُرانی تشبیہوں کو پیش پا افتادہ سمجھ کر نیا پہلو اختیار کر لیا ہے فرماتے ہیں کہ ان ابرو سے اس کی نگہِ ناز کو کوئی تعلق نہیں ہے۔ یعنی نگہِ ناز تیر ضرور ہے مگر اس کی کہاں ابرو نہیں ہے۔ یہ نگہِ ناز کا تیر دلی ارادہ کی گمان سے نشا پر لگا کرتا ہے اسی واسطے اس کے زخم مختلف صورتوں کے ہو کرتے ہیں۔ کہیں وہ غوخی کے پہلو اختیار کر کے عاشق کو ترپاتا ہے۔ کہیں غصہ کے پیکاں سے قتل کرتا ہے۔

تم شہر میں ہو تو ہمیں کیا غم جب اٹھیں گے لے آئیں گے بازار سے جا کر دل جہاں اور  
فرماتے ہیں تمہارے عشق میں ہر شخص جان و دل سے تنگ آگیا ہے۔ بازاروں میں کم قیمت  
پر سودا بن جاتا ہے۔ ہم جان و دل اور خرید لائیں گے۔

ہر چند جگہ دست ہوئے بت شکنی میں ہم میں تو ابھی راہ میں سنگ گراں اور  
اس شہر میں سارا زور ہم کے لفظ پر ہے یعنی جب تک کہ ہماری ہستی باقی ہے اس وقت  
ہم معرفت الہی میں ایک اور سنگ گراں سدا راہ ہے پس اگر ہم نے بُت توڑنے  
میں بُک دستی حاصل کی ہے تو کیا فائدہ یہ بڑا بھاری بُت یعنی ہماری ہستی تو  
ابھی موجود ہے (از یادگار غائب)

ہے خونِ جگرِ جوش میں دل کھول کے روتا ہوتے جو کئی دیدہ خونناہ نشاں اور  
فرماتے ہیں۔ خونِ جگرِ جوش کی حالت میں ہے۔ کاش ایسا ہوتا کہ مجھ کو دیدہ خونناہ نشاں  
بہت سے مل گئے ہوتے تو ممکن تھا کہ میں دل کھول کر یعنی دل کی خواہش کے  
موافق روتا اور خونِ جگر کے دریا بہا دیتا۔ جوشِ خونِ جگرِ عالم میں صرف دو  
آنکھوں سے کیا خاک رو سکتا ہوں۔

مرتا ہوں اس آواز پہ ہر چند سراپائے جلاؤ کو لیکن وہ کسے جائیں کہ ہاں اور  
فرماتے ہیں۔ مشق کا یہ کہنا کہ ہاں اور وار کر۔ ہاں ایک اور ہاتھ چھوڑ۔ ہاں ایک اور  
زخم لگا۔ مجھ کو اس قدر پسند ہے کہ اپنی جان جانے کا مطلق غم نہیں۔

لوگوں کو بے خورشید جہانِ بکا دھوکہ ہر روز دکھاتا ہوں میں اک داغِ نہاں اور  
فرماتے ہیں۔ میرے دل و جگر میں پوشیدہ ہزاروں داغ ہیں۔ میں ان داغوں میں سے  
ہر روز صبح کے وقت ایک نیا داغ لوگوں کو دکھاتا ہوں۔ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ خورشید  
جہانِ تاب معمولی طور پر افقِ مشرق سے طلوع ہو رہا ہے۔

لیتا، نہ اگر دل تھیں فی تیا کوئی دم چین کرتا۔ جو نہ مرنے کوئی دن آہ و فغاں اور

مرزا صاحب سے مشفق نے یہ سوال کیا ہے، تو کوئی دم چین سے نہیں رہتا اور لیا بھی نہیں ہوتا کہ تو ہمیشہ فریاد ہی کرتا رہے اس کے جواب میں مرزا کہتے ہیں کہ اگر دل تمہیں نہ دیتا تو کوئی دم چین لیتا۔ اگر نہ مرجاتا تو کوئی دن آہ و غناں اور کرتا رہتا۔ باوجود تاکید لفظی کے جس کو فارسی والوں نے جائز قرار دیا ہے، دونوں مصرعے عجب پُر لطف اور معنی خیز واقع ہوئے ہیں۔

پاتے نہیں جیہ راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے رگکتی ہے جہری طبع تو ہوتی پیرداں اور نالے یعنی ندی نالے۔ نہ آہ و نالہ، مثال کس قدر مثل لہ کے مطابق ہے اور مضبوطی کتنا مطابق واقع ہے۔ فی الحقیقت مصیبت اور رنج و تکلیف کے سبب جوں جوں شاعر کی طبیعت رگکتی ہے اسی قدر راہ دیتی ہے خصوصاً جو مضمون وہ اس وقت اپنے حسبِ کھتا ہے وہ نہایت مؤثر اور درد انگیز ہوتا ہے (از یادگار غالب)

ہیں اور بھی دنیا میں مخمور بہت اچھے کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور فرماتے ہیں۔ دُنیا میں اور شاعر بھی بہت اچھے ہیں۔ لیکن یہ بات سکتہ ہے سب لوگ اتفاق کے ساتھ کہتے ہیں کہ مرزا غالب کا اندازِ بیاں سب سے جُدا گاتا ہے (یہ بات مرزا صاحب کی خصوصیات سے ہے)۔

### غزل

صفائے حیرت آئینہ ہے سامانِ رنگِ آخر تئیر آب ہر جاماندہ کا پاتا ہے رنگِ آخر فرماتے ہیں جس طرح آئینہ بیکار اور منقل پرے رہنے سے رنگِ آنود ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ٹھہرے ہوئے پانی پر کائی جم کر اس کو بدرنگ اور میلا کر دیتی ہے مطلب شکر کا یہ ہے جو آدمی زیادہ مشہور اور کام کے سمجھے جاتے ہیں وہ ہی زیادہ سوردِ آفات و بلا رہتے ہیں۔

نہ کی سامانِ عیش و جاہ نے تدبیر و حشمت کی ہوا جامِ زمرہ بھی مجھے داغِ پلنگِ آخر



فرماتے ہیں میری وحشت مزاجی سامان عیش و جاہ سے بھی نہ بٹ سکی اور اس کی مثال یہ پیش کرتے ہیں کہ زمری پیا لہ بھی میری نگاہ میں چپتے کا داغ بن گیا۔ مطلب یہ ہے دنیا میں خوش و خرم رہنا دو قسمندی کے سبب سے نہیں ہوا کرتا ہے۔ یہ خدا کی دین ہے جس کو وہ چاہتا ہے غریبی اور مفلسی میں بھی دل شاد رکھتا ہے۔

### غزل

جنوں کی دستگیری کس ہوگر ہو نہ عریانی گریباں چاک کا حق ہو گیا ہے میری گردن پر  
فرماتے ہیں میں اپنی عریانی کا منت پذیر ہوں کہ اس نے میری جنون کی مدد کی ہے  
اس لئے چاک گریباں کا حق یعنی احسان میری گردن پر ہو گیا ہے۔ اگر گریباں چاک  
نہ ہوتا تو میں جنون کی کچھ مدد نہ کر سکتا۔ مطلب یہ ہے کہ آثار جنوں بغیر چاک گریباں  
کے ثابت نہیں ہوا کرتے۔

برنگ کاغذ آتش زدہ نیرنگ بیتابی ہزار آئینہ دل اندھے ایک بال تپیدن پر  
فرماتے ہیں جس طرح جلے ہوئے کاغذ میں ستارے سے چمکنے لگتے ہیں۔ اسی طرح شعبہ باز  
بیتابی نے ہزاروں آئینے میرے دل کے بازوؤں پر باندھ دیئے ہیں۔ ایک ترپ کے  
ساتھ ہزاروں نقطہ ہائے روشن نمودار ہو جاتے ہیں۔

فلک سے ہم کو عیش رفتہ کا کیا کیا تقاضہ ہے متاع بردہ کو سمجھے ہوئے ہیں قرض دہن پر  
متاع بردہ یعنی کوئی ٹھوٹی متاع یہ مضوی بھی بالکل وقوہیات میں سے ہے۔ جو لوگ آسودگی  
کے بعد مفلس ہو جاتے ہیں وہ ہمیشہ اپنے تئیں مظلوم و ستم رسیدہ و فلک زدہ سمجھا کرتے  
ہیں۔ اور آخر دم تک اس بات کے متوقع رہتے ہیں کہ ضرور کبھی نہ کبھی ہمارا انصاف  
ہو گا اور ہمارا اقبال پھر نمود کرے گا۔ (از یاد کا غالب)

ہم اور وہ بے سببے رخ آشنا دشمن کہ رہتا تھا شعلہ بہر سے تہمت لگنے کی چشم روزن پر  
فرماتے ہیں۔ ہم کو اس سبب سے رخ آشنا دشمن سے کام پڑا ہے جو آفتاب کی شعلہ کو دیکھ کر

نظر کی تہمت چشمِ روزن پر رکھتا ہے بطلب یہ ہے شعاعِ مہر جو روزنِ دیوار سے آتی ہے اس کو دیکھ کر یہ مشرقِ مجھ سے لڑتا ہے کہ تو نے روزنِ دیوار سے مجھ کو جھانکا تھا یہ شعاعِ مہر نہ تھی بلکہ تیری نظر تھی۔

فنا کو سوئے کشتاق ہوا سنی حقیقت کا فروغ طالعِ خاشاک ہے موقوفِ گلشن پر فرماتے ہیں۔ فنا فی اللہ ہو کر فروغِ معرفت حاصل کرنا چاہئے اور اس کی مثال پیش کرتے ہیں کہ جس طرح گھاس وغیرہ بھاڑ میں جھونکنے کے بعد شعلہ بن کر روشن ہو جاتی ہے اسی طرح فنا فی اللہ ہو کر حقیقتِ عرفان ظاہر ہو جاتی ہے۔

اسدِ سہل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے کہ مشقِ نازِ کرخونِ دو عالم میری گردن پر فرماتے ہیں۔ اسد کے حال پر تعجب آتا ہے کہ وہ ایسے انداز کا سہل ہے کہ کچھ مجھ میں نہیں آتا۔ خود قاتل سے کہتا ہے کہ تو مشقِ ناز اسی طرح جاری رکھ اور لوگوں کو قتل کرتا رہا خونِ دو عالم میری گردن پر بہہ گا۔ تجھ سے اس کی باز پرس نہ ہوگی۔

### غزل

شکمشِ مصلحت سے ہوں کہ خوبانِ تجھے عاشق ہیں تنکھنِ بر طرفِ دل جائیگا تجھ سارِ قیبِ آخر فرماتے ہیں۔ میں جو تیرے ستم اٹھاتا رہا ہوں ایک مصلحت سے اٹھاتا رہا ہوں اور وہ مصلحت یہ ہے کہ تجھ پر حسین عاشق ہیں۔ اگر تو مجھے نہیں ملتا تو ان میں سے یعنی حسینوں میں سے کوئی نہ کوئی تجھ جیسا رقیب ضرور مل جائے گا۔

### غزل

لازم تھا کہ دیکھو ہمارے کوئی دن اور تنہا کے کیوں اب ہو تنہا کوئی دن اور یہ ساری غزلِ زمین العابدین خاں المتخلص بہ عارف کے نوحہ میں ہے۔ عارف سے مرزا صاحب کو غایتِ درجہ کا تعلق تھا کچھ تو قرابت کے سبب اور زیادہ تر اس وجہ سے کہ وہ نہایت خوش فکر اور معنی یاب طبیعت رکھتے تھے۔ باوجودِ بزرگوئی

کے نہایت غرض گو تھے۔ ان کو حد سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ جب وہ جوان عمر میں فوت ہو گئے تو مرزا صاحب نے اُن کے مرنے پر غزل بطور نوحہ کے لکھی ہے جو نہایت لطیف اور دردناک ہے۔ فرماتے ہیں کہ میرے ساتھ ہی تم کو مرنا تھا مگر تم مجھ سے پہلے مر گئے اور تم نے راہ عدم تنہا طے کی تو اب اور کچھ دن تنہا رہو۔

ہٹ جائیگا سرگر ترا پتھر نہ گھسے گا ہوں در پہ ترے ناصیہ فرسا کوئی دن اور فرماتے ہیں۔ اگر تیرا سبب مرنا نہ گھسے گا تو میرا سر ضرور مٹ جائے گا۔ تیرے حصار پر میری ناصیہ فرسائی ہمیشہ کے لئے نہیں ہے بلکہ چند دن کے لئے ہے تھوڑے دنوں کے بعد ان دونوں باتوں میں سے ایک بات ضرور ہو جائے گی۔

آئے ہو کل اور آج ہی کہتے ہو کہ جاؤں مانا کہ ہمیشہ نہیں اچھا کوئی دن اور فرماتے ہیں تمہیں دُنیا میں آئے ہوئے زمانہ ہی کیا گزرا ہے مگر اکل ہی تو آئے تھے۔ اور آج ہی یہ کہہ رہے ہو کہ جاؤں۔ میں نے مانا کہ ہمیشہ یہاں نہ رہو گے لیکن کوئی دن اور پتھر و مرنے میں ایسی جلدی کیوں کرتے ہو۔

جائے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور فرماتے ہیں تمہاری رخصت کا وقت ہمارے لئے قیامت کا سامنا ہے تم یہ کیا کہتے ہو کہ اب ہم قیامت کے دن نہیں گے۔ کیا قیامت کا کوئی دوسرا دن بھی ہے۔ بہت ہی لطیف شعر کہا ہے۔

ہاں اے فلکِ پیرِ جواں تھا ابھی عارف کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرنے کا کوئی دن اور مرزا صاحب نے مسطورہ بالا اشعار میں عارف مرحوم کو مخاطب کیا ہے۔ اس شعر میں ہاں کا لفظ فلک کو مخاطب کرنے سے پہلے بطور یاد دہانی استعمال ہوا ہے اس ہاں کو اقرار سے کوئی تعلق نہیں ہے یعنی ہاں نہیں کی ضد نہیں ہے۔ آسمان سے یہ شکایت کرنی منظور تھی کہ مرنے والا ابھی تو جوان تھا اعرطیسی کو نہ پہنچا تھا۔ مگر وہ اور کچھ دن

زندہ رہتا تو تیرا کیا نقصان تھا۔

تم ماہِ شبِ چار و ہم تھے مرے گھر کے پھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشہ کوئی دن فرماتے ہیں۔ تم تو میرے گھر کے لئے چودھویں رات کے چائے کا حکم رکھتے تھے۔ تم سے میرے گھر میں کبھی لارہتا تھا۔ اگر میری یہ بات غلط ہے تو پھر وہ نقشہ گھر کا تمہارے بند کیوں نہ رہا۔ چاروں طرف اندھیرا کیوں چھا گیا۔ دوسری بات یہ ہے کہ بدرِ کامل رفتہ رفتہ کم ہو کر چھپا کرتا ہے تم دفعتاً میری آنکھوں سے غائب ہو گئے۔ یہ کیا ستم ہوا۔

تم ایسے کہاں کے تھے گھرے داد و ستد کے کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور فرماتے ہیں۔ تم لیکن دین کے اتنے تو گھرے نہ تھے کہ ملک الموت کے تقاضے پر فوراً ہی تم نے اپنی جان دے دی۔ اُسے اور کچھ دن تقاضا کرنے دیتے۔

مجھ سے تمہیں نفرت سی تیرے (طاہی) بچوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور تیرے مراد رساں قابضیاء الدین احمد خاں بہادر القلص بہ نیر و فشاں کس دوبار دنیا جو عادتِ مرحوم کو مرزا صاحب سے بھی زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ باقی شعریات ہے۔ گزری نہ بہر حال یہ مدتِ خوش و ناخوش کرنا تھا جو ائمہ گزرا کوئی دن اور فرماتے ہیں جس طرح اب تک تم نے عمر کا حصہ زمانہ کی خوشی اور رنج میں گزارا تھا اسی طرح اور کچھ دن دُنیا میں بسر کرنے تھے جوانی کے عالم میں کیوں مر گئے۔

ناداں ہو جو کہنے ہو کہ کیوں جیتے ہو غالب قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور فرماتے ہیں۔ تم لوگ نادان ہو جو یہ کہنے ہو کہ عارف سے جو ائمہ گزرا کا داغ اُٹھا کر اے غالب تم کیوں زندہ ہو۔ مر کیوں نہیں جاتے۔ میں اس لئے نہیں مرنے کہ میری قسمت میں ابھی کچھ دن مرنے کی آرزو میں جاں بلب رہنا لکھا ہے۔

## ردیف ز

### غزل

فارغ مجھے نہ جان کہ مانند صبح بہر ہے داغِ عشق زینتِ جبے کفن ہنوز  
 اس شعر میں چاک کفن کو صبح سے اور داغِ عشق کو آفتابِ صبح سے تشبیہ دی ہے۔  
 مطلب یہ ہے کہ میں مرجانے کے بعد بھی مصائبِ عشق سے فارغ اہمال نہیں ہوں۔  
 ہے نازِ مفلسانِ زرا از دستِ رفتہ پر ہوں نگہ فروشِ شوخی داغِ کفن ہنوز  
 فرماتے ہیں۔ جس طرح مفلس لوگ دولت اپنی برباد کر کے فقر پر اپنے اسرافِ کابیائی کیا  
 کرتے ہیں اس طرح میں اپنے داغِ عشق کو کھو کر اس کا ذکر کیا کرتا ہوں۔  
 میخانہ بھگر میں یہاں خاک بھی نہیں حمیازہ کھینچے ہے بتِ بیدا دفن ہنوز  
 فرماتے ہیں۔ میخانہ بھگر میں یہاں اب شرابِ عشق کا ایک قطرہ تبھی باقی نہیں خاک اُڑ  
 رہی ہے۔ یعنی سب خون صرف ہو چکا۔ مگر میرے خون کا پیاسا مشوق ابھی تک انگڑیاں  
 لے جاتا ہے کہ نشہ نہیں ہوا اور پلا۔

### غزل

حریفِ مطلبِ مشکل نہیں فسوں نیاز دُعا قبول ہو یا رب کہ عمرِ خضر دراز  
 میرزا صاحب نے اس مطلع میں بالکل نئی شوخی برتی ہے جو شاید کسی کو نہ سوجھی ہوگی۔  
 فرماتے ہیں کسی مشکل مقصد کے حاصل ہونے میں تو مجھ کو نیاز کا ستر کچھ کام نہیں دیتا  
 ناچار اب یہی دعائیں مانگیں گے کہ الہی خضر کی عمر دراز ہو۔ یعنی ایسی چیز طلب کریں گے جو  
 پہلے ہی دی جا چکی ہو (اقتباس از یادگارِ نقائب)

نہ ہو ہرزہ بیاباں نور و وہم وجود ہنوز تیرے تصور میں ہے نصیبِ فراز  
 فرماتے ہیں۔ وجودِ ماسوائے اللہ میں بیکار کھوکھل کر کے کھانا پھرتا ہے۔ معلوم ہوا ابھی تک

تیرے تصور میں نشیب و فراز ہیں۔ اگر ایسا ہے تو ابھی تک تیرا تصور ناتمام اور ناقص ہے۔

وصال جلوہ تماشا ہے پر دماغ کہاں کہ دیکھئے آئینہ انتظار کو پرواز فرماتے ہیں۔ یہ تو ہم تسلیم کرتے ہیں کہ وصال یا جلوہ حسن کے نئے نئے تماشے دکھایا کرنا ہے لیکن ہم یہ دماغ کہاں سے لائیں کہ بیٹھے ہوئے آئینہ انتظار کو صیقل کیا کریں مطلب یہ ہے کہ تماشائے جلوہ حسن کی تمنا کرنی تو آسان ہے مگر انتظار کی سختیاں کھینچنی بہت کٹھن بات ہے۔

ہر ایک ذرہ عاشق سے آفتاب پرست گئی نہ خاک ہوئے پر چلے جلوہ ناز فرماتے ہیں عاشق کی خاک کا ایک ایک ذرہ آفتاب پرست ہے۔ خاک ہو جانے کے بعد بھی جلوہ ناز کی آرزو نہ مٹی۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح خاک کے ذرے آفتاب کی شعاعوں کے مقابل ہو کر چمکنے لگتے ہیں۔ اسی طرح خاک عاشق کے ذرات آفتابِ حُسنِ یار سے کب ضیا کرتے ہیں۔

نہ پوچھ و مستِ بیخاں جنوں غالب جہاں یہ کاسہ گرد و لعل ایک خاک انداز فرماتے ہیں۔ اے غائبِ بیخاں جنوں کی دست کا حال مجھ سے نہ پوچھو۔ مختصر تائے دیتا ہوں کہ یہ آسمان کا بیالہ وہاں ایسا ہے جیسے کوڑا پھینکے کا برتن ہوتا ہے۔

قطعہ

دستِ سخی کرم دیکھ کہ سرتا سرِ خاک گزرے ہے آبلہ پا ابر گہر بارہ ہنوز میرزا صاحب نے اس شعر میں اہل کرم کی شای کا اظہار کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کریموں کو بذلِ اشارے کسی حالت میں دست بردار نہ ہونا چاہئے بلکہ کرم و بخشش کا شیوا ابر گہر بارہ سے سیکھنا چاہئے۔ باوجودیکہ ابر گہر بارہ آبلہ پا ہوتا ہے (پانی کے قطروں کی رعایت سے جو بادل میں ہوتے ہیں) ابر کو آبلہ پا کہا گیا ہے) پھر بھی فیضِ رسانی

کے لئے جنگل جنگل اور شہر شہر میں برساتا ہے۔  
 ایک قلم کا غدا آتش زدہ ہے صفحہ دھست نقش پائیں ہے تپ گرمی رفتار ہنوز  
 فرماتے ہیں۔ میری گرمی رفتار کا اثر ابھی تک میرے نقش پائیں اس قدر باقی ہے کہ صفحہ  
 دھست آتش زدہ بن گیا ہے۔

### قطعہ

کیونکر اُس بُت سے رکھوں جان عزیز کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز  
 اس کے ظاہری معنی تو یہ ہیں۔ اگر اس سے جان عزیز رکھوں گا تو وہ ایمان لے  
 لے گا اس لئے جان کو عزیز نہیں رکھتا۔ اور دوسرے لطیف معنی یہ ہیں کہ اُس  
 بُت پر جان قربان کرنی تو عین ایمان ہے پھر اس سے جان کیونکر عزیز رکھی جاسکتی  
 ہے (از یادگار غالب)

دل سے نکلا پہ نہ نکلا دل سے ہے ترے تیر کا پیکان عزیز  
 فرماتے ہیں۔ تیرے تیر کا پیکان یہ ظاہر تو میرے دل سے نکل گیا۔ لیکن سچی بات یہ  
 ہے کہ وہ ابھی دل سے نہیں نکلا یعنی اس کی جگہ اس کی محبت دل میں اسی پیکان  
 کی طرح کھنک رہی ہے جو ٹوٹ کر دل میں رہ گیا تھا اور تو نے اسے نکال لیا ہے۔  
 تاب لائے ہی بنے گی غالب واقعہ سخت ہے اور جان عزیز  
 مرزا صاحب کا یہ مقطع بھی عارف مرحوم کی موت کے افسوس میں ہے۔ فرماتے ہیں۔  
 اے غالب اس سختی کو برداشت کرنا ہی ہوگا۔ اس لئے کہ واقعہ تو سخت ہے اور  
 جان عزیز ہے۔ یعنی واقعہ کی سختی تو یہ کہتی ہے کہ جان دے دینی چاہئے اور جان  
 ایک ایسی عزیز شے ہے کہ انسان کسی حال میں اس کا دینا گوارا نہیں کرتا۔

### غزل

نہ گلِ نغمہ ہوں نہ پردہ ساز میں ہوں اپنی شکست کی آواز

فرماتے ہیں۔ میری پُر درد نے گلِ نغمہ اور پردہ ساز سے تعلق نہیں رکھتی ہے میں تو ایک سراپا درد ہوں۔ میری آواز تو گویا میرے دل کے ٹوٹنے کی صدا ہے۔

تو اور آرائشِ خم کا کل میں اور اندیشہ ہائے دور دراز فرماتے ہیں۔ تجھے تو صرف آرائش کی غرض سے کاکلوں میں بیچ و خم ڈالنے سے کام ہے۔ اور مجھ کو اس آرائش سے طرح طرح کے خوف اور اندیشے پیدا ہو رہے ہیں یعنی میں سمجھتا ہوں کہ اب دیکھئے کتنے نئے عاشق پیدا ہوتے ہیں اور کس قدر رقیبوں کا ہجوم مجھ پر ہوتا ہے۔

لافِ تمکینِ فریبِ سادہ دلی ہم ہیں اور رازِ ہائے سینہ گداز فرماتے ہیں۔ ہمارے یہ حکمین کے دعوے ہماری سادہ دلی کے قریب ہیں اس لئے کہ ہمارے سینہ میں تو ہزاروں رازِ دل گداز بھرے ہوئے ہیں۔ ہم سے کب تک اس کا ضبط ہوگا اور ہم کیونکر ان رازوں کو چھپا سکیں گے۔ یہ تو ایک نہ ایک دن طشتِ از بام ہو ہی جائیں گے۔

ہوں گرفتارِ اُلفتِ صیاد ورنہ باقی ہے طاقتِ پرواز فرماتے ہیں۔ دنیا کی محبت نے مجھ کو اپنا اسیر بنا رکھا ہے۔ اگر میں چاہوں تو وہی محبت سے آزادی حاصل کر سکتا ہوں۔

وہ بھی دن ہو کہ اُس شکر سے ناز کھینچوں بجائے حسرتِ ناز فرماتے ہیں۔ خدا ایسا کرے کہ وہ بھی دن مجھے نصیب ہو جائے کہ بجائے حسرتِ ناز کھینچنے کے اس شکر سے میں بھی ناز کروں۔

نہیں دل میں مرے وہ قطرہ خوں جس سے مرزاں ہوئی نہ ہو گلِ باز فرماتے ہیں۔ ایک خون کا قطرہ بھی میرے دل میں ایسا نہیں ہے جس سے پنجرہ مرزاں نے گلِ بازی نہ کی ہو۔ گلِ بازی ایک قسم کا کھیل ہے جو گلِ باز یا گیندے کے پھولوں سے کھیلا



جانا ہے چنانچہ کسی کا شعر ہے

رتبہ گل بازی کا دلا کاش تو پاتا ہاتھوں سے جو گرتا تو وہ آنکھوں سے اٹھاتا  
مطلب یہ ہے کہ خون دل تمام و کمال بکوں سے ٹپک گیا۔

اے ترا غمزہ یک قلم انگیز اے ترا ظلم سرسبز انداز  
فرماتے ہیں۔ تیرا غمزہ سراسر ناز کا کام دیتا ہے اور تیرا ظلم کسر بسر انداز۔

تو ہوا جلوہ گر مبارک ہو ریزشِ سجدہ جبین نیاز  
فرماتے ہیں۔ تو آگیا اور میں تجھے دیکھ کر سجدہ میں گر پڑا۔ میرا سجدہ کرنا تجھ کو  
مبارک ہو۔

مجھ کو پوچھا تو کچھ غضب نہ ہوا میں غریب اور تو غریب نواز  
اس شعر میں کچھ غضب نہ ہوا کے جملے نے عجیب پر لطف معنی پیدا کر دیئے  
ہیں۔ اہل زبان سرانی کے موقع پر طنز اس کا استعمال کرتے ہیں۔ باقی شعر کا  
مطلب صاف ہے۔

اسد اللہ خاں تمام ہوا اے دروغا وہ رند شاہد باز  
فرماتے ہیں۔ اسد اللہ خاں تمام ہوا یعنی مر گیا۔ ہائے افسوس وہ رند شاہد باز کیا بے شکل  
آدھی تھا۔

## ردیف (س)

### غزل

مردہ اے ذوقِ اسیری کہ نظر آتا ہے دامِ خالیِ قفسِ مرغِ گزنتار کے پاس  
پند جانور رکھنے کا یہ بھی ایک طریقہ ہے کہ جال لگا کر اس کے قریب قفس میں  
اسی قسم کے ایک طائر کو بند کر کے رکھ دیتے ہیں۔ طائر گزنتار کی آواز پر اس کے

ہم جنس طائر اگر جمع ہو جاتے ہیں۔ جال پر دانہ کچھا ہوا دیکھ کر کھانے میں مصروف ہو جاتے ہیں، صیاد جال کھینچ لیتا ہے۔

جگر تشنہ آزار تسلی نہ ہوا ! جوئے خوں ہم نے بہائی بُن ہر خائے کے پاس فرماتے ہیں۔ باوجودیکہ ہم نے لو کی نہی ایک ایک کانٹے کے پاس لطف خلش اٹھانے کے لئے اپنے تلوؤں سے بہادی لیکن جگر تشنہ آزار کو پھر بھی تسلی نہ ہوئی اور تکلیف اٹھانے سے اس کا جی نہ بھرا۔ ملک الشعراء میر تقی میر فرماتے ہیں۔

تسلی نہ ہوا دل بے تاب نہ تھا چشم تر سے خون ناب  
مُندھ گئیں کھوتے ہی کھوتے آنکھیں بے ہے خوب قت کے تم اس عاشق بیمار کے پاس  
تے کی رویت میں بھی اسی مضمون کا ایک شعر لکھا جا چکا ہے۔ اور وہ یہ ہے۔  
مُندھ گئیں کھوتے ہی کھوتے آنکھیں تاب یار لائے مری بالیں پہ اُسے پر کس وقت

اس شعر میں مرزا صاحب یہ بیان فرماتے ہیں کہ ضعف و نقاہت کے سبب سے حالت انتظار میں جب آنکھیں کھلے رہنے سے مزدور ہو گئیں اُس وقت تم اپنے عاشق بیمار کے پاس آئے اب ہم جی بھر کے تم کو دیکھ بھی نہیں سکتے۔

میں بھی رگ رگ کے نہ مرتا جو زبان کے بدلے دشمن اک تیز سا ہوتا مرے غمخوار کے پاس فرماتے ہیں۔ غمخوار کے طمنوں اور ملاست و فہمائش نے کندہ غمخوے مجھ کو قتل کر ڈالا میں کیوں سسک سسک کر جان دیتا اگر اس کے پاس اس زبان کے بدلے ایک تیز پھری ہوتی۔

دہن شیریں جا بیٹھے لیکن اے دل نہ کھڑے ہو جئے خوبان دل آزار کے پاس فرماتے ہیں اے دل خیر کے لٹھ کا قہم بن جاتا اس سے بت بہتر ہے کہ کسی معشوق کی دل آزار سے دل لگایا جائے۔

دیکھ کر تجھ کو بچن بسک نمود کرتا ہے خود بخود پہنچے سے گل گوشہ دستار کے پاس

فرماتے ہیں تجھے دیکھ کر جس کی قوت نامیدہ اس قدر ترقی کر جاتی ہے کہ پھول خود بخود  
بڑھ کر تری دستار تک پہنچ جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مشوق کے دیدار سے سب کے  
دلوں میں ولولہ مشوق پیدا ہو جاتا ہے۔

مر گیا پھوڑ کے سر غالب وحشی ہے بیٹھنا اُسکا وہ اگر تری دیوار کے پاس  
فرماتے ہیں۔ ہائے افسوس اپنا سر پھوڑ کر غالب وحشی مر گیا۔ مگر ہم کو اب تک وہ اس کا  
تیری دیوار کے پاس مشوق دیدار میں آکر بیٹھنا یاد آتا ہے کیا بے نظیر مقطع لکھا ہے۔

## ردیف (ش)

### غزل

نہ لیوے گر خس جو ہر طراوت سبزہ خط سے لگاٹ خانہ آئینہ میں روئے نگار آتش  
فرماتے ہیں۔ آئینہ نولادی اگر تیرے سبزہ خط سے تروتازگی نہ حاصل کرتا ہے اور اس میں  
طراوت نہ پہنچتی رہے تو تیرے شعلہ رخسار کا عکس خانہ آئینہ میں ضرور آگ لگا دے۔  
فروغ حسن سے ہوتی جو حل شکل عاشق نہ نکلے شمع کے پاس نکالے گرنہ خار آتش  
فرماتے ہیں۔ فروغ حسن سے عاشق کی مشکل حل ہو جاتی ہے اور مثال یہ دیتے ہیں  
کہ بائے شمع سے کاغذ کبھی نہ نکلے۔ اگر آگ اُس کو نہ نکالے۔ شمع کے ڈورے کو خار  
شمع کہتے ہیں اور اس خار کا نکالنے والا شعلہ شمع کو بتایا ہے۔ بالکل تیا خیال ہے  
اور بڑی خوبی سے ادا کیا ہے۔

## ردیف (ع)

### غزل

جادہ رُخور کو وقت شام ہوتا شعلہ چرخ واکرتا ہے ماہِ نو سے آغوش وداع  
مطلع ایک تصدیق کا مطلع ہے۔ تارِ شعاع مرزا غالب نے اُس خط کو لکھا ہے جو

غروب آفتاب کے بعد اور طلوع آفتاب سے پہلے ایک خطِ امیض آسمان پر دکھائی دیتا ہے اہل رصد کی اصطلاح میں اس کو قرنی الشمس کہتے ہیں۔ مطلب شمس کا یہ ہے کہ وقت شام آفتاب سفر کرنے کو اکادہ ہے اور آسمان ماہ نو کو آغوش و دایع بنا کر رخصتی معافنے کے لئے تیار ہے۔

### غزل

’رخِ نگار سے ہے سوزِ جاودانی شمع ہوئی ہے آتشِ گلِ آبِ زندگانی شمع  
فرماتے ہیں معشوق کے چہرہ نور سے شمع کو رنگ پیدا ہو گیا ہے۔ آتشِ رنگ میں جل رہی ہے۔ دوسرے مصرعہ میں فرماتے ہیں کہ آتشِ گل جو معشوق کے چہرہ میں ہے (یعنی سُرخِ رنگِ رخسار) وہ شمع کے لئے آبِ حیات کا حکم رکھتی ہے بخارِ می میں بجھی ہوئی شمع کو شمع کشتہ کہتے ہیں اس لئے شمع روشن کہ مرزا صاحب نے زندہ فرض کیا ہے۔ اکثر شعراء بھی لکھتے ہیں۔

زبانِ اہلِ زبان میں ہے مرگِ خاموشی یہ بات بزمِ میں روشن ہوئی زبانی شمع  
فرماتے ہیں۔ اہلِ زبان کی زبان میں خاموشی کو موت کہتے ہیں بزمِ میں یہ بات زبانی شمع کے روشن ہوئی یعنی ظاہر ہوئی ہے یا معلوم ہوئی ہے مطلب یہ ہے کہ جب شمع بجھ جاتی ہے تو اس کو شمع کشتہ کہتے ہیں اور جب جلتی رہتی ہے تو شعلہ کو زبانِ شمع سے تیسر کرتے ہیں مدعا یہ ہے کہ اہلِ زبان کا خاموش رہنا اہلِ زبان کی موت سمجھی جاتی ہے۔

کرے ہے صرف با پائے شعلہ قصہ تمام بطرِ اہلِ فنا سے فسانہ خوانی شمع  
فرماتے ہیں۔ شمع فقط شعلہ کے اشارہ پر اپنی زندگی کا قصہ تمام کر دیتی ہے یعنی شعلہ کی محبت میں شعلہ سے نور لگا کر از سر تا پا فنا ہو جاتی ہے جس طرح عاشقانِ الہی اللہ سے نور لگا کر فنا فی اللہات ہو جاتے ہیں اور اس سہتی سرہوم سے گزر جاتے ہیں۔

غم اُس کو حسرت پر روانہ کا ہے لے شعلہ ترے لرزے سے ظاہر ہے ناتوانی شمع  
 فرماتے ہیں۔ اسے شعلہ تر جھکا پ رہا ہے اس سے یہ ثابت ہو کہ شمع بہت ناتواں اور کمزور  
 ہو گئی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کو محرومی و ناکامی پر روانہ کا اس قدر رنج ہے کہ اپنے کو  
 گھلائے دیتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ شعلہ جو ہوا کی وجہ سے حرکت کرتا ہے اس کو  
 مرزا صاحب کی نازک خیالی کمزوری کا سبب بتاتی ہے۔ شعلہ سے مخاطب ہونے  
 شرمیں عجیب لطف پیدا کر دیا ہے۔

ترے خیال سے روح ہتھراز کرتی ہے بجلوہ ریزی بادوبہ پر فشانِ شمع  
 فرماتے ہیں۔ ترے خیال سے روح عاشق کو ایک جنبش سرور حاصل ہوتی ہے جس طرح  
 ہوا کے چلنے سے شعلہ شمع کو حرکت پیدا ہو جاتی ہے اسی طرح تیرے خیال سے سچی  
 سرور پیدا ہو جاتی ہے۔

نشاۃ داغ غم عشق کی بہار نہ پوچھ شگفتگی ہے خمیدہ گل خزانِ شمع  
 فرماتے ہیں۔ داغ غم عشق کی خوشی و سرور کا حال مجھ سے نہ پوچھو، وہ ایک فصل بہار کی  
 کیفیت رکھتا ہے جس طرح گل سے شمع بگم جاتی ہے اسی طرح عاشق داغ عشق سے  
 خمیدہ ہو جاتا ہے مطلب یہ ہے داغ عشق میں ایسی بہار پوشیدہ ہے کہ شگفتگی اُس پر  
 ہزار جاں سے مٹی ہوئی ہے۔

جلے ہے دیکھ کے بالین یار پر مجھ کو نہ کیوں ہو دل پہ مرے داغ بگمائی شمع  
 فرماتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شمع بھی یار پر عاشق ہے اور مجھ کو اپنا رقیب سمجھتی  
 ہے اس لئے گریا کے پاس مجھ کو دیکھ کر رشک و حسد میں جلی جاتی ہے۔ مجھے شمع  
 کی جانب سے یہ بگمائی پیدا ہو گئی ہے۔

## ردیف (ف)

### غزل

بیم رقیب سے نہیں کرتے وداع ہوش مجبوریاں تمک بٹے اے اختیار حیف  
 فرماتے ہیں۔ رقیب کے خوف سے میں بیہوش بھی نہیں ہو سکتا اس لئے کہ وہ بیہوش  
 ہو جانے کی حالت میں راز عشق سے خبردار ہو جائے گا۔ انہوں نے کہا کہ مجھ کو اپنے  
 ہوش پر بھی اختیار نہیں۔ انتہا کی مجبوری یہ ہے کہ میری خوشی پر یا ارادہ پر رقیب  
 کا ڈر غالب آگیا۔ مطلب یہ ہے کہ جی تو یہی چاہتا ہے اور موقع بھی ایسا ہی ہے کہ  
 بیہوش ہونا ضروری سمجھا گیا ہے مگر انشاء راز کے خیال سے ایسا نہیں کر سکتا۔  
 جلتا ہے دل کہ کیوں ہم اکبار جل گئے لے نا تمامئی نفس شعلہ بار حیف  
 فرماتے ہیں۔ اس بات کے تصور سے دل جلتا ہے کہ ہم باوجود آہ شعلہ بار رکھنے کے  
 ایک بار جل نہیں جاتے۔ جو آگ سینہ میں مشتعل ہے اس کا تو یہی تقاضا کہ ایک ہی  
 دفعہ جل کر خاکستر ہو جائیں لیکن نا تمامی اور نامردی ایک بار جل جانے سے روکتی ہے۔

## ردیف (ک)

### غزل

زخم پر چھڑکیں کہاں طفلان بے پروا نک کیا مزا ہوتا اگر پتھر میں بھی ہوتا نمک  
 فرماتے ہیں۔ لڑکے مجھے دیوانہ سمجھ کر پتھر مارتے ہیں اور ان پتھروں سے زخم بدن پر  
 ہو جاتے ہیں۔ لڑکے اتنے بے پروا ہیں کہ زخموں پر ٹھک نہیں چھڑکتے۔ اگر پتھر میں  
 نمک ہوتا یا یہ پتھر نمک سنگ کے ٹکڑے ہوتے تو بڑا لطیف آہا یعنی جسم پر زخم بھی پڑتا  
 اور نمک بھی چھڑک دیا جاتا۔

گرد راہِ یار ہے سامانِ نازِ زخمِ دل ورنہ ہوتا ہے جہاں میں کس قدر پیدا نمک  
 فرماتے ہیں۔ زخمِ دل کے لئے باعثِ نازِ شکرِ گردِ راہِ یار ہے۔ ورنہ نمک تو دنیا میں بہت  
 کثرت سے پیدا ہوتا ہے اور بہت ارزاں سمجھتا ہے لیکن زخمِ دل پر نمک سے وہ  
 لطف حاصل نہیں ہوتا جو یار کے رستے کی خاکِ زخموں میں بھر کر مزا دیتی ہے۔

مجھ کو ارزانی رہے تجھ کو مبارک ہو جیو نالہ بلبِل کا درد اور خندہ گل کا نمک  
 اس شعر میں لطف و شرمِ قریب ہے یعنی مجھ کو ارزانی رہے نالہ بلبِل کا درد اور تجھ کو مبارک  
 ہو جیو خندہ گل کا نمک۔

شورِ جولاں تھا کنارِ بحرِ کس کا کہ آج گردِ ساحل ہے بزخمِ موجِ دریا نمک  
 فرماتے ہیں۔ کس گورِ ہر دریا کے لطافت نے دریا کی ریتی میں گھوڑے کو کاوے ایڑیں  
 پھیرا تھا کہ جس کے ٹاپوں کی گردِ موجِ دریا کے زخموں میں نمک کا کام دے رہی تھی  
 مطلب یہ ہے کہ میرے معشوق کا گھوڑا موجِ دریا سے بھی تیز رفتار اور ٹپک غلاں  
 تھا جس کے رشک نے موجِ دریا کے زخموں میں نمک چھڑک دیا۔

داود دیتا ہے مرے زخمِ جگر کی واہ واہ یاد کرتا ہے مجھے دیکھے ہے وہ جس جانک  
 فرماتے ہیں۔ میرا معشوق جہاں کہیں نمک کو دیکھتا ہے مجھے یاد کر لیتا ہے یعنی بے اختیار  
 اُس کو میں اور میرا زخمِ جگر یاد آجاتا ہے جس میں وہ نمک بھرا کرتا ہے اور جب  
 میں یاد آتا ہوں تو میرے زخمِ جگر کی تعریف بھی کرتا ہے۔

چھوڑ کر جانا تنِ مجروحِ عاشق حیف ہے دل طلبِ کتابِ زخم اور مانگے ہیں اعضا نمک  
 فرماتے ہیں۔ ایسے وقت میں تنِ مجروحِ عاشق کو چھوڑ کر تیرا جانا افسوس کے قابل ہے۔  
 کہ جب دل تو زخم کا طلبگار ہے اور اعضائے جسم نمک کے خواستگار یعنی نہ ابھی  
 زخموں میں نمک بھرا ہے اور نہ دل میں کوئی زخم لگایا ہے۔

غیر کی منت نہ کھینچوں گاپے تو قیرِ درد زخمِ مثلِ خندہِ قابل ہے سرتاپا نمک

فرماتے ہیں۔ غیر کا منت پذیر ہونا میں پسند نہیں کرتا اور وہ بھی درد کی رعایت سے میرا زخم خندہ قاتل کی طرح سرتا پانکھ ہے۔

یاد ہیں غالب مجھے وہ دنِ وجدِ ذوق میں زخم سے گرتا تو میں پلکوں سے چنتا تھا انکھ فرماتے ہیں اے غالب تو میرا قدیمی دوست و غمزار ہے۔ ہمیشہ میرے ساتھ رہا ہے۔ مجھے وہ دن بھی یاد ہیں کہ جب میرے زخموں میں سے نمک کے ذرے گر پڑتے تھے تو میں پلکوں سے بچنا کرتا تھا۔ اس بیان میں دو خوبیاں پیدا ہو گئیں۔ ایک یہ کہ میں اتنا ایزاد دوست تھا کہ میرے زخم سے جو حصہ نمک کا کم ہو جاتا تھا میں اُس کو شوق کے ساتھ چُوبی کر پھر زخم میں بھر لیتا تھا۔ دوسری یہ خوبی ہے کہ نمک زمین پر گرے تو پلکوں سے اٹھانا چاہئے اس مشہور بات کی طرف اشارہ ہے۔

### غزل

آہ کو چاہئے اک عمر اثر ہونے تک کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک فرماتے ہیں۔ آہ کو ایک عمر چاہئے کہ اثر پیدا کرے اور جب تک آہ میں اثر پیدا نہ ہو گا اور تیری زلفت ہمارے حال پریشان سے خبردار نہ ہوگی ہم اُس وقت تک کب زندہ رہ سکتے ہیں۔

دامِ ہرج میں ہے حلقہِ مصد کام ننگ دیکھیں کیا گزرے ہو قطرے پہ گہر ہونے تک جو مطلب اس شعر میں ادا کیا گیا ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ انسان کو درجہ کمال تک پہنچنے میں سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے (از یاد بھار غالب)

عاشقی صبرِ طلب اور تمنا بیتاب دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک فرماتے ہیں۔ عاشقی صبرِ طلب کام ہے اور تمنا جلدی کر رہی ہے کہ جہاں تک جلد ملے ہو کامیاب ہونا چاہئے میں دل کو کیونکر صبر دوں اور ٹھہراؤں جگر۔ مطلب یہ ہے کہ جب جگر خون ہو جائے گا اُس وقت آہ میں اثر آئے گا اور کامیابی کی صورت



نظر آئے گی۔ عشق ایسی شے نہیں ہے کہ آج ہی آدمی عاشق ہو اور آج ہی مشوق پر اس کا اثر ہو جائے۔

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہوئے تک اس زمین میں ایسا صاف اور بے مثل شعر نکالنا مرزا ہی جیسے کامل فن کا کام تھا، فرماتے ہیں۔ یہ تو ہم نے مانا کہ تم تغافل کو کام میں نہ لاؤ گے اور جلد چلے آؤ گے مگر تم تک خبر پہنچنے پہنچنے تو ہم خاک ہو جائیں گے اس کا کیا علاج ہے۔

پرتو خیر سے ہے شبہم کو فنا کی تعلیم میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک فرماتے ہیں۔ جس طرح آداب کی گرمی سے شبہم بھاپ بن کر اڑ جاتی ہے میں بھی اسی طرح تیری ایک نظر عنایت میں فنا ہو جاؤں گا۔ مطلب یہ ہے میری ہستی شبہم سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی نہ مجھے اس سے زیادہ قیام و ثبات رہ سکتا ہے۔

یک نظر بیش نہیں فرصت ہستی غافل گرمی بزم ہے اک رقص شرر ہونے تک فرماتے ہیں۔ اے غافل فرقہ انسان۔ ایک نظر سے زیادہ ہستی کا وقفہ نہیں ہے اور اس کی مثال پیش کرتے ہیں کہ گرمی بزم یعنی بزم ہستی کی گرما گرمی اک رقص شرر ہونے تک ہے جس طرح شرر آتش چمک کر بجھ جاتا ہے اسی طرح انسان دم بھر میں فنا ہو جانے والی ہستی رکھتا ہے۔

غیم ہستی کا آسد کس سے ہو جز مرگ علاج شمع ہر رنگ میں ملتی ہے سحر ہونے تک اس شعر میں مرزا صاحب نے انسان کی زندگی کو اس لحاظ سے کہ جب تک موت نہیں آتی اس کو غم سے نجات نہیں ہوتی، شمع سے تشبیہ دی ہے کہ جب تک صبح نہیں ہوتی وہ برابر جلتی رہتی ہے ایسی بدیع و نادر تشبیہات مرزا صاحب کے سوا دوسرے شخص کو سوجھتی ہی نہیں۔

## ردیف (گ)

### غزل

گر تجھ کو ہے یقین اجابت دُعا نہ مانگ یعنی بغیر یک دل بے دعا نہ مانگ  
 فرماتے ہیں۔ اگر تجھ کو دُعا قبول ہونے کا یقین ہے تو پھر دُعا میں مانگ کر کیوں تضرع  
 اوقات کرتا ہے۔ بغیر کے معنی یہاں سوا کے ہیں یعنی ایک دل بے دعا کے سوا اور کچھ  
 نہ مانگ جب دل بے دُعا عطا ہو گیا پھر کسی چیز کی ضرورت ہی باقی نہ رہی۔ اس دُعا  
 سے بڑھ کر اور کوئی دُعا ہو ہی نہیں سکتی۔

آتما ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد مجھ سے جرے گنہ کا حساب لے خُدا نہ مانگ  
 اس شعر میں نئی طرح کی شوخی ہے جو بالکل اچھوتی ہے۔ بظاہر در خواست کرتا ہے کہ  
 اے خُدا مجھ سے میرے گناہوں کا حساب نہ مانگ اور دہرہ پردہ الزام دیتا ہے اگویا یہ  
 کتاب ہے کہ گناہوں کا حساب کیونکر دوں وہ شمار میں اس قدر زیادہ ہیں کہ جب ان کو  
 شمار کرتا ہوں تو وہ داغ جو تو نے دُنیا میں دیئے ہیں اور شمار میں اُسی کثرت سے ہیں  
 جس کثرت سے میرے گناہ ہیں ان کی گنتی یا د آتی ہے گناہوں اور داغوں کے شمار  
 میں برابر ہونے سے یہ مراد رکھی ہے کہ جب کسی گناہ کا مرتکب ہوا تو بسبب عدم  
 استطاعت کے اس کو خاطر خواہ نہ کر سکا کوئی نہ کوئی حسرت ضرور باقی رہ گئی مثلاً شراب  
 پی تو وصل نصیب نہ ہوا اور وصل میسر آیا تو شراب نہ ملی۔ پس جتنے گناہ کئے ہیں  
 اتنے ہی داغِ دل پر کھائے ہیں (از یادگار غائب)

## ردیف (ل)

### غزل

ہے کس قدر ہلاک فریبِ فائے گلِ بلبل کے کاروبار یہ ہیں خندہ ہائے گل

فرماتے ہیں۔ بلبل اس فریب اور دھوکے میں اپنی جان دے دیتی ہے کہ گل میں وفاداری کی صفت کوشیات و قیام ہے۔ پھولوں کو دیکھو کہ وہ بلبل کی اس غلط فہمی پر خندہ زن ہیں، مطلب یہ ہے کہ ہر عاشق کی نگاہ میں ہر معشوق ایک غیر نانی ہستی ہے۔ آزاد ی نسیم مبارک کہ ہر طرف ٹوٹے پڑے ہیں حلقہء دام ہوائے گل ہوائے گل۔ شوق گل۔ فرماتے ہیں آزادی نسیم۔ نسیم سے یہاں بونے گل مراد ہے یعنی بونے گل کو آزادی مبارک ہو۔ حلقہ ہائے دام گل ٹوٹے پڑے ہیں مطلب شکر کا یہ ہے کہ پھول کھل گیا اور بونے گل قید سے آزاد ہو گئی۔

جو تھا سو موج رنگ کے دھوکے میں مر گیا اے وائے نالہ لب خونیں نوائے گل ہر شخص موج رنگ کے دھوکے میں مر گیا، یعنی فریفتہ ہو گیا، افسوس ہے نالہ لب خونی نوائے گل پر مطلب یہ ہے کہ رنگ گل در حقیقت گل کا نالہ خونچکاں اور فریاد دلخراش ہے جس کو لوگوں نے غلطی سے موج رنگ سمجھ لیا ہے اور اس پر فریفتہ ہو گئے ہیں۔

خوشحال اس حریفِ رست کا کہ جو رکھتا ہو مثل سایہ گل سرہائے گل فرماتے ہیں۔ بڑا خوش نصیب ہے اس کا کیا کہنا ہے جو شرابخوار معشوق کے قدموں پر سر رکھے ہوئے عرصہ تنہا کر رہا ہو۔ اس شعر میں عاشق بد مست کو شام گل سے اور معشوق کو گل سے تشبیہ دی ہے۔

ایک بار کرتی ہے اُسے تیرے لئے بہار میرا رقیب ہے نفسِ عطر سائے گل فرماتے ہیں۔ بہار نے پھولوں کو جن میں اس لئے پیدا کیا ہے کہ یہ تیرے گلے کا ہار ہوں۔ اور تیرے بستر پر تیرے ساتھ رات بھر سوتے ہیں اور میں دیکھ کر جیوں۔ معلوم ہوا کہ نفسِ عطر سائے گل میرا رقیب ہے۔

شرمندہ رکھتے ہیں مجھے بادِ بہار سے مینائے بے شراب دل بے ہوائے گل فرماتے ہیں۔ اگر میرا فیضہ شراب سے خالی ہوتا ہے اور دل میں کبھی میرا شوق گل نہیں ہوتا

تو یہ دونوں باتیں مجھ کو باد بھاری سے شرمندہ کر دیتی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ کوکم ہمارے شراب خیش میں ہوتی لازمی ہے اور دل میں سیرِ باغ کا شوق ہونا ضروری ہے۔ درِ سلطوت سے تیرے جلوہ حسنِ غرور کی خوں ہے مہری نگاہ میں رنگِ ادائے گل فرماتے ہیں تیرے ربِ حسنِ غرور کے جلوہ سے میری نگاہ میں ادائے گل کا رنگِ خوں بن گیا ہے۔ مطلب یہ ہے چونکہ تیری غیرت یہ نہیں چاہتی کہ میرا عاشق کسی دوسرے مشوق پر فریفتہ ہو۔ اس لئے پھول کی رنگت میری آنکھوں میں خون کا حکم رکھتی ہے۔ تیرے ہی جلوہ کا ہے یہ دھوکہ کہ آج تک بے اختیار دوڑے ہے گل و رفقائے گل فرماتے ہیں۔ جب کوئی پھول کھلتا ہے تو اور کلیاں یہ سمجھ کر کہ تو پھول کے پردہ میں جلوہ گر ہوا ہے۔ پھول بن کر سلسلہ دار کھلتی شروع ہو جاتی ہیں اور اس سلسلے کو دیکھ کر یہ ثابت ہوتا ہے کہ ایک پھول کے پھلنے سے دوسرا پھول بھاگتا آ رہا ہے۔ غالب مجھے ہے اس کے ہم آغوشی آرزو جس کا خیال ہے گلِ حبیبِ قبائے گل فرماتے ہیں۔ اے غالب مجھ کو اس سے ہم آغوشی کی آرزو ہے جس کے خیال کو پھول نے اپنا زیب گریباں بنایا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس شاعرِ حقیقی کے خیال میں پھول اپنی زیب و زینت کرتے ہیں میں اس سے ہم آغوشی کی تمنا رکھتا ہوں۔ یعنی اس سے وصال کا خواہشمند ہوں۔

## ردیف (م)

### غزل

غم نہیں ہوتا ہے آوازِ دنگو بیش از یک نفس برق سے کرتے ہیں روشن شمع ماتم خانہ ہم فرماتے ہیں ہم آوازِ دنگ ہیں۔ ہم کو غم دنیا و م بھر سے زیادہ نہیں ہوتا ہے۔ گویا ہمارے ماتم خانہ میں بجائے شمع کے بجلی کا دم دیتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح بجلی ایک کنواں واحد

میں مجبب جاتی ہے اسی طرح ہمیں غم کا خیال آکر فوراً مٹ جاتا ہے یعنی اس کا اثر تصویر  
دیر بھی باقی نہیں رہتا۔

مخفلیں برہم کرے ہے گنجفہ بازِ خیال      میں ورق گردانی نیزنگ یک بیتخانہ ہم  
فرماتے ہیں۔ اب تک جو مخفلیں برہم ہو چکی ہیں ان کو گنجفہ بازِ خیال یاد دلاتا ہے۔ ہم گویا  
نیزنگ بہت خانہ کی ورق گردانی میں۔ مطلب یہ ہے کہ حسینوں کی مخفلیں جو برہم ہو چکی ہیں  
اب تک ہمارے خیال میں ہیں اور ہر وقت خیال میں رہا کرتی ہیں۔ گنجفہ کی ورق گردانی  
سے مطلب یہ ہے کہ جس طرح گنجفہ کھیلنے والے پتوں کو بار بار انگلیوں میں پھیلانے کی دیکھتے  
رہتے ہیں اور تمام بازیوں کے ورق شمار کرتے رہتے ہیں۔ اسی طرح عذری ہوئی محافلِ نشاط  
کی تصویریں جن کو ہم نیزنگ بہت خانہ سمجھتے ہیں ہمارے پیشِ نظر رہتی ہیں۔ یہ تشبیہ بالکل نئی  
تشبیہ ہے جو کج تک کسی کے کلام میں نہیں دیکھی گئی۔

باوجودیکہ جہاں ہنگامہ پیدائی نہیں      میں چراغانِ خستہ دل پر روانہ ہم  
فرماتے ہیں کہ دل پر روانہ میں نہیں شمع کے شوق نے روغن ہو کر اس قدر ہنگامہ آرائی کی ہے  
وہ ایسا مستور اور پوشیدہ ہے کہ اس کے لئے پیدائی اور ظہور کچھ بھی نہیں ہے۔ ایسا ہی  
حال ہماری ہستی کا ہے کہ ہنگامہ بہت کچھ ہے مگر ہستی کا کبھی نشان بھی نہیں ہے، یعنی  
حقیقت میں ہستی اگر ہے وہ ایک ہے۔

ضیافت ہے نے قناعت کیے ترکِ جستجو      ہیں وہاں تکیہ گاہ بہت مردانہ ہم  
فرماتے ہیں۔ ہم نے جو جستجو ترک کر دیا ہے قناعت کے سبب سے نہیں کیا ہے بلکہ جستجو  
کی طاقت ہم میں باقی نہیں رہی ہے اس واسطے ہم بہت مردانہ کی تکیہ گاہ کے لئے وہاں  
بن گئے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ مردوں کا یہی کام ہے کہ بہت کو اپنا تکیہ گاہ بنائیں لیکن  
یہاں برعکس معاملہ پیش آیا ہے۔

دائِم الحبس میں ہیں لاکھوں تمنائیں آسند      جانتے ہیں سینہ پر غموں کو زنداں خانہ ہم

فرماتے ہیں۔ ہم اپنے سینہ پر غموں کو میل خانہ سمجھتے ہیں اس لئے کہ ہمارے سینے میں لاکھوں  
تنتائیں عمر بھر کے لئے قید ہو گئیں ہیں نہ اب تک کبھی نکلیں نہ آئندہ زندگی بھر ان کے  
نکلنے کی امید کی جاسکتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بہت سی آرزوئیں ہمارے دل میں ایسی  
ہیں جن کا نکلنا صرف خدا کے فضل پر منحصر ہے۔

### غزل

بنالہ حاصل دل بستی فراہم کو متاع خانہ زنجیر جز صد معلوم  
مرزا صاحب تعلقات دنیا کی ذمت ای لفظوں میں فرماتے ہیں کہ اگر تجھے دنیا سے  
دل بستی ہے تو بلا کشتی اختیار کر اس لئے کہ خانہ زنجیر میں جو کچھ مال و دولت ہے  
وہ فقط صدائے شیون و فریاد ہے اور کچھ بھی نہیں۔ تعلق خاطر کو زنجیر سے تشبیہ دی ہے۔

### قطعہ

مجھ کو دیار غیر میں مار وطن سے دور رکھ لی ہرے خدا نے مری بکسی کی شرم  
پردیس میں مرنے کا ہر شخص کو ناگوار ہوتا ہے اس پر خدا کا شکر اس لئے کرتا ہے کہ اگر  
وہاں بے گور و گفن پڑے رہے تو کچھ مضائقہ نہیں اس واسطے کہ کوئی شخص نہیں جانتا  
کہ یہ کون ہے اور کس رُتبے کا آدمی تھا لیکن وطن میں جہاں ایک زمانہ واقعہ حال  
ہو مگر خریدار و غنچوار ایک بھی نہ ہو وہاں مُردے کی اس طرح مٹی خواب ہونی سخت  
رُسوائی اور ذلت کی بات تھی پس خدا کا شکر ہے کہ اُس نے پردیس میں مار کر میری بکسی  
کی شرم رکھ لی۔ اس میں گو بظاہر خدا کا شکر ہے مگر فی الحقیقت سراسر اہل وطن کی شرمگاہ  
ہے جس کو ایک عجیب پیرایہ میں ظاہر کیا گیا ہے (از یادگار غالب)

وہ حلقہ ہائے زلف نکلیں میں ہیں اے خدا رکھ لے جو میرے دعوئے وارستگی کی شرم  
فرماتے ہیں۔ اس کی گھونگھروالی زلفیں میری گھات میں ہیں۔ اے خدا اب میرے دعوئے  
وارستگی کی شرم تیرے ہاتھ میں ہیں تو میری شرم رکھ لینا مطلب یہ ہے اگر زلفوں میں

اسیر ہو گیا تو دعویٰ میرا آزادگی و وارستگی باطل ہو جائے گا۔

## ردیف (ن)

### غزل

لوں دامِ بختِ خفتہ سے یہ خوابِ خوش ملے غائب یہ خوت ہے کہ کہاں سے ادا کروں  
فرماتے ہیں۔ بختِ خفتہ سے ایک رات کی نیندِ قرض لے تو لوں لیکن اسے غائب یہ خوت  
ہے کہ اس قرضہ کو ادا کہاں سے کروں گا۔ مطلب یہ ہے کہ قسمت تو سو رہی ہے اور میری  
آنکھوں میں نیند نہیں ہے۔ اگر اپنے مقدر سے ایک گہری نیندِ قرض لے لوں تو لے سکتا ہوں  
لیکن یہ قرضہ ادا کیونکر ہوگا یعنی میں تو دولتِ خواب سے محروم ہی ہوں۔

### غزل

وہ فراق اور وہ وصال کہاں وہ شبِ روز و ماہ و سال کہاں  
فرماتے ہیں۔ وہ زمانہ ہمارا باقی نہ رہا اور وہ فراق کی راتیں بھی گت گئیں جن کا کاٹنا پہاڑ  
کاٹنے سے زیادہ دشوار تھا اور وہ وصل کے لطف بھی بٹ گئے جو اب یاد آتے ہیں۔  
وہ راتیں وہ دن وہ مہینے وہ سال کہاں چلے گئے جس میں فراق و وصال کے رنج و عیش  
اٹھائے تھے اور وہ حقوق بھی باقی نہیں رہا۔ یہ ساری غزل مسلسل اسی مضمون میں نظم  
کی گئی ہے۔

فصتِ کار و بارِ شوق کے ذوقِ نظارہٴ جمال کہاں؟

فرماتے ہیں۔ وہ شوق کی مشغولی اب کس کو ہے اور وہ نظارہٴ جمال کا ذوق و شوق اب  
کہاں ہے۔

دل تو دل وہ دماغ بھی نہ رہا شورِ سودائے خط و خال کہاں

فرماتے ہیں۔ وہ دل جس میں عشق سا گیا تھا وہ اگر مٹ گیا تو مٹ جائے لیکن افسوس تو

یہ ہے کہ وہ داغ بھی باقی نہ رہا جس میں سودائے خط و خال تھا۔

تھی وہ اک شخص کے تصور سے اب وہ رعنائی خیال کہاں  
فرماتے ہیں۔ یہ ساری باتیں جن کا ذکر اوپر آچکا ہے ایک شخص کے تصور سے تھیں۔  
اب وہ خیال کی بلند پروازیاں اور رنگینیاں کہاں باقی ہیں۔

ایسا آسماں نہیں لہور و نا دل میں طاقت جگر میں حال کہاں  
فرماتے ہیں۔ اب لہور و نا کوئی آسماں بات نہیں ہے۔ یعنی عشق کے مصائب کی انتہا ہو چکی  
اور خونِ دل و جگر تمام دمکال صرت ہو جانے سے نہ دل میں طاقت باقی رہی نہ جگر میں حالت۔  
ہم سے چھوٹا قمار خانہ عشق و اں جو جائیں گرہ میں مال کہاں  
فرماتے ہیں ہم سے قمار خانہ عشق ہمیشہ کے لئے چھوٹ گیا۔ اب وہاں جا کر کیا کریں جب  
گرہ میں مال ہی نہ رہا یعنی نقدِ دل سکہ داغ دولتِ صبر کچھ بھی پاس نہ رہا۔ اب داؤں  
کس مال پر لگائیں اور بجو اکس برستے پر کھیلیں۔

فکرِ دنیا میں سر کھپاتا ہوں میں کہاں اور یہ وبال کہاں  
فرماتے ہیں میں تو عشق کا بندہ تھا۔ غمِ عشق سے کام بڑھتا تھا۔ ہجر کے مصائب اٹھاتا  
تھا وصال کی نقدیں لوٹتا تھا۔ مجھ کو غمِ دنیا سے کیا سروکار۔ میں اس وبال کو کیا سمجھتا تھا۔  
مضمحل ہو گئے قویٰ غالب وہ عناصر میں اعتدال کہاں  
فرماتے ہیں۔ جوانی کا زمانہ گزر گیا۔ اعتدال کا وقت اب کہاں رہا۔ شباب کی مدت اب  
ختم ہو چکی۔ قویٰ میں انمول شروع ہو گیا۔

### غزل

کی وفا ہم سے تو غیر اس کو جفا کہتے ہیں ہونی آئی ہے کہ اچھوں کو بُرا کہتے ہیں  
فرماتے ہیں۔ مشوق نے جو ہم سے وفاداری کا بتاؤ ہے تو رقیب اس کو جفا کہتے ہیں۔ یہ تو  
قدیم دستور چلا آتا ہے کہ اپنے لوگوں کو دشمن یا حاصرِ بُرا کہا کرتے ہیں۔



آج ہم اپنی پریشانی خاطر اُن سے کہنے جاتے تو ہیں یہ دیکھئے کیا کہتے ہیں فرماتے ہیں۔ آج ہم اپنے دل کی پریشانی کا حال اُن سے کہنے کے ارادے سے اُنکے پاس جلتے ہیں۔ مگر دیکھنا چاہئے کہ وہاں جا کر کیا کہتے ہیں۔ اس شعر میں دو معنی پیدا کئے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ ان کے سامنے پہنچ کر ہم کچھ کہہ بھی سکتے ہیں یا نہیں۔ دوسری رُعبِ حُسن سے ہم میں طاقتِ گویائی باقی رہتی ہے یا نہیں۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ وہ ہمارا حال سُن کر دیکھئے اس کے جواب میں کیا فرماتے ہیں۔ مگر زیادہ لطیف پہلے ہی معنی میں ہے۔

انگلے دھتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو جوئے و نغمہ کو اندوہ رُپا سکتے ہیں فرماتے ہیں۔ وہ لوگ جو شراب اور گلے کو غم غلط کرنے والے سامان میں شمار کرتے ہیں وہ بُرائے زمانے کے بھولے بھالے آدمی ہیں۔ مے و نغمہ اندوہ رُپا نہیں ہے بلکہ اندوہ افزا ہے اس لئے کہ جب کوئی سامان نشاط آنکھوں کے سامنے آتا ہے تو یادِ بار تازہ ہو جاتی ہے بجائے غم غلط ہونے کے رنجِ جاں گسل کا سامنا ہو جاتا ہے۔ دل میں آجائے کسی ہوئی ہے جو نصرتِ عشق کو اور پھر کون سے نالے کو رسا کہتے ہیں؟ فرماتے ہیں۔ جب مجھے عشق سے افاقہ حاصل ہوتی ہے تو میرا مشوق میرے دل میں آ جاتا ہے اور یہ میرے نالہ کے اثر سے ہوتا ہے۔ مجھے معلوم نہیں اور کون سے نالہ کو رسا کہتے ہیں، اس سے زیادہ رسائی نالہ کو کیا ہوگی کہ فوراً ہی مشوق کو کھینچ کر دل میں لے آتا ہے۔

پے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مجھو قبلہ کو اہل نظر قبلہ نما کہتے ہیں قبلہ پر قبلہ نما کا اطلاق کرنا میرزا صاحب کے حصہ کا مضمون ہے۔ میرزا صاحب سے پہلے کسی نے نہیں کہا۔ یہ شعر ان لوگوں کے اعتراض کا جواب ہے جو یہ کہتے ہیں کہ مسلمان بھی دیوارِ کعبہ کے بتحووں کو سجدہ کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں ہمارا سجدہ مطلق اور اک

کی سرحد سے بہت اُدھر ہے یعنی کعبہ کو دیکھ کر یا بغیر دیکھے بہ سمت کعبہ سجدہ کرنا اس غرض سے نہیں ہے کہ ہم کعبہ کے پتھروں کو سجدہ کرتے ہیں بلکہ ہم اُس کو سجدہ کرتے ہیں جو جہات سے منترہ ہے۔ البتہ سجدہ کے لئے جہت لازمی ہے اس لئے جہت کعبہ کو عیناً کر لیا اور وہ جہت خل تبدیلہ نکلتے ہیں۔

پائے افکار یہ جب سے تجھے رُحْم آیا ہے خارِ رہ کو ترے ہم مہر گیا کہتے ہیں فرماتے ہیں۔ ہمارے پاؤں جو رستے کے کانٹوں سے زخمی ہو گئے ہیں انہی پر گجھ کو رُحْم گیا ہے اس لئے ہم تیری راہ کے کانٹوں کو کاٹنے نہیں کہتے بلکہ مہر گیا کہتے ہیں۔ مہر گیا ایک بونی کا نام ہے۔ اس بونی کی جڑ انسان کی شکل کی ہوتی ہے مشہور ہے کہ جو آدمی اپنے پاس اس جڑ کو رکھتا ہے اُس پر لوگ مہربان ہو جاتے ہیں۔ یعنی وہ محبوب کا اثر رکھتی ہے اس لئے اس کے راہ کے کانٹوں کو مہر گیا سے تعبیر کرتے ہیں۔

اک شرر دل میں اس سے کئی گھبرا گیا کیا آگ مطلوب ہے ہم کو جو ہوا کہتے ہیں فلسفہ جدید کے موافق (مسکد دوران خون جواب ثابت ہوا ہے) اس شعر میں نظم کیا گیا ہے جس سے حضرت مصنف کی فلسفیانہ قابلیت کا پتہ چلتا ہے۔ شرر سے مراد روح حیوانی ہے جو انسان میں موجود ہے۔ فرماتے ہیں۔ روح کی حرارت سے انسان کو سانس لینے کی ضرورت واقع نہیں ہوتی بلکہ ہر سانس کی ہوا سے روح کو شعل کرنا مقصود ہوتا ہے۔ دیکھئے لاتی ہے اس صرخ کی نغوت کیا رنگ اس کی ہر بات پر ہم نام خدا کہتے ہیں فرماتے ہیں۔ ہم اس کی ہر بات پر نام خدا یا ماشاء اللہ چشم بدودہ کر کے کرتے ہیں۔ مگر اس کی نغوت کو ترقی ہمارے اسی قسم کے جلوں سے ہوتی رہتی ہے۔ انجام کار دیکھئے ان باتوں اور اس کی نغوت کا کیا ہوتا ہے یعنی معلوم نہیں یہ اوتنی کس کل بیٹھے۔

وحشت و حقیقت اب مرثیہ لکھیں شاید مر گیا غائب آشفستہ نوا کہتے ہیں حقیقت سے مراد نواب مصطفیٰ خاں بہادر حقیقتہ رئیس جہانگیر آبادی ہیں اور وحشت سے مراد غائب

غلام علی خاں صاحب وحشت ہیں اور یہ دونوں مرزا صاحب کے شاگرد تھے مگر شاگردوں سے زیادہ میرزا صاحب کے ماننے والے تھے۔ مومن خاں صاحب کے انتقال کے بعد یہ دونوں صاحب مشورہ سخن میرزا صاحب ہی سے کرتے تھے۔

### عزل

آبرو کیا خاک اس گل کی نگہشن میں نہیں ہے گریباں رنگ پیرا بن جو دامن میں نہیں فرماتے ہیں۔ اس پھول کی آبرو کچھ نہیں ہے جو نگہشن سے باہر نکل گیا۔ گویا پھول کا بازار میں جا کر بکنا غلام بن کر آبرو کھودینا۔ مگر یہاں یہ مضمون دوسرے معنی پر استعمال ہوا ہے۔ گریباں رنگ پیرا بن کا ہے جو دامن میں نہیں ہے یعنی جب گریباں ٹکڑے ٹکڑے ہو کر دامن میں آجائے گا تو پھول بن جائے گا۔

خضعت اے گریہ کچھ بانی مرے تن میں نہیں رنگ ہو کر اڑ گیا جو خوں کہ دامن میں نہیں فرماتے ہیں۔ اے گریہ تیرا انجام یہ ہو کر میرے جسم میں کوئی حالت باقی نہیں رہی تو نے خون کو آنسوؤں کے رستے ہسکر میرے جسم میں ایک قطرہ بھی لہو کا باقی نہ رکھا اور جس قدر رہ گیا تھا وہ اتنا کم تھا کہ ہماری آنکھ سے چپکنے سے چہرہ کا رنگ بن کر اڑ گیا اور جو لہو چہرہ کا رنگ بن کر اڑا ہے وہ دامن کے حصّہ کا تھا اب دامن بے لہو کے رہ گیا۔

ہو گئے ہیں جمع اجزائے نگاہ آفتاب فتنے اس گھر کی دیوار میں کے روزن میں نہیں فرماتے ہیں۔ اس کے شوق دیدار میں نگاہ آفتاب کے اجزاء جمع ہو کر ذرات کی شکل میں ظاہر ہو گئے ہیں۔ روزن دیوار میں خاک کے ذرے نہیں ہیں۔

کیا کموں تاریکی زندان غم اندھیر ہے پنہ نور صبح سے کم جس کروزن میں نہیں فرماتے ہیں۔ زندان غم کی تاریکی کا حال کیا بیان کروں چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے، (قاعدہ ہے کہ جس جگہ تاریکی زیادہ ہوتی ہے وہاں سموری سی روشنی بھی بہت معلوم ہوتی ہے) اور ایسا اندھیرا ہے کہ روزن دیوار میں جو روشنی کی گولی بنا کر رکھی

ہے وہ پیسہ سحری کی طرح سے جھک رہی ہے۔  
 رونق ہستی ہے عشق خانہ دیلاں سانسے انجمنِ شمع ہے گر برقِ فرس میں نہیں  
 یعنی دنیا میں جو رونق اور چہل پہل ہے وہ عشق و محبت کی بدولت ہے خواہ زن و فرزند  
 کی محبت ہو خواہ مال و دولت کی خواہ ملک و ملت کی خواہ اور کسی چیز کی۔ پس اگر فرس  
 میں برق یعنی دلوں میں محبت نہیں تو اس کی مثال اس انجمن کی ہے جس میں شمع کی  
 روشنی نہیں (از یادگار غالب) بے مثل شعر لکھا ہے۔

زخمِ سلوانے سے مجھ پر چارہ جوئی کا طعن غیر سمجھا ہے کہ لذتِ زخمِ سوزن میں نہیں  
 فرماتے ہیں۔ زخم میں مانگے دوانے سے غیر مجھ کو علاج کرنے کا طعن دیتا ہے۔ وہ نادان یہ  
 نہیں سمجھتا کہ سوئی کے زخم میں بھی وہی تکلیف ہے جو زخمِ ڈالتے وقت تلوار یا تیرا کسی  
 اور دھاردار سے ہوتی ہے۔ لذت کا لفظ تکلیف کی جگہ استعمال کیا گیا ہے۔ شعر  
 کی عمدگی میں کیا کلام ہے۔

بسکہ میں ہم آگ بہارِ ناز کے مارے ہوئے جلوہ گل کے سوا اگر داپنے مدفن میں نہیں  
 فرماتے ہیں۔ ہم ایک بہارِ ناز کے نقشہٴ فتن ہیں۔ مدفن میں بھی اسی بہارِ ناز کے تصور سے  
 جلوہ گل کا سہل ہمارے پیش نظر ہے۔

قطرہ قطرہ اک بیوٹی ہے نئے ناسور کا خوں بھی ذوقِ درو کا رخ مئے تی میں نہیں  
 فرماتے ہیں میرے خون کا ایک ایک قطرہ ناسور کی صورت پیدا کرنے والا ہے جس طرح بیوٹی  
 پر سے ایک صورتِ مسدوم ہوتی ہے اور دوسری صورتِ طاری ہوتی ہے اسی طرح  
 خون کی ہر بوند سے لہو کے قطرہ کی صورت فنا ہو کر ناسور کی شکل پیدا ہو جائے گی  
 اور جسم میں جس جس مقام پر لہو کی بوندیں ہیں وہاں ناسور بڑ جائیں گے۔

لے گئی ساقی کی نخوتِ قلزمِ آشامی مری موجِ نئے کی آج رگِ سینا کی گردن میں نہیں  
 فرماتے ہیں۔ ساقی کو شراب پلانے پر بہت غرور تھا لیکن میری قلمِ آشامی نے آج اس کے

غور کر ڈھا دیا۔ میں نے اس کثرت سے شراب پنی کہ کسی خیشہ میں موج نے باقی نہ رہی۔

ہو فشارِ ضعف میں کیا ناتوانی کی نمود قد کے ٹھکنے کی بھی آسائش مے تن میں نہیں فرماتے ہیں ضعف مجھ کو ایسا بچڑھا ہے کہ اظہارِ ناتوانی کا موقع بھی نہیں ملا یعنی قد کا جھکنا ضعف کی علامت ہے مگر ضعف نے مجھ کو چاروں طرف سے بچھنچ رکھا ہے۔ اب کسی طرف میرے قد کے ٹھکنے کی گنجائش باقی نہیں رہی۔

تھی وطن میں شان کیا غائب ہو غربت میں قدر بے تکلف ہوں مشتبہ خس کہ گلشن میں نہیں اپنے تئیں پھوس دغیر سے اور وطن کو گلشن سے تشبیہ دی ہے یعنی جس طرح پھوس گلشن میں ہوتا ہے تو جتنا ہے اور گلشن میں نہیں ہوتا تو اس کی کچھ قدر نہیں ہوتی۔ یہی حال میرا ہے کہ وطن میں تھا اور اب پردیس میں ہوں تو بے قدر ہوں۔

### غزل

عہدے سے مدح ناز کے باہر نہ آسکا اگر اک ادا ہو تو اُسے اپنی قضا کوں فرماتے ہیں اس کے ناز و انداز کی تعریف جیسی ہوتی چاہئے تھی مجھ سے نہ ہو سکی اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر صرف ایک ہی ادا ہو تو میں اس کو قضا کہہ کر عہدہ مداحی سے سبکدوش ہو سکتا تھا۔ وہ تو سراپا ادا سے کس کس ادا کی تعریف کروں۔

حلقے ہیں چشمائے کشادہ بسوئے دل ہر تارِ زلف کو نگہ سرمد سا کہوں فرماتے ہیں۔ تیری زلفوں کے گھوگر چشمائے کشادہ بھی کہ دل کی تاک میں مصروف ہیں اس لئے مجھے مناسب ہے کہ ہر تارِ زلف کو نگہ سرمد سا سے تعبیر کروں۔

میں اور صد ہزار نواسے جگر خراش تو اور ایک وہ نہ شنیدن کہ کیا کہوں فرماتے ہیں۔ میں ہوں اور ہزاروں لاکھوں جگر خراش نالے ہیں۔ تو ہے اور ایک سنی اُن سنی کہ میں کا میں بیان نہیں کر سکتا۔

ظالم مرے گمان سے مجھے منفعل نہ چاہ ہے ہے خدا نہ کروہ تجھے بے وفا کموں  
 فرماتے ہیں۔ اے ظالم میرے گمان سے مجھ کو منفعل ہونا پڑے ایسا نہ کرنا۔ خدا نہ کرے کہ  
 میں تجھ کو بے وفا کموں مطلب یہ ہے کہ میرا گمان تو تجھ کو بے وفا کرتا ہے اور میں وفادار  
 کہہ رہا ہوں۔ ایسا نہ کرنا کہ مجھ کو اپنے گمان سے شرمندہ ہونا پڑے یعنی بے وفائی نہ کرنا  
 کہ خدا غواستہ مجھ کو بھی بے وفا کرنے کی ضرورت واقع ہو۔

### قطع

مہرباں ہو کے بلا لو مجھے چاہو جس وقت میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آج بھی نہ سکوں  
 فرماتے ہیں۔ تھوڑی سی رنجش کے بعد تم یہ نہ سمجھنا کہ میں ہمیشہ کے لئے تم سے روٹھ بیٹھا ہوں۔  
 نہیں یہ بات نہیں ہے تم مہربان ہو کر جس وقت چاہو مجھ کو بلا لو میں گوارا ہوا وقت نہیں  
 ہوں کہ پھر دوبارہ نہ آ سکوں۔

ضعف میں طعنہ اغیار کا شکوہ کیا ہے بات کچھ سر تو نہیں ہے کہ اٹھا بھی سکوں  
 فرماتے ہیں۔ ضعف کی حالت میں طعنہ اغیار کا شکوہ دیتے ہوئے تم کوں ڈرتے ہو بات کی  
 برداشت مجھ کو ضعف کی حالت میں بھی ہے۔ تمہاری بات کچھ میرا سر نہیں ہے کہ جس کو  
 میں ضعف کی وجہ سے نہیں اٹھا سکتا۔

زہر ہلکا ہی نہیں مجھ کو شملگر ورنہ کیا قسم ہے ترے ملنے کی کہ کھا بھی نہ سکوں  
 جب کہتے ہیں کہ اس کو فلاں کام کرنے کی قسم ہے تو اس کے یہ سنی ہوتے ہیں کہ اس کو اس  
 کام کے کرنے سے انکار ہے۔ پس عاشق مشوق کے ملنے کی قسم کیونکر کھا سکتا ہے کتاب ہے  
 کہ زہر کچھ تیرے ملنے کی قسم نہیں ہے کہ اس کو کھا نہ سکوں مگر چونکہ وہ ملتا نہیں اس لئے  
 نہیں کھا سکتا (از یادگار غائب)

### غزل

ہم سے کھل جاؤ بوقتِ پرتی ایک دن ورنہ ہم چھپیں گے رکھ کر عذرِ مستی ایک دن

فرماتے ہیں۔ شرابخواری کے وقت کسی دن ہم سے بے تکلف ہو جاؤ، اگر ایسا نہ کرو گے تو ہم تمہیں کسی دن پھیریں گے۔

غزوة اوج بنائے عالم امکاں نہ ہو۔ ان بندی کے نصیبوں میں پستی ایک دن فرماتے ہیں۔ اس دنیا کی ترقی کے اس قدر فریفتہ نہ ہو۔ اس بندی کی قسمت میں پستی لکھی ہوئی ہے۔ یعنی ایک دن قیامت آتی ہے۔

قرض کی پتے تھے تے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں رنگ لائے گی ہماری فاقہ سستی ایک دن مرزا صاحب کے اس شعر کی نسبت یہ روایت مشہور ہے کہ سترہ دس پہلے مرزا صاحب پر کسی دوکاندار نے قیمت شراب کی بابت ناش وائز کر دی تھی۔ مقدم مفتی صدر الدین خاں صاحب صدر الصدور کی عدالت میں پیش ہوا۔ جواب دعوئی میں میرزا صاحب نے یہ شعر فی البدیہہ کہہ کر پڑھ دیا۔ مفتی صاحب نے مدعی کو روپے اپنے پاس سے دیدے اور مرزا صاحب کو عدالت سے رخصت کر دیا۔

نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانئے بے صدا ہو جائیگا یہ ساز سستی ایک دن فرماتے ہیں۔ نغمہ شادی اور نغمہ غم دنیا میں تو ام ہیں۔ کبھی غم ہے تو کبھی شادی اور ساز سستی کی یہ دونوں صدائیں ہیں۔ ساز سستی کے مٹ جانے سے پہلے دونوں کو غنیمت سمجھنا چاہئے۔ مطلب یہ ہے کہ غم کے بعد شادی لازمی ہے۔

دھول دھتیا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پشید سستی ایک دن فرماتے ہیں۔ اس بے تکلفی کے مذاق میں پہل ہماری طرف سے ہوئی تھی۔

### غزل

ہم پر جھائے ترک فاکاں نہیں اک چھیڑ ہے وگرنہ مراد استحاں نہیں فرماتے ہیں۔ ہم پر ان کو یہ گمان نہیں ہے کہ جھاسے ڈر کر وفا ترک کر دیں گے، ان کی جھانیں صرف ہمیں چھیڑنے کی غرض سے ہیں۔ ان سے استحان وفا مراد نہیں ہے۔

کس مُنہ سے شکر کیجئے اس لطفِ خاص کا پرسش ہے اور پائے سخنِ دریاں نہیں فرماتے ہیں۔ اس کی نگاہِ لطف کا کس مُنہ سے شکر کیجئے۔ یعنی نگاہِ لطف پر پرسش حال تو کرتی ہے مگر زبان سے یہ حال نہیں پوچھا جاتا۔

ہم کو ستمِ عزیزِ استمگر کو ہم عزیزِ نامہرباں نہیں ہے اگر مہرباں نہیں فرماتے ہیں۔ ہم کو شکر اس نے عزیز ہے کہ اس کا ستم تو تیرا داشت کے موافق ہوتا ہے۔ ایسا ظلم وہ نہیں کرتا کہ جس سے ہم جاں لب بوجائیں یا اپنی جان سے گزر جائیں۔ اس واسطے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہم بھی اس شکر کو عزیز نہ ہوتے تو ستم سے وہ ہماری حیاں لے لیتا۔ اس یہاں سے یہ ثابت ہو گیا کہ وہ یعنی وہ شکر اگر ہم پر مہربان نہیں ہے تو نامہربان بھی نہیں ہے۔

بوسہ نہیں نہ دیکھئے دشنام ہی سہی آخر زباں تو رکھتے ہو تم گردباں نہیں فرماتے ہیں۔ اگر بوسہ دہی دینے میں تم کو یہ عذر ہے کہ میرا دہی معدوم ہے میں بوسہ کیونکر دوں۔ تو نہ دو۔ میں تمھارے اس عذر کو تسلیم کرتا ہوں لیکن گالی تو مجھے دو اس لئے کہ زباں تو تم رکھتے ہو۔ گالی دینے میں کیوں عذر کرتے ہو ہے یہ مثل کہ بھول نہیں چکھڑی سہی۔

### قطعہ

ہر چند جانگدازیِ قہر و عتاب ہے ہر چند پشتِ گرمیِ تاب و تواں نہیں باوجود کیا اس کا قہر و عتاب میری جان کو گھٹلا رہا ہے اور باوجود اس کے کہ تاب و طاقت نے مجھ کو جواب دے دیا ہے۔

جانِ مُطربِ ترانہ اہلِ سنِ مزید ہے لب پر وہ سنجِ زمزمہِ الاماں نہیں فرماتے ہیں۔ اس پر بھی میری جان زار یہی تقاضے کر رہی ہے کہ اور کوئی کُظلم و ستم باقی رہ گیا ہو تو اس کو بھی کام میں لے کر آنا چاہئے۔ میں تو اب بھی یعنی اس صورت میں بھی



اماں کا خواہشمند نہیں ہوں۔

خنجر سے چیر سینہ اگر دل نہ ہو دو نیم دل میں چھری چھو مڑا گر خونچکاں نہیں  
 فرماتے ہیں۔ اگر دل دو نیم نہ ہو تو خنجر سے دل کے دو ٹکڑے کر دے اور اگر مڑگاں خونچکاں  
 نہ ہو تو عشق کی چھری سے دل کو زخمی کر دے تاکہ مڑگاں خونچکاں ہو جائے اور یہ دونوں  
 مزے عاشق کو محال ہو جائیں۔

ہے ننگ سینہ دل اگر آتشکدہ نہ ہو ہے عارہ دل نفس اگر آذر شاں نہیں  
 فرماتے ہیں۔ وہ سینہ ہی کیا ہے جس سینہ میں دل سوزاں نہ ہو اور وہ دل ہی کیا ہے جس کا  
 نفس آتش فشاں نہ ہو۔

نقصاں نہیں جنوں میں بلا سے ہو گھر خراب سو گز زمین کے بدلے بیاباں گراں نہیں  
 فرماتے ہیں۔ جنوں نقصاں دینے والی چیز نہیں ہے اگر گھر سے نکل جانے کے بعد گھر خراب  
 ہو جائے گا تو بلا سے ہو جائے۔ گھر میں زیادہ سے زیادہ سو گز زمین کے بدلے اتنا بڑا  
 جنگل پختہ آتا ہے یہ کیا منگنا ہے۔ عالم وشت میں سر بسجود اٹھل جانا چاہئے۔

کہتے ہو کیا لکھا ہے تری سرفروخت میں گویا جبین پہ سجدہ بُت کا نشان نہیں  
 فرماتے ہیں۔ یہ کیا سوال کرتے ہو کہ تیرا نوشتہ تقدیر کیا ہے۔ اس سوال سے تو یہ پایا گیا  
 گویا سیری جبین پہ سجدہ بُت کا نشان نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میرے ماتھے پر سجدہ  
 بُت کا گٹھ نظر آ رہا ہے اور یہی میرا نوشتہ قسمت ہے۔

پاتا ہوں اس سے داؤ کچھ اپنے کلام کی روح القدس اگرچہ مرا ہنر پاں نہیں  
 یہاں ہنر پاں کے لفظ میں ابہام ہے۔ ظاہری معنی تو یہی ہیں کہ انسان اور فرشتہ کی زبان  
 ایک نہیں ہو سکتی اور پردہ اس میں یہ اشارہ ہے کہ جیسی فصیح سیری زبان ہے ویسی  
 روح القدس کی نہیں (از یاد نگار غائب)

جاں ہے بہار بوسہ و لے کیوں کئے ابھی غائب کو جانتا ہے کہ وہ نیمجاں نہیں

فرماتے ہیں۔ یہ بات تو مسلّمہ ہے کہ بوسہ کی قیمت جان ہے۔ لیکن وہ ابھی اس بات کو کیوں ظاہر کرے گا وہ تو ابھی تک غائب کو یہی جانتا ہے کہ وہ نیم جاں نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس وقت وہ یہ سمجھ لے گا کہ غائب نیم جاں ہو گیا اُس وقت بوسہ کی قیمت میں جان طلب کرے گا۔ مگر غائب جان دے کر بوسہ نہ خرید سکے۔

### غزل

مانع دشت نور دی کوئی تدبیر نہیں ایک چکر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں  
اسی مطلب کو جو پہلے مصرعہ میں بیان ہو چکا ہے۔ دوسرے مصرعے میں نئے رنگ سے کس خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ دشت نور دی کے مانع کوئی تدبیر نہ ہوتی اس کو اس طرح ادا کرنا کہ پاؤں میں چکر ہے مگر زنجیر نہیں کمال بلاغت ہے۔

شوق اس دشت میں لڑنے لگے جھگڑے جادہ غیر از نگہ دیدہ تصویر نہیں  
فرماتے ہیں۔ شوق عرفان مجھ کو اس دیرانہ کی طرٹ کھینچ کر لے چلا ہے جہاں جادہ یعنی بیشا نگاہ دیدہ تصویر کی طرح سدوم ہے۔ گویا اس رستہ پر قدم رکھ کر ہر شخص کو حیرانی پیدا ہو جاتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ عرفان الہی کی منزل ایسی کنٹھن ہے کہ جہاں انسان سڑا حیرت ہی جاتا ہے۔

حسرت لذت آزار رہی جاتی ہے جادہ راہ وفا جز دم شمشیر نہیں  
جادہ۔ یعنی بیشا کو دم شمشیر سے تشبیہ دی ہے۔ مطلب شعر کا یہ ہے کہ عشق کے آزار اور محکیت میں جو لذت ہے جی تو یہی چاہتا ہے کہ اس لذت سے دل کھول کر متنع ہوں مگر چونکہ وفا کی راہ سراسر تلوار کی دھار پر ہے اس لئے پہلے ہی قدم پر موت آتی ہے پس افسوس ہے کہ لذت آزار کی حسرت دل کی دل ہی میں رہی جاتی ہے اور یاد کا غائب رنجِ نو میدیِ حبا وید گوارا رہیو! خوش ہوں گزنا زبونی کش تاثیر نہیں  
فرماتے ہیں۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نا اُمیدی کا رنج مجھ کو گوارا ہے مینی میں اس بات سے

بہت خوش ہوں۔ اگر میرا نالہ تاثیر کاشت پذیر نہیں ہے۔ مطلب شعر کا یہ ہے کہ میرزا صاحب بمقابلہ یاس و نا اُمیدی کے فریاد کی مدد سے کامیابی حاصل ہونے میں ذلت اور ہنگامہ سمجھتے ہیں۔ اور ایسی کامیابی کے مقابلہ میں اپنے غم دوست ہونے پر فخر ظاہر کرتے ہیں۔

سر کھجاتا ہے جہاں زخم سراپتھا ہو جائے لذتِ سنگ باندازہٴ تفتیر نہیں فرماتے ہیں۔ یہ زخم سر میں وقت اچھا ہو جاتا ہے پھر سر میں کھجلی ہوتی شروع ہو جاتی ہے۔ پھر کھانے کا مزا احاطہٴ تقریر سے باہر ہے لطف اس شعر میں یہ ہے کہ ہمیشہ اند مال زخم کے بعد زخم میں کھجلی ہوتی ہے۔ اس کو میرزا صاحب نے دوبارہ زخم کھانے کے شوق سے تعبیر کیا ہے۔

جب کرمِ رخصتِ یبا کی دگستاخی دے کوئی تقصیر نہ خجالتِ تقصیر نہیں فرماتے ہیں۔ جب دوست کی عنایت گستاخی دے باکی کی اجازت دے تو اس وقت ارتکابِ گناہ میں جھگکنے سے زیادہ کوئی گناہ نہیں۔

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخ آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ تیر نہیں اس مقلع کا مصرعہ ثانی ناسخ کی تصنیف ہے۔ میرزا صاحب نے اُس پر مصرعہ لگا کر اتفاق رائے ظاہر کیا ہے۔

مردِ مدمک دیدہ میں کجھو نہ نگاہیں ہیں جمع سویدائے دل چشم میں آہیں فرماتے ہیں۔ آنکھ کی پتلی میں یہ نگاہیں نہ سمجھو۔ یعنی یہ نگاہیں نہیں ہیں۔ بلکہ نگاہوں کی جگہ (دلِ چشم میں) یعنی آنکھ کے بیچ میں آہیں جمع ہو گئی ہیں۔ سویدہ اس سیاہ نقطہ کا نام ہے جو دل پر ایک خال کی صورت میں ہوتا ہے۔ مطلب شعر کا یہ ہے کہ میری آنکھ کے تل میں یہ نگاہیں نہیں ہیں بلکہ دلِ چشم میں آہیں ہیں۔ یعنی میری آنکھیں اور نگاہیں دونوں مسرت آلود ہیں۔

## غزل

برنگال دیدہ عاشق ہے دیکھا چاہئے کھل گئی مانند گل سو جا سے دیوار چین  
 فرماتے ہیں۔ دیدہ عاشق کی برسات دیکھنے کے قابل ہے۔ پھول کی طرح سے دیوار  
 چین کھل گئی (شق ہو گئی) جب دیوار چین پھولوں کی طرح سے کھلی ہے تو کثرت غنیمت و  
 گل عمر پر عاشق کے اثر سے دیکھنا چاہئے کہ کس حد تک پہنچتی ہے۔

اکفیت گل سے غلط ہو دعویٰ وارستگی! سرو ہے باوصف آزادی گرفتار چین  
 فرماتے ہیں۔ کیسا ہی کوئی آزاد و وارستہ مزاج ہو، دنیا میں اگر عشق و محبت کے بھندے  
 سے نہیں نکل سکتا اور اس کی مثال یہ پیش کرتے ہیں کہ سرو آزاد باوصف آزادی گرفتار  
 چین ہے (ایک قسم کا سرو ہوتا ہے جس کو سرو آزاد کہتے ہیں۔

## غزل

عشق تاثیر سے نوید نہیں جلاںِ سیاری شجرِ بید نہیں  
 فرماتے ہیں۔ عاشق تاثیر سے ناامید نہیں ہے۔ جانبدازی بید کا درخت نہیں جو شجر  
 سے محروم رہے۔ مطلب یہ ہے کہ عشق اگر صادق ہے تو اثر سے محروم رہ نہیں سکتا۔  
 سلطنت دستِ بدست آتی ہے جامِ نئے خاتمِ جمشید نہیں  
 فرماتے ہیں۔ سلطنت و صلتی پھرتی چھاؤں کا حکم رکھتی ہے۔ ایک خاندان سے دوسرے  
 خاندان میں منتقل ہو جاتی ہے۔ جمشید سے ہاتھوں ہاتھ رندوں تک پہنچ گئی ہے۔ گویا  
 جامِ نئے کی طرح ایک سے دوسرے کو پہنچتی ہے۔ خاتمِ جمشید نہیں کہ جو دوسرے کے  
 پاس آہی نہیں سکتی۔ مطلب یہ ہے کہ جمشید کے پاس جامِ جم تھا جس میں شراب پئی  
 جاتی تھی۔ اس کے مستحق رندوں کے سوا اور لوگ نہیں قرار پاسکتے۔

ہے جھلی تری سامانِ وجود ذرہ بے پروا خورشید نہیں  
 اس شعر میں مرزا صاحب اللہ تعالیٰ سے مخاطب ہو کر عرض کرتے ہیں کہ تیری جھلی وجود

عالم کا سبب ہے جس طرح آفتاب کا طلوع باعثِ ظہورِ قذرات ہے۔

رازِ مشوق نہ کرسوا ہو جائے ورنہ مرجائے میں کچھ بھید نہیں

بھید کے معنی پوشیدہ بات کے ہیں۔ خواہ پوشیدہ مصلحت ہو اور خواہ پوشیدہ قیامت ہو۔ یہاں پوشیدہ قیامت مراد ہے۔ اگر مرجائے کی جگہ نہ مرنے کا لفظ ہوتا تو بھید کے معنی پوشیدہ مصلحت کے ہو جاتے۔ (ازیادگار غائب)

گردشِ رنگِ طرب سے ڈر ہے غمِ محسوس کی جاوید نہیں

فرماتے ہیں۔ رنگِ طرب کے منقلب ہو جانے کا خوف ہے ورنہ محسوس کی جاوید کا غم نہیں ہے مطلب یہ ہے کہ جب انسان زمانہ اقبالِ مندی کے بعد کسی سبب سے مفلس و بے زر ہو جاتا ہے تو اس کو بہ نسبت محتاج آدمیوں کے زیادہ صدمہ اور رنج پہنچتا ہے اگر انسان اول ہی سے محتاج ہوتا ہے تو اس کو بے زری کا اتنا صدمہ نہیں ہوتا۔

کہتے ہیں جیتے ہیں اُمید پر لوگ ہم کو جینے کی بھی اُمید نہیں

یہ شعر سہلِ مستح ہے۔ اس زمین میں اس سے بہتر شعر نکالنا مشکل ہے (ازیادگار غائب) مطلب یہ ہے کہ اُمید خرابِ زندگی ہے اور جب کوئی اُمید نہیں ہے تو زندگی سے نا اُمید ہونا ہی لازمی ہے۔

### غزل

جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں خیاباںِ خیاباں اِرم دیکھتے ہیں  
فرماتے ہیں۔ جس جگہ زمین پر ہم تیرے نقشِ قدم کو دیکھ لیتے ہیں۔ ہم کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ گو ہشتوں کا سامنا ہو گیا۔

دلِ آشفٹِ گلِ خالِ گنجِ دہن کے سویا میں سیرِ عدم دیکھتے ہیں  
شعر دہن و کمرِ مشوق کو عدم سے تعبیر کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں جو لوگ دہن بے نشان

پر عاشق ہو گئے ہیں وہ اپنے سویدائے دل میں عدم کا تماشا دیکھ رہے ہیں۔  
 ترے سرو قیامت سے اک قد آدم قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں  
 اس کے ایک منہ تو یہی ہیں کہ سرو قیامت سے فتنہ قیامت کتر ہے اور دوسرے منہ  
 یہ بھی ہیں کہ تیرا قد اسی میں سے بنایا گیا ہے اس لئے وہ ایک قد آدم کم ہو گیا ہے  
 (از یادگار غالب)

تماشا کر اے محو آئینہ داری تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں  
 فرماتے ہیں سائے محو آئینہ داری تو ذرا یہ تماشا تو دیکھ کہ ہم تجھ کو کس آرزو کے  
 ساتھ دیکھ رہے ہیں یہ خطاب مشوق کی طرف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تو آئینہ دیکھنے میں  
 ایسا محو ہو گیا ہے کہ ہماری تمنا سے دیکھنے کا بھی تماشا نہیں دیکھتا۔

سُراغِ ثُغْبِ نالہ دارغِ دل ہے کہ شبر و کا نقش قدم دیکھتے ہیں  
 اس شعر میں میرزا صاحب نالہ کشی کے وقت کو رات کا وقت قرار دیتے ہیں اسی وجہ  
 سے نالے کو شبر و لکھا ہے۔ فرماتے ہیں جس طرح رات کے آنے جانے والوں کا نقش  
 قدم صبح کو دیکھ کر پتہ چل جاتا ہے کہ فلاں سمت سے کوئی شخص آیا اور فلاں سمت کو چلا  
 گیا اسی طرح دلغِ دل سے نالہ شب کی گرمی و سوز کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب تماشا لے اہل کرم دیکھتے ہیں  
 فرماتے ہیں۔ اسے غالب ہم فقیروں کا بھیس بدل کر اہل کرم کی خلوص نیت کا امتحان  
 لیتے ہیں۔ کچھ خدا خواستہ ہم کو احتیاج سوال نہیں ہے۔

### غزل

ملتی ہے خوئے یار سے نار التہاب میں کافر ہوں گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں  
 فرماتے ہیں۔ آگ اپنی گرمی کی وجہ سے یار کی عادت سے ملنے لگی ہے یعنی بات بات  
 پر چلا نا۔ غصہ سے آگ بھوکا بن جانا یہ خاص میرے مشوق کی عادت ہے اور آگ

میں بھی یہ خاصیتیں پائی جاتی ہیں۔ اس لئے عذابِ نار میرے واسطے لذتِ وہ ثابت ہوا ہے۔

کب سے ہوں کیا بتاؤں جہانِ خواب میں شبہائے ہجر کو بھی رکھوں گہ حساب میں فرماتے ہیں۔ میں اپنی عمر کا ٹھیک اندازہ نہیں بتا سکتا۔ بہت سی ہجرتیں ایسی بسر کر چکا ہوں جن میں کی ایک ایک رات ہزار ہزار برس کے برابر تھی۔ اگر ان سب راتوں کو شمار میں لاؤں اور ان کا حساب لگاؤں تو اتنے برس سے جی رہا ہوں کہ وہ گنتی ہی میں نہیں آسکتے۔

تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر آنے کا وعدہ کر گئے آئے جو خواب میں فرماتے ہیں۔ حالتِ انتظار میں یہ کچھ کر کہہ کر اب وہ نہ آئیں گے۔ بد قسمتی سے ہماری آنکھ لگ گئی تھی۔ وہ خواب میں تشریف لائے اور اپنے وعدہ پر آنے کا وعدہ کر گئے، یعنی یہ کہ گئے کہ تو ہمارا منتظر رہ ہم ضرور آئیں گے اور یہ وعدہ اس واسطے انھوں نے کیا کہ ہم کو زندگی بھر بھر دوبارہ نیند نہ آجائے۔

قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں دوسرے مصرعہ میں بطور طنز کے کہا ہے کہ جو کچھ وہ جواب میں لکھیں گے۔ مجھے معلوم ہے یعنی وہ کچھ نہیں لکھیں گے اس لئے قاصد کے واپس آنے سے پہلے ایک اور خط لکھ رکھوں (از یادگار غالب)

مجھ تک کب انکی بزم میں آتا تھا دورِ جام ساقی نے کچھ ملانہ دیا ہو شراب میں اس شعر میں پہلے مصرعہ کے بعد اتنا جملہ محذوف ہے (پھر آج جو خلعتِ عادتِ جام کی نوبت مجھ تک پہنچی ہے) اس محذوف نے شعر کا رتبہ بہت بلند کر دیا ہے۔ ایسا محذوف جس پر قرینہ دلالت کرتا ہو اور جو الفاظ محذوف کئے گئے ہیں وہ بغور ذکر کے دونوں مصرعوں میں بول رہے ہیں محسناتِ شعر میں شمار کیا جاتا ہے۔ (از یادگار غالب)

جو منکر و فاجر ہو فریب اس پہ کیا چلے کیوں بدگمان ہوں دوست سے دشمن کی بابیں  
 فرماتے ہیں۔ جو شخص دفا کے وجود ہی سے منکر ہو اس پر فریب دفا کیونکر چل سکتا ہے۔ میں  
 کیوں دوست سے بدگمان ہوں دشمن کے باب میں۔ مطلب شعر کا یہ ہے کہ میرا دوست  
 منکر و فاجر ہے اس پر غیر کا فریب دفا نہیں چل سکتا۔ میں دشمن کے باب میں دوست  
 سے کیوں بدگمان ہوں کہ یہ فریب دفا کے دشمن میں مبتلا ہو گیا ہے۔

میں مضطرب تھیں وصل میں خوفِ قریب کے ڈالا ہے تم کو وہم نے کس بیچ و تاب میں  
 فرماتے ہیں۔ میں تو وصل میں اس وجہ سے مضطرب ہوں کہ کہیں تمھارا دوسرا ملنے والا یعنی میرا  
 قریب نہ آجائے۔ تم کو شاید اس وہم کی وجہ سے بیچ و تاب ہے کہ اس کا کوئی دوسرا  
 مشوق میرے علاوہ ہے اور یہ اس سے چھپ کر میرے پاس آیا ہے اس لئے  
 گھبرایا ہوا ہے۔

میں اور خطِ وصلِ خدا ساز بات ہے جان نذر دینی بھول گیا اضطراب میں  
 خط وصل وہ خط جس میں وصل کا وعدہ تحریر ہو۔ فرماتے ہیں۔ میری یہ قسمت کہ وہ مجھے  
 خط میں وصل کا وعدہ لکھ کر بھیجے۔ معلوم ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے میری بات بنادی۔  
 اس خط پر مجھے جان قربان کر دینی چاہئے۔ یہ بات میں جوشِ خروشی میں بھول گیا۔  
 ہے تیوری چڑھی ہوئی اندر نقاب کے ہے اک شکن پڑی ہوئی طرفِ نقاب میں  
 فرماتے ہیں۔ نقاب کے اندر بھی غصہ سے اس کی تیوری چڑھی ہوئی ہے اور اس کا غصہ  
 اس غضب کا ہے کہ اس غصہ کا اثر نقاب پر بھی ہو گیا ہے یعنی تیوری کے مقام پر نقاب  
 میں شکن واقع ہو گئی۔

لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں  
 یہاں لگاؤ سے مراد لگاؤٹ ہے۔ یعنی مشوق کا عاشق کے ساتھ ایسا برتاؤ کرنا جس سے  
 اُس کا التفات اور میلان طبع پایا جائے۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ دوست کی لاکھوں



لگاؤ میں ایک طرف اور ایک نگاہ کا چڑھنا ایک طرف اور اس کے لاکھوں بناؤ سنگھار  
ایک طرف اور ایک عتاب میں بگڑنا ایک طرف۔ یہ شعر بھی سہل مستح ہے۔ اگر الفاظ کی  
طرف دیکھیے تو تعجب ہوتا ہے کہ کیونکر ایسے دو ہم پلہ مصرعے ہم پہنچ گئے جس میں محسوس  
ترسیع کا پورا پورا حق ادا کیا گیا ہے اور اگر معنی پر نظر کیجئے تو ہر ایک مصرعہ میں ایک ایسا  
معاملہ بانٹھا گیا ہے جو فی الواقع عاشق و معشوق کے درمیان ہمیشہ گزرتا رہتا ہے۔  
معشوق کی لگاؤٹ عاشق کے لئے بہت بڑی چیز ہے اور اس کا آنکھ پڑنا جو لگاؤٹ  
کی ضد ہے وہ عاشق کی نظر میں لگاؤٹ سے بہت زیادہ دلفریب اور دل آویز ہوتا  
ہے اسی طرح بناؤ سنگھار سے معشوق کا محسوس بیشک دوبا ہوتا ہے مگر اس کا غصہ  
میں بگڑنا اس کے بناؤ سے بہت زیادہ خوشنما اور دل ربا معلوم ہوتا ہے۔ اس شعر کے  
متعلق یہ سب ظاہری اور اوپری باتیں ہیں جو ہم گھور رہے ہیں۔ اس کی اصل خوبی و بدانی  
ہے جس کو صاحب ذوق کے سوا کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ ایک روز مولانا آزاد وہ مرحوم کے  
روبرو کسی نے یہ شعر پڑھا۔ چونکہ مولانا نہایت صاف اور سرخی الفہم اشعار کو پسند  
کرتے تھے اس لئے میرزا کا کلام سن کر اکثر اُٹھتے تھے اور ان کی طرز کو ہمیشہ نام رکھتے  
تھے مگر اس روز اس شعر کو سن کر وجد کرنے لگے اور تعجب ہو کر پوچھا کہ یہ کس کا شعر ہے۔  
کہا گیا کہ مرزا غالب کا۔ چونکہ وہ مرزا کے شعر کی کبھی تعریف نہیں کرتے تھے اور اس روز  
لا علمی میں بیساختہ اُن کے منہ سے تعریف نکل گئی تھی۔ غالب کا نام سن کر بطور مزاح کے  
جیسی کہ ان کی عادت تھی فرمایا اس میں میرزا کی کیا تعریف ہے۔ یہ تو خاص ہماری طرز کا  
شعر ہے مگر فی الحقیقت یہ شعر بھی معنًا و لفظًا ویسا ہی اچھوتا اور نرالا ہے جیسا کہ مرزا کا  
تمام کلام کسی کے کلام سے سیل نہیں کھاتا۔ جہاں تک کہ ہم کو معلوم ہے یہ اسلوب بیان  
آج تک اس عمدگی کے ساتھ کسی کے کلام میں نہیں دیکھا گیا۔ (از یادگار غالب)  
وہ نالہ دل میں خُس کی برابر جگہ نہ پائے جس نالہ سے شگاف پڑے آنکھ میں

فرا تے ہیں۔ بڑے تعجب کی بات ہے۔ وہ نامہ دل مشوق میں ایک پھانسی کے برابر بھی جگہ نہیں پا سکا جس نامہ سے آفتاب میں دلاڑ کھاتی ہے۔

وہ سحر مدعا طلبی میں نہ کام آئے جس سحر سے سفینہ رواں ہو سرباب میں فرا تے ہیں۔ وہ جادو مدعا طلبی میں مشوق کے دل میں فداک کھام نہیں دیتا جس جادو سے کشتی سرباب میں رواں ہو جاتی ہے (سرباب) یعنی چکنے والا ریت کا دریا جس پر وہ سے پانی کا دھوکا ہوتا ہے۔

غائب چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی پیتا ہوں روزا بر و شب ماہتاب میں سنا جا سکتا ہے کہ شراب ابر و باران کے دن یا شب ماہتاب میں زیادہ لطف دیتی ہے۔ میرزا صاحب فراتے ہیں کہ شراب چھوڑ دینے کے بعد بھی ان دونوں مرقعوں پر مٹنی ابر کے دن اور چاندنی رات میں بے پناہی سے رہا نہیں جاتا۔

کل کے لئے کمر آج نہ خست شراب میں یہ سوئے نکلن ہے ساتی کوثر کے باب میں فراتے ہیں۔ کل یعنی فردائے قیامت کے لئے آج شراب دینے میں خست نہ کر (مشرور ہے کہ جو دنیا میں شراب پئے گا وہ آخرت میں شراب طہورنی سے محروم رہے گا) بھجنا کہ ساتی کوثر شراب طہورنی نہ دیں گے یہ بات ساتی کوثر کی فیاضی پر سوئے نکلن ہے۔ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا یعنی وہ اب بھی ضرور لے گی۔

میں آج کیوں فہیل کہ کل تک تھی پسند گستاخی فرشتہ ہماری جناب میں اس کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ مشوق کو تو ہماری خاطر ایسی عزیز تھی کہ اگر بالفرض فرشتہ بھی ہماری نسبت کوئی گستاخی کرتا تو اس کو گوارہ نہ ہوتی اور یا اب ہم کو بالکل نظر سے گرا دیا گیا ہے اور دوسرے عمدہ معنی یہ ہیں کہ اس شعر میں آدم عموماً فرشتوں کے اس قصہ کی طرف اشارہ ہے جو قرآن مجید میں مذکور ہے کہ جب خدا تعالیٰ نے آدم کو پیدا کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تو فرشتوں نے کہا کیا تو دنیا میں اس شخص یعنی اُس نوع کو پیدا کرنا چاہتا

ہے جو اس میں فساد اور خونریزی کرے وہاں سے ارشاد ہوا کہ تم نہیں جانتے ہو جو کچھ میں جانتا ہوں اور پھر آدم سے ان کی ترک دلوائی اور حکم ہوا کہ آدمؑ کو سجدہ کریں کہتا ہے کہ ہم آج دُنیا میں کیوں اس قدر ذلیل ہیں کھل تک تو ہماری ایسی عزت دی (از یادگار غالب)

جاں کیوں نکلنے لگتی ہے تن سے دمِ سماعِ گروہ صداسمائی ہے جنگ و رباب میں فراتے ہیں۔ کائنات سن کر جان کیوں جسم سے نکلنے لگتی ہے یعنی ایسی حالت کیوں طاری ہو جاتی ہے کہ جو تڑپا دیتی ہے۔ اگر وہ صدایمنی شاہِ حق کی آواز جنگ و رباب میں سمائی ہوئی ہے تو اس سے جان بخشی کا فعل کیوں سرزد نہیں ہوتا۔

کہو میں ہے رخسِ عمر کہاں دیکھئے تھمے نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پاپے رکاب میں سوار کی بے اختیاری اور گھوڑے کا اُس کے اختیار سے باہر ہونا چاہک سواروں کی زبان میں اس سے بہتر بیان نہیں ہو سکتا اور عمر کو ایسے بے قابو گھوڑے سے تشبیہ دینی کسی تشبیہ کا حق ادا کر دینا ہے (از یادگار غالب)

اتنا ہی مجھ کو اپنی حقیقت کے بعد ہے جتنا کہ وہمِ غیر سے ہوں پیچ و تاب میں غیر سے یہاں ماسوائے اللہ مراد ہے جو صوفیہ کے نزدیک بالکل معدوم ہے اس لئے کہ وجود واحد کے سوا سب کو معدوم سمجھتے ہیں۔ کہتا ہے کہ جس قدر وجود ماسوا کے وہم سے رات دن پیچ و تاب رہتا ہوں اتنا ہی مجھے اپنی حقیقت یعنی وجود واجب سے بعد ہے (از یادگار غالب)

اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے حیرانِ محفلِ پیرِ شاہد ہے کس حساب میں ساکب کو تمام موجوداتِ عالم میں حق ہی حق نظر آئے اس کو مشہود کہتے ہیں۔ شاہد کے معنی ہیں دیکھنے والے کے اور مشہود اس کو کہتے ہیں جس کو دیکھا جائے۔ میرزا صاحب فراتے ہیں، شہود و شاہد و مشہود کی اصل ایک ہی ہے۔ مجھ کو حیرت ہے کہ جب یہ تینوں

چیزیں ایک ہیں تو مشاہدہ کس حساب میں داخل ہے۔

ہے مثل نمود و صورت پر وجود بحر یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و جناب میں  
و مدت وجود اور کثرت مہم کی تشیل ہے۔ قطرہ و موج و جناب کے بیچ و ناچیز جو کہ  
ایک عام محاورہ میں اس طرح ادا کرنا کہ یہاں کیا دھرا ہے منہائے بلاغت ہے۔  
(از یادگار غالب)

شرم اک ادائے ناز ہے اپنے ہی سے سہی ہیں کتنے بے حجاب کہ ہیں روں حجاب میں  
فراتے ہیں۔ شرم اک ادائے ناز مشوقانہ ہے۔ اگر اپنی ذات سے بھی ہے تو بھی اس کو  
ادائے مشوقانہ ہی کہا جائے گا لیکن اس کا استعمال ہمیشہ بے حجابی کے موقع پر ہوگا۔  
یعنی حجاب کی حالت میں ادائے ناز برقی نہیں جاسکتی اور جس حالت میں اس کا  
استعمال روا رکھا گیا ہے۔ تو وہ حجاب عین بے حجابی ہے۔ یہ شعر بھی تصوف میں ہے۔  
مطلب شعر کا یہ ہے کہ یہ حجاب جو نظر آتے ہیں ایسے ہیں کہ جلوہ یا نظر آ رہا ہے۔

آرایش جمال سے فارغ نہیں ہنوز پیش نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں  
نقاب استعارہ ہے حجاب قدس کا اور آئینہ اس میں علم مایکون و ماکان کا حکم رکھتا  
ہے اور آرائش جمال سے فارغ ہونا تفسیر ہے کل یوم ہونی شان کی۔

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود ہیں خواب میں ہنوز جو حالے ہیں خواب میں  
سائل کو تمام موجودات عالم میں حق ہی حق نظر آئے اس کو شہود کہتے ہیں اور غیب غیب  
سے مراد مرتبہ احدیت ذات ہے جو عقل و ادراک و بصیرت سے درامداد ہے۔ کتاب ہے  
جس کو ہم شہود سمجھتے ہوئے ہیں وہ درحقیقت غیب غیب ہے اور اس کو غلطی سے  
شہود سمجھتے ہیں، ہماری ایسی مثال ہے جیسے کوئی خواب میں دیکھے کہ میں جاگتا ہوں  
پس گروہ اپنے تئیں بیدار سمجھتا ہے مگر فی الحقیقت وہ ابھی خواب ہی میں ہے۔ یہ  
مثال بالکل نئی ہے اور اس سے بہتر اس مضمون کے لئے مثال نہیں ہو سکتی۔ (از یادگار غالب)

غالب ندیم دوست آتی ہے بود دوست مشغول ہی ہوں بندگی بود تراب میں  
فرماتے ہیں۔ اسے غالب ندیم دوست سے دوست کی بڑا کیا کرتی ہے اس لئے میں  
حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی محبت کو عبادت تصور کرتا ہوں۔

### غزل

حیران محسوس کو روڈوں کی بیٹوں جگر کو میں مقدر ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں  
فرماتے ہیں۔ دو عزیز مرنے والوں کا ماتم دار اگر ایک شخص ہو تو مرنے والوں کی کسر خان ہے  
ان کے اعزاز میں فرق آتا ہے۔ اس لئے اگر مجھ کو مقدر ہو تو ایک نوحہ گر اپنے ساتھ رکھوں  
یعنی اسے کول کر میں روتا ہوں اور اسے جگر کہہ کر وہ بیٹنا رہے یا ایک کامرانی پڑھوں  
اور ایک کا نوحہ وہ۔

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کہھر کو میں  
فرماتے ہیں۔ رشک نے مجھ کو اس قابل نہیں رکھا ہے کہ کسی غیر سے تیرے مکان کا پتہ  
دریافت کروں اور پتہ نہ ملنے سے اس قدر اضطراب و قلق بڑھ گیا ہے کہ بغیر دریافت  
کئے رہ نہیں سکتا۔ اس لئے ہر راہ گیر سے دریافت کرتا جا رہا ہوں کہ میں کہھر جاؤں۔  
ممکن ہے کہ کوئی مجھ جیسا تیرا طالب مجھ کو مل جائے اور وہ تیرے مکان سے بھی واقف  
ہو اور میرا سفر بھی بن جائے۔

جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار اسے کاش جانتا نہ تری رہنڈر کو میں  
فرماتے ہیں۔ تیرا رستہ رقیب کے گھر کے آگے سے ہو کر ہے اس لئے مجھ کو ہزار ہزار  
مرتبہ رقیب کے دروازے پر ہو کر تیری تلاش میں گزرنا پڑتا ہے کاش میں تیرے  
گھر کے رستہ سے واقف ہوتا۔

ہے کیا جو گنس کے باندھے میری بلاؤں کیا جانتا نہیں ہوں تمہاری مکر کو میں  
فرماتے ہیں۔ تم نے جو میرے ارادہ قتل پر مکر کسی ہے اور یہ کہہ کر ڈرا رہے ہو کہ اب میں تجھ کو

نکل کرتا ہوں۔ اس دھمکی سے میری بلا ڈرتی ہے۔ کیا میں تمہاری مکر کو جانتا نہیں کہ اس سے بارِ شجرہ اُٹھ سکے گا۔

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے۔ یہ جانتا اگر تو نکلتا تا نہ گھر کو میں فرماتے ہیں۔ بواؤ سنو۔ میں نے جن کو خوش کرنے کی غرض سے اپنا تمام مال و زر لٹا دیا۔ اب وہ بھی یہ فرماتے ہیں کہ تو بے ننگ و نام ہے ہم تجھ سے نہیں ملتے۔

چلتا ہوں تھوڑی دُور ہر اک تیز رو کے ساتھ۔ پسپا تا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں طالب راہ خدا کو جو حالتِ ابتہ میں پیش آتی ہے اُس کو اس تخیل میں بیان کیا ہے۔ طالبِ اَدلِ اول جس شخص میں کوئی کرشمہ یا دبدبہ و سماع و جوش و خروش دیکھتا ہے اُسی کے ہاتھ پر بیعت کرنے کا ارادہ کرتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ پھرتا ہے۔ پھر جب کوئی اس سے بڑھ کر نظر آتا ہے تو اس کا تعاقب کرتا ہے (اَلَمْ یَجِدْ) اور وہ اس تہذیب اور تزیّن کی یہی ہوتی ہے کہ وہ کامیاب کو پہچان نہیں سکتا۔ (اور یا بھکارِ غالب)

خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار کیا پوچھتا ہوں اُس بتِ بیدار کو میں اس شر میں خیال نہایت نازک واقع ہوا ہے۔ فرماتے ہیں۔ میں حیران ہوں کہ یہ قوتِ لوگوں نے میری خواہش یعنی طلبِ معشوق کو پرستش قرار دے لیا ہے۔ اسی خیال کے عالم میں دریافت فرماتے ہیں کہ کیا میں اُس کو پوچھتا ہوں۔ خود بدولت کو یہ خبر نہیں ہے کہ اس بیدار کے سامنے جا کر اظہارِ نیاز پرستش کی حد تک پہنچ جاتا ہے۔

پھر بخودی میں بھول گیا راہ کو کسے یار جاتا اگر نہ ایک دن اپنی خبر کو میں فرماتے ہیں۔ بخودی عشق میں گم ہو کر میں اپنے کو بھول گیا ہوں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوچہ یار میں پہنچ کر میرے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا ہے یعنی میں اپنے آپ سے گزر گیا ہوں اور چونکہ اپنے آپ میں نہیں ہوں اس لیے کوچہ یار کے رستہ کو بھی بھول گیا ہوں اب اپنی خبر کو بھی وہاں نہیں جاسکتا۔

اپنے پر کر رہا ہوں قیاس اہل دہر کا سمجھا ہوں دلپذیر متاع ہنر کو میں  
 فرماتے ہیں۔ میں سارے زمانے کو اپنی طرح کا ہنر دوست سمجھ رہا ہوں اور اسی غلطی کی وجہ  
 سے متاع ہنر کو دلپذیر سمجھتا ہوں حالانکہ معاملہ اس کے برعکس ہے یعنی موجودہ زمانہ میں  
 ہنر کو لوگوں نے متاع کا جند سمجھ رکھا ہے۔

غالب خدا کرے کہ سوارِ سمتِ ناز دیکھوں علی بہادرِ عالی گھر کو میں  
 سمندرِ ناز وہ گھوڑا جو ناز و ادا سے زمین پر قدم رکھے۔ باقی شعر کا مطلب صاف ہے۔

### غزل

ذکر میرا بہ بدی بھی اُسے منظور نہیں غیر کی بات بگڑ جائے تو کچھ دور نہیں  
 فرماتے ہیں۔ اُس کو میرے نام سے ایسی نفرت پیدا ہوگئی ہے کہ اگر کوئی شخص اُس کے  
 سامنے مجھے بُرا کہنے کی غرض سے بھی میرا نام لیتا ہے تو وہ اس سے خفا ہو جاتا ہے۔ غیر  
 اس بات کا عادی ہے کہ ہمیشہ اس سے میری بدگوائی کرنا رہتا ہے۔ عجب نہیں کہ اس  
 وجہ سے دشمن میں اور اس میں جگاڑکی صورت پیدا ہو جائے۔

وعدہ سیرِ گلستاں ہے خوش طالع شرفِ خردہ قتلِ مقدّر ہے جو مذکور نہیں  
 فرماتے ہیں۔ بارغ میں میرے واسطے میرے ساتھ چلنے کا اس نے وعدہ کیا ہے۔ اس وعدہ سے  
 میں سمجھ گیا کہ وہ مجھ کو قتل کرے گا۔ میرے یہ نصیب کہاں کہ میں اس کے ہمراہ جا کر تماشا سائے  
 لالہ لعل دیکھوں۔ مطلب شعر کا یہ ہے کہ وہ پھولوں کی قدر کی نگاہوں سے دیکھے گا اور ان کو  
 قریب سمجھ کر رشک سے قتل ہو جاؤں گا۔

شاہِ ہستی مطلق کی کمر ہے عالم لوگ کہتے ہیں کہ ہے پر ہمیں منظور نہیں  
 فرماتے ہیں۔ ہستی کے ساتھ عالم کو اسی طرح کا تعلق ہے جیسا کہ کر کو معشوق کے ساتھ گویا  
 ہے اور نہیں ہے۔ ہم کو یہ بات بھی منظور نہیں کہ عالم ہستی کے ساتھ کربا کی طرح بھی مشروب  
 کیا جائے۔ مطلب یہ ہے کہ عالم کی ہستی برائے نام بھی نہیں ہے۔

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا یکن ہم کو تقلید تنگ ظرفی منصور نہیں  
 فرماتے ہیں ہم بھی وہی قطرہ ہیں جو دریا میں مل کر دریا بن جاتا ہے۔ یعنی فنا فی الذاات  
 ہو جانے کا مرتبہ ہم کو بھی حاصل ہے مگر زبان سے ایسا کہنا منصور کی تقلید سمجھا جائے گا اور  
 ہمیں تنگ ظرفی منصور کی تقلید کرنی منظور نہیں۔

حسرت اے ذوق خرابی کہ وہ طاقت ہی عشق پر عہدہ کی گوں تن رنجور نہیں  
 فرماتے ہیں۔ نگاہ عشق و محبت کی سوزشوں کے لئے زیادہ طاقت کی ضرورت ہے اور ہمارے  
 تن رنجور میں تاب دواں باقی نہیں رہی ہے۔ اس لئے ہم حسرت کو مخاطب کر کے  
 حسرت ویاس کرتے ہیں۔

ہم جو کہتے ہیں کہ ہم لیں گے قیامت میں تمہیں کس رعونت سے وہ کہتے ہیں کہ ہم حور نہیں  
 مشوق کی حاضر جوابی نے اس شعر میں عجیب لطف پیدا کر دیا ہے۔ فرماتے ہیں۔ میں نے جو  
 اس سے یہ کہا کہ تم یہاں تو ہم سے نفرت کرتے ہو اور دور دور رہتے ہو۔ ہم قیامت کے دن  
 انہرے تم کو مانگ لیں گے۔ یہ سن کر نہایت طرور کے ساتھ اُس شوخ نے ہم سے یہ کہہ دیا کہ ہم  
 حور نہیں ہیں جو تم کو مل جائیں گے۔

ظلم کر ظلم اگر لطف در بے آتا ہے تو تغافل میں کسی رنگ سے معذور نہیں  
 فرماتے ہیں مگر تو مجھ کو لطف کے قابل نہیں سمجھتا تو میں تاکید سے کہتا ہوں کہ مجھ پر ظلم کر ظلم۔  
 تغافل تو اُس حالت میں زیبا تھا کہ جب تو ظلم کرنے سے معذور ہوتا۔

صاف دُردی کش سیانہ، حجم ہیں ہم لوگ دائے وہ بادہ جو افشردہ انگور نہیں  
 فرماتے ہیں۔ یہ بات تقلید غم کے خلاف ہے کہ ادنیٰ درجہ کی شراب پی جائے وہ شراب  
 پر نصیب ہے جو انگوری نہ ہو یعنی شراب ناب ہو۔ ہم لوگ ایسی کم رتبہ شراب کو منہ بھی  
 نہیں لگاتے۔

ہوں ظہوری کے مقابل میں خفائی غالب میرے دعوے پر یہ حجت ہے کہ شہسور نہیں



فرماتے ہیں۔ میں ظہوری کے برعکس ہوں۔ اور میرا دعویٰ اس دلیل سے ہے کہ وہ ظہوری تھا اور میں خفائی ہوں۔ یعنی وہ مشہور تھا اور میں مشہور نہیں ہوں اور اس تقابل کا ہونا میرے دعوے پر دلیل ہے۔

### غزل

نالہ جز حسن طلب لے ستم ایجا د نہیں ہے تقاضاے جفا شکوہ بیداد نہیں فرماتے ہیں۔ میرے نالہ کو شکوہ بیداد سے کوئی تعلق نہیں ہے یعنی میں ظلم و ستم کی شکایت میں نالہ کشی نہیں کرتا ہوں بلکہ یہ حسن طلب ہے تقاضاے جفا کا۔ مطلب یہ ہے کہ تم یوں ہم پر ظلم و ستم نہیں کرتے مگر ہمارے نالوں سے تنگ آ کر تو ہم پر جفا کرو گے۔

عشق و مزدوری عشرت گز خسرو کیا خوب ہم کو تسلیم نکو نامی فریاد نہیں فرماتے ہیں۔ مرتبہ عشق سے یہ بات بعید ہے کہ وہ مزدوری کو اپنی کامیابی کا ذریعہ سمجھے یعنی فریاد نہ جو کوہ بے ستون کا مادہ اس غرض سے کاٹا کہ عشرت گاہ خسرواں پتھروں سے تعمیر کیا جائے گا۔ یہ ایک مزدور پیشہ کا کام تھا۔ عشق کی شان اس سے بہت ارفع و اعلیٰ ہے اس لئے ہم کو فریاد کی نیک نامی میں کلام ہے۔ ہم اس کو دفتر عشاق میں نامزد نہیں کر سکتے۔

کم نہیں وہ بھی خرابی میں یہ سست معلوم دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھریا د نہیں فرماتے ہیں۔ ویران ہونے میں میرا گھر بھی صحرا سے کم نہیں تھا مگر اس میں یہ دشت کہاں تھی جو جنگل میں ہے۔

اہل سبب کو ہے طوفانِ حوادث کتبِ طمرہ موج کم از سبیلِ استاد نہیں فرماتے ہیں۔ اہل نظر کے لئے طوفانِ حوادث کتب کا حکم رکھتا ہے۔ موجِ حوادث کے طمانچے سبیلِ استاد سے عبرت کا سبق حاصل کرنے کے لئے کم نہیں۔

دائے محرومی تسلیم و ہذا حال و فنا جانتا ہے کہ ہمیں طاقتِ فریاد نہیں

فرماتے ہیں۔ ہم اپنی عادت تسلیم و دفا کے سبب سے نالہ و فریاد کرنے سے حذر کرتے ہیں لیکن ہمارا معشوق یہ جانتا ہے کہ ہم کو طاقت فریاد نہیں ہے۔ اس سبب سے ہم نے خاموشی اختیار کر رکھی ہے۔ افسوس ہے کہ ہمارے ضبط کی داغ بیل بھی ہم کو نہیں ملتی۔

رنگِ تمکینِ گلِ دلالہ پریشاں کیوں ہے گر چراغانِ سیرِ نگہزِ زیاد نہیں فرماتے ہیں۔ اگر گلِ دلالہ چراغانِ نگہزِ زیاد نہیں ہیں تو ان کا رنگِ تمکین اس قدر بے ثبات کیوں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر ہوا کے مقام پر چراغِ غما کر رکھ دیا جاتا ہے تو وہ جلد بجھ جاتا ہے اور گلِ دلالہ بھی ناپائیدار ہوتے ہیں۔ یعنی پھول ایک دو دن سے زیادہ قیام پذیر نہیں ہوتے۔

سبدِ گل کے تلے بند کرے بے گچیں خردہ اسے مُرخ کہ گلزار میں صیاد نہیں سبدِ گل وہ ٹوکری جس میں گچیں پھول توڑ کر بائیں کر بیچ کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں گل کی ٹوکری کے نیچے گچیں نے بند کیا ہے۔ اسے مُرخ گرفتار تجھ کو مبارک ہو کہ گلزار میں صیاد نہیں۔ اگر وہ ظالم ہوتا تو مُرخ چمن کو گل سے اتار کر بے جا مل نہ ہوتا۔

نفی سے کرتی ہے اثبات تراوش گویا دی ہو جائے دہن اس کو دمِ ایجاد نہیں فرماتے ہیں۔ نہیں سے گویا ہاں تراوش کرتی ہے (نفی سے مراد یہاں لفظ نہیں ہے اور اثبات سے مراد لفظ ہاں ہے۔ ہاں تانیث ہے اس لئے میرزا صاحب نے اثبات کو بھی تانیث لکھا ہے تراوش کے معنی یہاں ظاہر ہونے کے لئے چھ دی ہے جائے دہن اس کو دمِ ایجاد نہیں مطلب یہ ہے 'دہن کو شعرا و معدوم کہتے ہیں۔ اور معشوق کو روزِ ازل میں بچائے دہن کے نہیں کا لفظ عطا ہوا ہے۔ یعنی برات پر معشوق نہیں کہہ دیتا ہے اور نہیں کہہ دینے سے دہن کا ثبوت ملتا ہے۔

کم نہیں جلوہ گری میں تیرے کو چہ بہشتِ یسی نقشہ ہے ولے اس قدر آباد نہیں فرماتے ہیں۔ جلوہ گری میں تیرا کو چہ حورِ بہشت دونوں کا رتبہ مساوی ہے۔ اس کا بھی یہی

نقشہ ہے۔ یعنی وہاں خدا کا دیدار ہوگا تو یہاں تیرا دیدار ہوتا ہے لیکن دونوں میں صرف اتنا فرق ہے کہ وہ تیرے کوچہ کے مقابلہ میں آباد کم ہے۔

کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غائب تم کو بے مہری یارانِ وطن یاد نہیں فرماتے ہیں۔ اے غائب کس منہ سے تم غربت کی شکایت کرتے ہو کیا تم کو بے مہری یارانِ وطن یاد نہیں ہے یعنی مسافرت میں اگر کوئی شخص تنہا رہا پرسان حال نہیں تو وطن میں کون تمہاری بات پوچھتا تھا۔

### غزل

دونوں جہان دیکے وہ سمجھے یہ خوش رہا یاں آپڑی یہ شرم کہ بھرا کیا کریں !  
اپنی فراخ وصلگی اور اس کے ساتھ شرافت نفس کا اظہار ہے یعنی میں جو دونوں جہان  
لے کر خاموش ہو رہا۔ اس کا سبب یہ نہیں تھا کہ میں ان پر قانع ہو گیا۔ بلکہ مجھ کو زیادہ  
مانگنے اور گوارہ کرنے سے خرم آئی اس لئے خاموشی اختیار کی (از یادگار غائب)  
تھک تھک کے ہر مقام پہ دوچار رہ گئے تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں !  
مقام سے منازل سلوک و معرفت مراد ہیں۔ فرماتے ہیں حوصلہ طلب کے موافق ہر منزل پر دوچار  
طلبگار تھک تھک کر ٹھہر ٹھہر گئے تیرا پتہ تو کہیں ملا ہی نہیں۔ ناچار ہو کر ٹھہر نہ جائیں  
تو کیا کریں۔

کیا شمع کے نہیں ہیں ہوا خواہ اہل بزم ہو غم ہی جاگداز تو غمخوار کیا کریں !  
فرماتے ہیں۔ اہل بزم شمع کے ہوا خواہ ہیں۔ یہ اس کا جلتے جلتے فنا ہو جانا کب چاہتے ہیں۔  
اس بیان سے اپنے حال کی تمثیل مراد ہے۔ دوسرے مصرعہ کا یہ مطلب ہے کہ غم عشق ہی  
جاگداز ہو تو ہمارے غمخوار ہماری کیا مدد کر سکتے ہیں۔

### غزل

ہو گئی ہے غیر کی شیریں بیانی کا رگر عشق کا اسکو گلاں ہم بے زبانوں پر نہیں

فرماتے ہیں۔ غیر کی لاف زنی سے وہ یہ سمجھ گیا ہے کہ یہ شخص مجھ پر عاشق ہے اور اس کے سارے دعوے سچے اور درست ہیں۔ ہم بے زبان مہنی کم سخن ہیں ہماری محنت کا اس کو یقین نہیں ہے۔

قیامت ہے کہ کُن لیل کا دشت قیس میں آنا تعجب سے وہ بولایوں بھی ہوتا ہے زمانے میں فرماتے ہیں۔ کیا قیامت ہے کہ دشت قیس میں لیل کا مینا کا نہ چلا آنا کُن کر تعجب سے وہ کہتا ہے کہ بھلا ایسا غضب بھی کیوں زمانے میں ہوتا ہے کہ معشوق شرم و عیا کو بالائے ملحق کر کے عاشق کی پُرسش حال کے لئے اس کے سکھ پر پہنچ جائے۔

دلِ نازک پہ اُس کے رحم آتا ہے مجھے غائب نہ کر سرگرم اُس کا فر کو اُلفت آرنے میں فرماتے ہیں۔ وہ دل کا نازک یعنی پودے دل کا آدمی ہے۔ اسے غائب مجھ کو اس پر رحم آتا ہے اگر تو استہان اُلفت یعنی کھلے آلودہ کرے گا تو کہیں ایسا نہ ہو کہ تیرے جان قربان کر دینے کے بعد اس کا دل اس صدمہ سے تحلیل اُٹھ جائے۔

### غزل

دل لگا کر لگ گیا ان کو بھی تنہا بیٹھنا بارے اپنی بیکسی کی ہم نے پائی وادیاں فرماتے ہیں۔ کسی پر عاشق ہو کر وہ بھی تنہائی پسند ہو گئے۔ ہم نے اپنی بیکسی اور تنہائی کی دلوں کو تنہا ہی میں پالی۔ یعنی ہماری بیکسی کا صبر ان پر بڑھ گیا۔ جو حالت ہماری اسی کے عشق میں تھی وہ حالت ان کی غیر کی محبت میں ہو گئی۔

ہیں نہ وال آلودہ اجزا آفرینش کے تمام مہر گردوں ہے چرخِ رہ گزارِ بادیاں سورج کو اس لحاظ سے کہ وہ بھی اجزائے عالم میں سے ہے اور تمام اجزائے عالم کا وہ نہ وال و فنا ہیں۔ رہ گزارِ باد سے تشبیہ دی ہے جو بالکل نئی تشبیہ ہے (ازید احمد غائب)

### غزل

یہ ہم جو ہجر میں دیوار و در کو دیکھتے ہیں کبھی صبا کو کبھی نامہ بر کو دیکھتے ہیں

فراتے ہیں۔ پھر میں ہم کو خاصہ کا انتظار ہے۔ شاید اس کی طرف سے کوئی مصیب و نحوہ  
پیام یا ہمارے پیام کا جواب آجائے۔ دیوار کو دیکھنے سے یہ دعا ہے کہ شاید صبا پیغام  
لے کر آئے۔ تو وہ دیوار پر سے آئے گی۔ اور دروازہ کے دیکھنے سے یہ مطلب ہے کہ اگر  
نامہ بر جواب لے کر آیا تو وہ دروازہ سے آئے گا

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے کبھی ہم اُن کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں  
اپنے گھر میں مشوق کے آنے سے جرتیب اور صرت ہوتی ہے دوسرے مصرع میں اس کی کیا  
عہدہ تصور کھینچی ہے۔ یعنی کبھی مشوق کو دیکھتا ہے اور کبھی اپنے گھر کو دیکھتا ہے کہ اس  
گھر میں اور ایسا شخص وارد ہوا (از یاد کار غائب)

نظر لگے نہ کہیں اُن کے دست و بازو کو یہ لوگ کیوں ہے زخم جگر کو دیکھتے ہیں  
زخم جگر کی گہرائی اس سے بہتر غفلوں میں ادا ہو ہی نہیں سکتی۔ فراتے ہیں۔ لوگ صرت سے  
میرے زخم جگر کی گہرائی دیکھ رہے ہیں اور مجھ کو یہ غوت ہے کہیں اس کے دست و بازو کو  
نظر نہ ہو جائے۔ بے مثل خضر کہ ہے۔

ترے جواہر طرے کلاہ کو کیا دیکھیں ہم اوج طالع فعل و گھر کو دیکھتے ہیں  
فراتے ہیں۔ ہم اُن جواہرات کو کیا دیکھیں جو تیری خوبی پر لگے ہوئے ہیں۔ ہم تو سل و گوہر  
کے نصیب کی بندی کو دیکھتے ہیں کہ ان سنگرزوں اور پانی کے قطروں کو خوش نصیبی سے یہ  
اوج حاصل ہو گیا ہے۔

### غزل

نہیں کہ مجھ کو قیامت کا اعتقاد نہیں شبِ فراق سے روزِ جزا زیاد نہیں  
فراتے ہیں۔ یہ بات نہیں ہے کہ مجھ کو قیامت کا یا اس کے آنے کا اعتقاد نہیں۔ لیکن  
یہ مزدہ کوں حکاک اس کی مصیبتیں شبِ فراق کی تکلیفوں سے زیادہ نہ ہوں گی۔  
کوئی کہے کہ شبِ مہ میں کیا بُرائی ہے بلا سے کج اگر دن کو ابر و باد نہیں

چاندنی راتیں اور برسات کی گھٹائیں شراب خوار کے واسطے لطف افزا باتیں ہیں۔ فرماتے ہیں: اگر آج دن کو اودی گھٹائیں اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں نہیں ہیں تو نہ ہوں شبِ توبہ ہم رات کو چاندنی میں بیٹھ کر شراب پیئیں گے۔

جو آؤں سامنے اُن کے تو مرجبانہ کہیں جو جاؤں واں سے کہیں کو تو خیر باد نہیں مرزا صاحب اس شعر میں مشق کی بے انتہائی اور کم توجہ کی شکایت فرماتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ان کی ملاقات کو جاتا ہوں تو وہ مجھے دیکھ کر خوش نہیں ہوتے اور رخصت ہوتا ہوں تو خیر باد نہیں کہتے۔ دونوں موقعوں پر بے پردائی ہوتے ہیں۔

کبھی جو یاد بھی آتا ہوں میں تو کہتے ہیں کہ آج بزم میں کچھ فتنہ و فساد نہیں فرماتے ہیں۔ اگر کبھی کسی وقت میرا خیال ان کو آجاتا ہے تو اہل بزم سے قاطب ہوا کر کے کہتے ہیں کہ آج ہماری محفل میں کچھ فتنہ و فساد نہیں ہے یعنی حضرت غائب تشریف نہیں لائے جو بات بات پر رشک کی بدولت اہل بزم سے اٹکتے اور الجھتے تھے۔

علاوہ عید کے ملتی ہے اور دن بھی شراب گدائے کو چڑھ میخانہ نامراد نہیں عید کے دن محنت و مساکین کو خیرات زیادہ دی جاتی ہے اور خصوصیت کے ساتھ دی جاتی ہے۔ فرماتے ہیں: میخانہ میں عید کے دن کی کچھ قید نہیں ہے، پر مغال کا فیض روز جاری رہتا ہے۔

جہاں میں ہو غم و شادی ہم ہیں کیا کام دیا ہے ہم کو خدا نے وہ دل کشادہ نہیں پئے دنیا کا قاعدہ بتاتے ہیں کہ دنیا میں غم و شادی تو ہم ہوا کرتے ہیں۔ یعنی کبھی غم ہے تو کبھی شادی ہے اور پھر اس بیان پر حسرت ظاہر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم کو خدا نے وہ دل دیا ہے جو کبھی شادی ہی نہیں ہوتا یعنی ہمارے لئے دنیا میں غم ہی غم ہے۔ تم اُن کے وعدہ کا ذکر اُن کیوں کر وغائب یہ کیا کہ تم کو اور وہ کہیں کہ یاد نہیں اس شعر کا لطف و ہدائی ہے، بیان میں نہیں آسکتا۔ موقع یہ چاہتا تھا کہ مصرعہ اولیٰ شکایت

کا سہلے ہوئے ہوتا اور میرزا صاحب نے واعظانہ طریقہ سے بیان کیا ہے اور وہ اس لئے ہے کہ مصروفِ ثانی یہ بتا رہا ہے کہ تم ان سے یہ کہو گے کہ تم نے ہم سے وعدہ غلامی کی تھی اور وہ کہیں گے کہ تو جھوٹا ہے ہمیں وعدہ یاد نہیں۔ باہم دگر بھڑا ہوگی، بھڑکار سے رنج نکلے گا، رنج سے جانِ عاشق پر مصیبت نازل ہو جائے گی۔ اس سے بہتر یہ ہے کہ تم ان کے بھولے ہوئے وعدہ کا تو ذکر ہی نہ کرو۔

### غزل

تیرے تو سن کو صبا باندھتے ہیں ہم بھی مضمون کی ہوا باندھتے ہیں  
فرماتے ہیں تیرے تو سن کی صبا سے تشبیہ دے کر اپنی مضمون نگاری کی ہوا باندھتے ہیں  
ورنہ تیرا تو سن صبا سے زیادہ چالاک ہے۔

آہ کا کس نے اثر دیکھا ہے ہم بھی اک اپنی ہوا باندھتے ہیں  
فرماتے ہیں۔ اثر کی امید پر ہم آہ نہیں کرتے نہ ہمیں یہ یقین ہے کہ آہ میں تاثیر ہوتی  
ہے ہم تو صرف اس کے دل پر اپنا رعب بٹھاتے ہیں۔

تیری سرعت کے مقابل اے عمر برق کو پا بہ حسنا باندھتے ہیں  
فرماتے ہیں۔ اے عمر تیری تیز رفتاری کے مقابل میں بجلی کو پا بہ حسنا باندھتے ہیں  
پا بہ حسنا چلنے سے معذور ہونے کا استعارہ ہے۔

قید ہستی سے رہائی معلوم اشک کو بے سرو یا باندھتے ہیں  
فرماتے ہیں انسان کو دنیا کی اور ساری قیدوں سے رہائی اور تیز رفتاری مل سکتی  
ہے لیکن قید ہستی سے نہیں مل سکتی۔ قطرۂ اشک کو باوجود بے سرو پائی کے باندھتے  
ہیں اور وہ بندھ جاتا ہے اور انسان بھی اشک کی طرح بے سرو پا ہے اس لئے ہستی  
کی قید میں ہم ضرور رہیں گے اور مرتبہ فنا جو عین آزادی ہے چھل نہیں ہوگا۔

نشہ رنگ سے ہے واشد گل مست کب بندہ قبا باندھتے ہیں

فرماتے ہیں۔ نشہ رنگ کی وجہ سے پھول کھلا کرتے ہیں۔ اور جب وہ کھل جاتے ہیں تو وہ نشہ رنگ اور بھی زور پکڑ جاتا ہے اور مست کبھی بند قبا باندھنا نہیں کرتے اسی لئے گل کے بھی بند قبا کھٹے ہوئے ہیں۔

غلطیہائے مضامین مست پوچھ لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں فرماتے ہیں۔ لوگ یعنی شعراء نالہ کو رسا باندھتے ہیں اور اس کی رسائی کے قائل بھی ہیں۔ یہ ان کے مضامین کی غلطی ہے۔ ہمارا تجربہ یہ ہے کہ نالہ کو رسائی کبھی حاصل نہیں ہوتی مگر نالہ رسا ہوتا تو قیامت تک باندھنا نہ جاسکتا۔ اس کا بندھ جانا نالہ رسائی کی دلیل ہے۔

اہل تدبیر کی واماندگیاں آبلوں پر بھی حسا باندھتے ہیں فرماتے ہیں۔ اہل تدبیر یعنی عقل مند آدمیوں کی باتیں تو دیکھو کہ آبلہ پا پر مندی باندھ کر پاؤں کو عضو معطل بنا دیتے ہیں۔ یعنی ایک تو انسان آبلہ پا کی وجہ سے چلتے پھرنے سے معذور ہو جاتا ہے اس پر علاج کی غرض سے حسا کا باندھنا بالکل ہی پاؤں کو بیکار کر دیتا ہے اس کے مقابلہ میں اہل جنوں کو دیکھو کہ وہ آبلہ پائی میں بھی دشت پر خارا طے کرتے ہیں۔

سادہ پرکار ہیں خواباں غالب ہم سے پیمان وفا باندھتے ہیں ہم کے لفظ کو زور دے کر بڑھنا چاہئے یعنی ہم کو فریب دیتے ہیں ادھر بھی کسی کو نہیں فرماتے ہیں یہ ان کی بیوقوفی ہے کہ وہ یہ جانتے ہیں کہ ہم ان کے فریب میں آجائیں گے۔ زمانہ سخت کم آزار ہے بجانِ آسہ و گر نہ ہم تو توقع زیادہ رکھتے ہیں فرماتے ہیں۔ زمانہ جس قدر ہم کو آزار پہنچاتا ہے یہ بہت ہی کم ہے۔ آسہ کی جانی کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ ہم تو اس سے زیادہ ستم سننے کی آرزو رکھتے ہیں۔



## غزل

دائیم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں  
فرماتے ہیں۔ ہمیشہ تیرے در پر تیرے سنگ در کی طرح سے پڑا نہیں رہ سکتا۔ ایسی زندگی  
کو خاک میں ملا دوں کہ میں پتھر یعنی تیرا سنگ در بھی نہیں ہوں۔

کیوں گردشِ مدام سے گھبرانے جلے دل انسان ہوں پیالہ دساغر نہیں ہوں میں  
فرماتے ہیں۔ پیالہ دساغر کی طرح مجھ کو دن رات گردشِ نصیب ہے وہ ایک بے جان خے  
ہیں۔ اگر ان کو شرابِ مدام کی وجہ سے شب و روز گردشِ رستی ہے تو ان کو اس سے  
کیا تکلیف پہنچتی ہے وہ ایک بے حس چیز ہیں۔ میں انسان ہو کر کب تک ایسی گردش  
میں مبتلا رہ سکتا ہوں، دل کیوں نہ گھبرا جائے۔

یارب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لئے لوحِ جہاں پہ حرفِ کمر نہیں ہوں میں  
فرماتے ہیں۔ مجھ کو کس وجہ سے زمانہ مٹاتا ہے یا وجہ کہ حرفِ کمر نہیں اور تو کوئی وجہ  
میرے مٹانے کی ثابت نہیں ہوتی۔ حرفِ کمر کا مٹانا لازمی سمجھا جاتا ہے وہ میں  
ہوں نہیں۔

حد چاہئے سزا میں عقوبت کے واسطے آفرگنا ہنگاموں کا فر نہیں ہوں میں  
فرماتے ہیں۔ کافروں کے لئے عذابِ دوزخ ہمیشہ جاری رہے گا اور مسلمان گنہگاروں  
کے لئے عبادِ سزا مقرر ہوگی پھر کیا وجہ ہے کہ میں ہمیشہ سے عذاب میں مبتلا چلا  
آتا ہوں رہائی نہیں پاتا۔

## قطرہ نعتیہ

کس واسطے عزیز نہیں جانتے مجھے لعلِ زمرد و زرو گوہر نہیں ہوں میں  
یہ شرفِ نعمت میں ہے۔ بارگاہِ نبوت میں مرزا صاحب عرض کرتے ہیں کہ حضور کس واسطے

مجھ کو عزیز نہیں رکھتے ہو کچھ لعل اور گوہر و زمرد تو نہیں ہوں، یعنی مال دنیا میں نہیں ہوں کہ جس کو آپ عزیز نہ رکھتے تھے۔

رکھتے ہو تم قدم میری آنکھوں کیوں دینے رتبے میں مہر و ماہ سے کتر نہیں ہوں میں یعنی آپ میری آنکھوں پر قدم کیوں نہیں رکھتے۔ میں رتبہ میں مہر و ماہ سے کتر نہیں ہوں۔ شب مزاج میں تو آپ نے مہر و ماہ کو قدسوسی کا موقع عطا فرمایا تھا۔

کرتے ہو مجھ کو منع قدسوس کس لئے کیا آسمان کے بھی برابر نہیں ہوں میں مجھ کو قدسوس ہونے سے کیوں منع کیا جاتا ہے۔ آسمان پر تو حضور کے قدم گئے تھے، کیا میرا رتبہ آسمان سے بھی کم ہے۔

غالب وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دُعا وہ دن گئے کہ کہتے تھے تو کر نہیں ہوں میں اداسے شکر کا نیا پہلو ہے۔ وظیفہ اس تنخواہ کو کہتے ہیں جو بلا سدا و صدا خدمت کے مل کرئی ہے باقی شعر کے معنی صاف ہیں۔

### غزل

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں خاک میں کیا صورتیں ہو گئی کہ پہناں ہو گئیں اس شعر میں اہل ہنود کے عقیدہ تناسخ کی طوط اشارہ ہے۔ فرماتے ہیں سب نہیں بلکہ تھوڑی سی جتنے دلوں کی صورتیں لالہ و گل میں نمایاں ہو گئی ہیں ورنہ بڑے بڑے حسین خاک کا رزق ہو گئے ہیں۔

یا دھنیں ہم کو بھی رنگارنگ بزم آریاں لیکن اب نقش و نگار طاق نسیاں ہو گئیں اس شعر میں بھی ابنائے روزگار کی طوط اشارہ ہے۔ فرماتے ہیں ہم کو بھی تم لوگوں کی طرح سے رنگ برنگ جلنے کرنے کا شوق تھا لیکن شباب کا زمانہ گزر جانے سے اب ہمارا حال عبرتناک ہو گیا ہے وہ شوق اور وہ محبتیں نقش و نگار طاق نسیاں ہو گئیں ہم کو دکھو اور عبرت حاصل کرو۔

تھیں بناٹ النش گردوں کو پرے میں خال خال کو ان کے جی میں کیا آئی کہ عریاں ہوئیں  
شمال کی جانب آسمان پر سات ستارے ہیں۔ ان میں چار ستارے جنازہ میں اور تین جنازہ کے  
اٹھانے والے عرب ان کو رکھیاں سمجھتے ہیں اور ہندوستان کی عورتیں سات سیلیوں کا  
جھمکا کتھی ہیں۔ نام ان کا بناٹ النش ہے۔ فرماتے ہیں۔ دن کو تو وہ آسمان کے پرے  
میں چھپی رہتی ہیں اور رات کو پردہ سے نکل آتی ہیں یعنی عریاں ہو جاتی ہیں۔

قید میں یعقوبؑ نے لی گوئی یوسفؑ کی خبر لیکن آنکھیں روزِ دیوارِ زنداں ہو گئیں  
یعقوبؑ کی آنکھوں کو روزِ دیوارِ زنداں قرار دیا ہے کس واسطے کہ جس طرح روزِ زنداں  
ہر وقت یوسفؑ پر کشادہ رہتا تھا۔ اسی طرح یعقوبؑ کی آنکھیں شب و روز یوسفؑ کی طرف  
لگراں رہتی تھیں۔ (از یادگار غائب)

سب قیدیوں کے ہوں ناخوش پر زمانِ مصر سے ہے زینِ ناخوش کہ محوِ ماہ کنعاں ہو گئیں  
فرماتے ہیں۔ سب عاشقِ تورِ قیہوں سے ناخوش ہو کرتے ہیں لیکن مصر کی عورتوں سے  
زینِ ناخوش ہے کہ یہ عورتیں حضرت یوسفؑ پر عاشق ہو گئیں۔ یہ اشارہ ہے اس روایت  
کی طرف کہ جب زینِ ناخوش کا عشق حضرت یوسفؑ سے ظاہر ہو گیا تو زانی مصر زینِ ناخوش کو عاشق ہونے  
کے طعنے دیتی تھیں زینِ ناخوش نے ان عورتوں میں سے سزا عورتوں کو منتخب کر کے ایک ایک  
لیہوں اور ایک ایک چھری ہاتھوں میں دے دی اور کہا کہ جب تم حضرت یوسفؑ  
کو دیکھنا ان چھریوں سے یہ لیہوں تراش لینا۔ جب حضرت یوسفؑ سامنے بلائے  
گئے تو ان عورتوں نے بجائے لیہوں تراشنے کے اپنی اپنی انگلیاں کاٹ لیں۔ زینِ ناخوش  
نے خوش ہو کر عورتوں سے کہا کہ دیکھا تم تو مجھ پر طعنہ زن تھیں۔

جوئے خونِ گھوٹ بنے دو کہ ہوشامِ فراق میں یہ سمجھو گے کہ دو شمعیں فروزاں ہو گئیں  
فرماتے ہیں۔ شبِ تارِ فراق میں جو خونِ گھوٹوں سے بجے گا میں اس کو یہ سمجھوں گا کہ دو موم تیار  
اندھیرے میں روشن ہو گئیں ہیں اور یہ تسکین خاطر کا سبب ہو جائے گا۔

ان پر یزادوں سے لیں خُلد میں ہم انتقام قدرتِ حق سے یہی حوریں اگر وہاں ہوئیں  
 فرماتے ہیں۔ یہ مشوق جو دُنیا میں ہم کو جلاتے ہیں۔ خُلد میں ہم اپنا بدلہ ان سے۔ لے  
 لیں گے اگر خُدد کی قدرت سے یہ عورتیں ہم کو حور بن کر لے جائیں گی۔

نیند اُسکی جو داغ اُسکا ہوا تیل کی ہیں تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہوئیں  
 یہ شعر مرزا صاحب کے نشتروں میں کا ایک نشتر ہے اس کی شرح امد تعریف بیان سے  
 مستثنیٰ ہے۔ اہل ذوق اپنے اپنے خیال کے موافق اس سے لطف چاہل کر سکتے ہیں۔

میں جس میں کیا گیا گویا داستانِ کھل گیا بلبلیں سُن کر مے نالے غز لخواں ہوئیں  
 فرماتے ہیں۔ سرے باغ میں جانے سے بلبلیں غز لخواں کر اُنھیں جس طرح کتب میں طالب علم  
 سبق پڑھتے ہیں۔ قاعدہ ہے بلبل آواز خوش سُن کر زمزمہ سرائی کیا کرتی ہے۔

وہ نگاہیں کیوں تھی جاتی ہیں یازد دل کے پار جو مری کوتاہی قسمت سے مڑگاں ہوئیں  
 نگاہوں کے مڑگاں ہونے سے یہ مراد ہے کہ شرم کے سبب اوپر نہیں اٹھتیں بلکہ پلگوں کی  
 طرح ہر وقت نیچے کو جھکی رہتی ہیں۔ (از یادگار غالب)

بسکہ رو کا میں اور سینے میں بھری پے پے میری آہیں تجیہ چاکِ گریباں ہوئیں  
 فرماتے ہیں۔ میں نے آہوں کو بار بار ضبط کیا اور وہ بار بار اُبھرتی رہیں۔ اس لئے میری آہیں  
 چاکِ گریباں کا تجیہ ہو گئیں۔ مطلب شعر کا یہ ہے کہ آہوں کے ضبط کر لینے سے باوجود گریباں  
 چاک ہونے کے عشق کا پردہ ہو گیا۔

واں گیا بھی میں اُنکی گالیوں کا کیا جواب یاد تھیں جتنی دُعائیں صرف دیاں ہوئیں  
 یعنی اب نئی دُعائیں تو کوئی دُہن میں باقی نہیں رہی اور وہی استعمال دُعائیں جو دریاں کو نے  
 چکا ہوں دوست کے حق میں صرف کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ اس شعر میں جو اصل خوبی  
 اور لطافت ہے وہ یہ ہے کہ گالیوں کے جواب میں دُعائیں دینے کو ایک ایسی سمجھوتہ اور ضدی  
 بات ہونی ظاہر کرنا ہے کہ گویا اس کو ہر شخص ضروری جانتا ہے اس واسطے کہ سب سے جبراً

ہو کر پوچھتا ہے کہ بتاؤ ان کی گالیوں کا کیا جواب دوں گا جبکہ دُعا میں نہڑ چکیں۔  
(از یادگار غائب)

جانفزا ہے یادہ جس کے ہاتھ میں جام آگیا سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگ جاں ہو گئیں  
فرماتے ہیں شراب جانفزا ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ جس کے ہاتھ میں جام آگیا اس کے  
ہاتھ کی سب لکیریں سچ مچ رگ جاں بن گئیں۔ گویا کا لفظ مبالغہ کم کرنے کی غرض سے یہاں  
استعمال ہوا ہے۔

ہم موجد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم قلتیں جب مٹ گئیں اجڑائے ایساں ہو گئیں  
تمام قلتوں اور مذہبوں کو منجملہ دیگر رسوم کے قرار دیتا ہے جن کا ترک کرنا اور مٹانا موجد  
کا اصل مذہب ہے اور کہتا ہے کہ یہی قلتیں جب مٹ جاتی ہیں تو اجڑا ریاکارانہ بن جاتی  
ہیں (از یادگار غائب)

رنج کا خوگر ہوا انسان قسٹ جاتا ہو رنج مشکلیں مجھ پر طیں اتنی کہ آساں ہو گئیں  
فرماتے ہیں آدمی جب رنج و غم کا عادی ہو جاتا ہے تو رنج کی سختی اور تکلیف کم ہو جاتی  
ہے مجھ پر اتنی مشکلوں کا هجوم ہوا کہ وہ خود بخود آساں ہو گئیں۔

یوں ہی گر روتا رہا غائب اے اہل حبال دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں  
اس مقطع میں دو معنی پیدا ہو گئے ہیں۔ ایک یہ کہ رونے کے اثر سے آبادیاں ویراں ہو جائیں گی  
اور دوسرے معنی یہ ہیں کہ سیلابِ احکام کا نوحہ کو ڈھا کر بستیوں کو ویراں کر دے گا۔

### غزل

دیوانگی سے دوش پہ زنا رہی نہیں یعنی ہماری جیب میں اک تار بھی نہیں  
فرماتے ہیں۔ یہ نئی دیوانگی ہے کہ جس نے ہمارے گریباں میں اک تار بھی نہ چھوڑا۔ اگر  
دو چار تار بھی جنون کے ہاتھ سے بچ جاتے تو ہم ان ہی کو زنا کہتے اس لئے کہ مذہب  
صنم پرستی میں زنا کا ہونا ضرور تھا۔

دل کو نیازِ حسرت دیدار کر چکے دیکھا تو ہم میں طاقت دیدار بھی نہیں  
 فرماتے ہیں۔ دیدار کی تمنائیں جب ہم اپنے دل کو خاک میں ملا چکے اس کے بعد اپنے  
 امتحان کا فیال آیا غور کرنے سے ثابت ہوا کہ دل کے مٹ جانے نے تاب و طاقت  
 دیدار کو بھی مٹا دیا اب اگر وہ دیدار دکھائے بھی تو ہم میں جلوہ دیدار دیکھنے کی قابلیت  
 اور ضبط کی طاقت نہیں رہی۔

لہذا تیرا اگر نہیں آساں تو سہل ہے دُشوار تو یہی ہے کہ دُشوار بھی نہیں  
 ایک حقیقت کے بیان میں ایسے تناسب محاورات کا دستیاب ہو جانا عجیب  
 اتفاق ہے اس مضمون کو چاہو حقیقت کی طرف لے جاؤ اور چاہو مجاز پر مضمون  
 کرو دونوں صورتوں میں مطلب یہ ہے کہ اگر تیرا لہنا آساں نہ ہوتا یعنی دُشوار ہوتا تو  
 کچھ دقت نہ تھی اس لئے کہ ہم مایوس ہو کر بیٹھ رہتے اور شوق و کز زدنِ خلش سے چھوٹ  
 جاتے مگر مشکل یہ ہے کہ وہ جس طرح آساں نہیں اسی طرح دُشوار بھی نہیں ہے اور اس  
 شوق و کز زدن کی خلش سے کسی طرح نجات نہیں ہوتی (از یادگار غائب)

بے عشقِ عمر کٹ نہیں سکتی ہو اوریاں طاقتِ بقدر لذتِ آزار بھی نہیں  
 فرماتے ہیں۔ عشق کے بغیر عمر گزار بھی نہیں سکتی اور مصائبِ عشق برداشت کرنے کی دل  
 میں طاقت بھی نہیں۔ مطلب یہ ہے زندگی بسر کرنے کے لئے دنیا سے تعلقات بھی  
 قائم رکھنے پڑتے ہیں اور غمِ روزگار سے دل بھی اگتا جاتا ہے۔

شوریدگی کے ہاتھ سے ہوسرِ بالِ دُش صحرا میں اب خدا کوئی دیوار بھی نہیں  
 فرماتے ہیں۔ شوریدہ سری نے گھر میں نہ ٹھکنے دیا وحشت سے تنگ آکر سر بھرا تکل کھڑے  
 ہوئے مگر اس وحشت سے نجات یہاں بھی حاصل نہ ہوئی۔ مشکل یہ کہ بڑی کجنگل میں  
 سر بھوڑ کر مرجانے کے لئے دیوار نہیں ملتی۔

گنجبائشِ عداوتِ اخیر ایک طرف یاں دل میں ضعف سے ہوسِ یار بھی نہیں

فرماتے ہیں۔ گنجائشِ عداوتِ اغیار کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ عشق و ہوس کا زمانہ گزر جانے کے بعد یہاں یار سے بھی وہ دلی لگاؤ پائی نہ رہا۔

خُورِ نالہائے زار سے میرے خُدا کو مان آخِر نوائے مُرغِ گرفتار بھی نہیں فرماتے ہیں۔ خُدا کو مان کر میرے دل کو نہ دکھا۔ میرے نالوں سے خند کر میری زیاد نوائے مُرغِ گرفتار نہیں ہے جو بے اثر ثابت ہوگی خُدا اس میں ضرور اثر کرے گا۔ دل میں ہے یار کی صفِ مژگان سے روشنی حالانکہ طاقتِ خلشِ خار بھی نہیں فرماتے ہیں۔ ارادہ تو یہ ہے کہ فوجِ مژگانِ یار سے مقابلہ کروں اور حالت یہ ہے کہ دل میں اتنی طاقت بھی نہیں ہے کہ خلشِ خار کی بھی تحلیل برداشت کر سکوں۔

اس سادگی پہ کون نہ مڑے اے خُدا لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں فرماتے ہیں۔ کون ایسا ہے جو یار کی اس سادگی پر قربان نہ ہو جائے۔ لڑتے ہیں یعنی اختلاط میں ہاتھ پائی کرتے ہیں، باوجودیکہ ہاتھ میں تلوار بھی نہیں۔

دیکھا اسد کو خلوت و جلوت میں بار بار دیوانہ گر نہیں ہے تو ہشیار بھی نہیں فرماتے ہیں۔ ہم نے اسد کو خلوت و جلوت میں دیکھا ہے اس سے ملے ہیں باتیں کی ہیں وہ اگر تمھارے بیان کے موافق پورا پورا دیوانہ نہیں تو کمالِ ہشیار بھی نہیں ہے۔

### عزل

نہیں ہے زخمِ کوئی بخیمہ کے درخوردے تن میں ہوا ہے تارِ اشک یا اس رشتہ چشمِ سوزنِ دل فرماتے ہیں۔ بخیمہ کے قابلِ کوئی زخمِ میرے جسم میں نہیں ہے یعنی ایسے بڑے اور گہرے زخم ہیں کہ جن میں ٹماٹکے نہیں لگائے جاسکتے اس لئے تارِ اشکِ چشمِ سوزن میں مایوسی سے تارِ اشک بن گیا ہے۔

ہوئی ہے مانعِ ذوقِ تماشا خانہ ویرانی کھیلِ سیلابِ باقی ہی بربکِ جنبہ روزن میں فرماتے ہیں۔ جس ذوقِ تماشا میں ہم نے رہ کر گھر کی دیواروں کو گرانا چاہا تھا اسی

خانہ دیرانی کے ذوق نے روزِ دیوار کو پانی کے چھاگوں سے بند کر دیا یعنی۔ دلی کی طرح سے کتبِ سیلابِ روزِ دیوار میں بھر گئے۔

ودیت خانہ کیلئے کا دستملہ شرکانِ محسوس نگیں نام شاہدِ میرے ہر قطرہ خونِ تن میں فرماتے ہیں۔ میں امانت خانہ ہوں بیدار کاوشائے شرکانِ یار کا جو خون کا قطرہ میرے جسم میں ہے وہ ایک نگینہ ہے مہر کا جس پر میرے معشوق کا نام کندہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میں امانت دارِ شرکانِ یار کی کاوشوں کا ہوں امانت پر جس طرح مہر لگا دی جاتی ہے اسی طرح میرے خون کے قطروں پر کاوشِ شرکانِ یار کی مہر لگی ہوئی ہیں۔

بیاں کس پہ خلقت گسری میرے شہستان کی شہت ہو جو رکھیں پسندِ دیوار کے روزِ تن میں فرماتے ہیں۔ میرے یہ خانہ کی تاریکی کا حال کون بیان کر سکتا ہے۔ اگر اس کے روزِ دیوار میں روئی رکھ دی جائے تو یہ معلوم ہو کہ جانہ نکل آیا۔

نگو ہش مانع بے ربطی شورِ جنوں آئی ہوا ہے خندہٴ احبابِ بخیمہ حبیبِ دامن میں فرماتے ہیں۔ میرے احباب کی طاعت میرے جوشِ جنوں کو روک دینے والی ثابت ہوئی ہے اور ان کا خندہٴ دندانِ نما میرے چاکِ گریباں کا بخیمہ بن گیا ہے۔ مطلب یہ ہے دوستوں کے طعنوں نے مجھ کو آوارگی سے روک دیا ہے۔

ہوئے اس مہروش کے جلوہٴ تمثال کے آگے پرافشاں جو ہر آئینے میں مثلِ ذرہٴ روزِ تن میں فرماتے ہیں۔ اس مہروش کے جلوہٴ تمثال کے رو بہ رو آئینے کے جوہر اس طرح اڑتے ہیں جس طرح روزِ دیوار میں شمعِ مہر سے خاک کے ذرے اڑتے ہیں۔

نہ جانوں نیکے ہوں نہ بد ہوں صحبتِ مخالف ہے جو گل ہوں تو گلشنِ جو گل ہوں تو گلشن میں فرماتے ہیں۔ یہ تو میں بتا نہیں سکتا کہ اچھا ہوں یا بُرا ہوں لیکن صحبتِ مجھے مخالف آدمیوں کی نصیب ہوئی ہے یعنی اگر پھول ہوں تو بھاڑ میں ہوں اور اگر گھاس پھوس ہوں تو



چمن میں ہوں۔

ہزاروں دل دیے جوشِ جنوں عشق نے مجھ کو سید ہو کر سویدا ہو گیا ہر قطرہ خون تن میں فرماتے ہیں۔ جوشِ جنوں نے ہم کو ہزاروں دل عطا کر دیے ہیں یعنی دیوانگی کی وجہ سے جو خون سیاہ ہو گیا ہے اس کا ہر ایک قطرہ سویدا بن گیا ہے۔ سویدا دل میں ایک سیاہ دھبہ ہوا کرتا ہے۔

اسد ز ندانی تاثیر اُفتہائے خواباں ہوں خیم دستِ نوازش ہو گیا جھڑپوں گردن میں فرماتے ہیں۔ اے اسد حبیبوں کی تاثیر محبت میرے لئے قید خانہ بن گئی ہے اور مہربانی سے جو مشہد توں نے میری گردن میں باہیں ڈالی ہیں وہ طوقِ گلو کا کام دے رہی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ میں اسیر محبت ہوں۔

### عزل

مڑے جہان کے اپنی نظریں خاک نہیں سوائے خونِ جگر، سو جگر میں خاک نہیں فرماتے ہیں۔ دنیا کے کھانے پینے کے لطف میری نگاہوں میں خاک نہیں ہیں یعنی مجھ کو ان میں خاک مزا نہیں آتا۔ البتہ خونِ جگر کے پینے میں مزا ملا کرتا تھا تو اب جگر میں خاک بھی نہیں ہے یعنی جگر میں خون باقی نہیں رہا۔ میں نے سب چٹ کر لیا۔

مگر غبار ہوئے پدہ ہوا اڑا لے جائے وگر نہ تابے تو اس بال و پر میں خاک نہیں فرماتے ہیں۔ شاید ایسا ہو کہ خاک ہو جانے کے بعد ہوا باغِ عک اڑا لے جائے ورنہ بال و پر میں تو اب تاب و طاقت خاک بھی نہیں۔

یہ کس بہشتِ شمائل کی آمد آمد ہے کہ غیر جلوہ گل رہ گزرتے ہیں خاک نہیں فرماتے ہیں۔ یہ کون سا بہشتِ شمائل تشریف لائے والا ہے کہ جلوہ گل کے سوا رہ گزرتے ہیں خاک نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جنت میں خاک نہ ہوگی بہشتِ شمائل کی رعایت سے دنیا میں بھی جلوہ گل کے علاوہ خاک کا نہ ہونا لطف سے خالی نہیں ہے۔

بھلا اسے نہ سہی کچھ مجھے کو رحم آتا۔ اثر میرے نفس بے اثر میں خاک نہیں فرماتے ہیں۔ اگر اس کو مجھ پر رحم نہ آیا نہ سہی مجھے کو اپنی حالتِ زار پر رحم آتا کہ میں اس نازکشی سے باز رہتا۔ مگر معلوم ہو گیا کہ میرے نالہ بے اثر میں خاک۔ اثر نہیں ہے۔ خیال جلوہ نگار سے خراب ہیں میکش۔ شراب خانہ کے دیوارِ زورِ دریغ خاک نہیں فرماتے ہیں۔ خیال جلوہ نگار یعنی نثار کے طفیل سے میکش بدست ہو رہے ہیں ورنہ شراب خانہ کی دیوار و در میں خاک نہیں ہے مطلب شعر کا یہ ہے کہ زندگی کو پر لطف بنانے والی شے محبت الہی ہے ورنہ اس ناپاکِ دُنیا میں کیا رکھا ہے۔

ہوا ہوں عشق کی غارِ نگری سے شرمندہ سوائے حسرتِ تعمیرِ گھر میں خاک نہیں فرماتے ہیں۔ عشق وہ بلائےِ زار ہے جس گھر میں قدم رکھتا ہے اس کو برباد و غارت کر دیتا ہے۔ میں عشق کی غارِ نگری سے شرمندہ ہوں کہ میرے گھر میں سوائے حسرتِ تعمیر کے اور خاک بھی نہیں ہے۔

ہمارے شعر میں اب صرف فل لگی کے آسہ کھلا کہ فائدہ عرضِ ہنر میں خاک نہیں فرماتے ہیں۔ اے آسہ اب ہم صفت اپنے دل بھلانے کی غرض سے شعر کہا کرتے ہیں۔ ہم کو یہ یہ معلوم ہو گیا کہ اظہارِ کمال میں خاک بھی فائدہ نہیں ہے مطلب یہ ہے کہ اب نہ تو کچھ خوشگوار کی قدر کرتے ہیں اور نہ شعر کی خوبی سمجھ سکتے ہیں۔

### غزل

دل ہی تو ہے نہ سنگِ دشتِ دہلے بھرنے کے کیوں روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں تلے کیوں اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کوئی ظالم اپنے مظلوم عاشق پر قسم کے ساتھ یہ بھی تاکید کر رہا ہے کہ خبردار آنکھوں سے آنسو کا قطرہ نہ ٹپکنے پائے اور عاشقِ مظلوم گڑگڑا کر اس سے کہتا ہے میرے سینے میں تو ظالم ہوا دل ہے سنگِ دشت نہیں ہے کیوں نہ بھرے ہوئے ساغر کی طرح چمک جائے میں تو ہزار بار اسی طرح روؤں گا کوئی مجھ کو کیوں ستائے کمال

عصہ میں بجائے مخاطب کرنے کے کوئی کا لفظ استعمال کیا ہے جو ہزار ہزار محسن پیدا کرتا ہے۔

دیر نہیں حرم نہیں در نہیں آستان نہیں بیٹھے ہیں رہنڈ رہے ہم غیر میں اٹھائے کیوں یہ شکر لاکھ نشتروں میں کا ایک نشتر ہے۔ ہر صاحب ذوق اپنے ذوق طبیعت کے موافق اس سے لطف اٹھا سکتا ہے۔

جب وہ جمال و لغز و صورتِ سرخروز آپ ہی ہوں نظارہ سوز پر دین میں کچھ چھپائے کیوں فرماتے ہیں۔ جب وہ جمال جس سے دل روشن ہے اور سرخروز کی طرح اُس کے دیکھنے سے نگاہ قاصر ہے تو پردہ میں پوشیدہ کیوں ہو مطلب یہ ہے کہ وہ پردے میں نہان نہیں ہے بلکہ آشکار ہے مگر پھر اس کو کوئی دیکھ بھی نہیں سکتا۔

دشنہ غمزہ جانتاں ناوکِ ناز بے پناہ تیرا ہی عکسِ رخ سہی سامنے تیرے آئے کیوں فرماتے ہیں۔ ایسی صورت میں کہ دشنہ غمزہ جانتاں ہے اور ناوکِ ناز بے پناہ ہے تیرے رو بہ کسی کا آنا ہی بستر نہیں ہے یعنی جو شخص آئے گا وہ مارا جائے گا اب اگر آئینہ تیرے سامنے آیا اور اس میں تیرا عکس دشنہ و ناوک لئے ہوئے تیرے مقابل ہو گیا تو حیاتِ کیا حال ہو گا۔

قیدِ حیاتِ بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں فرماتے ہیں جس طرح قیدِ حیات ایذا دینے والی ہے اسی طرح بندِ غم تکلیف دہ ہے ان دونوں کی اصل ایک ہی ہے یعنی یہ دونوں ایک ہی چیز کے نام ہیں پھر یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ آدمی مرنے سے پہلے غم سے نجات پائے۔

محسن اور راج محسن تلخ گہنجی ہوا موس کی شرم اپنے پیر اعتماد بے غیر کو آزمائے کیوں فرماتے ہیں پہلی بات تو یہ ہے کہ محسن و کمال شہرِ تہائی نے عطا فرمایا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اس شہر کی دلفریب کالقیں ہی ۱۲۰۰ ہے ان دونوں باتوں سے ہوا موس کی شرم

رہ گئی اس کو اپنی ذات پر اعتماد کئی محال ہے کہ جو مجھے دیکھے گا بغیر عاشق ہوئے نہ رہے گا پھر کیوں غیر کا امتحان کرے۔

وَالْغُرُورُ غُرُورٌ نَّازِرٌ يَا حُجَّابُ يَا مَضْعُوعُ      راہ میں ہم میں کہاں بزم میں وہ ہائے کیوں  
 فرماتے ہیں یہاں تو یہ پاس وضع ہے کہ ہم رستہ میں اس سے ملتے ہوئے شرہاتے ہیں اور  
 وہاں وہ غرور غرور ناز ہے کہ اپنی بزم میں ہم کو بلاتے ہوئے اس کو تنگ آتا ہے۔  
 ہاں وہ نہیں خدا پرست جاؤ وہ بیوفا کسی جس کو ہو دیں دل عزیز اس کی گلی مدھلے کیوں  
 ناصح نے جو عشق کی بُرائیاں اور مشق کی بے دینی اور بے وفائی بیان کی ہے اس کے  
 جواب میں میرزا صاحب غصہ کے لہجہ میں فرماتے ہیں ہاں وہ خدا پرست نہیں ہے  
 جاؤ وہ بے وفا سہی جس کو دین و دل پیارا ہو وہ اس کی گلی میں کیوں جلے۔ یعنی  
 اسے ناصح مشفق آپ وہاں جانے کی تکلیف نہ فرمائیے گا اور ہم تو نہ اُس کو چھوڑ سکتے  
 ہیں اور نہ اس کی گلی میں جانے سے باز رہ سکتے ہیں۔

غائبِ خستہ کے بغیر کو کج کام بند ہیں      رویے زار زار کیا کیجئے ہائے کیوں  
 میرزا صاحب اپنی وفات کے بعد اپنے دوستوں کو رنجیدہ و ملول پاکر تلقینِ صبر ان  
 الفاظ میں فرماتے ہیں کہ غائبِ خستہ کے بغیر دنیا کے کوئی سے کام نہ ہو گئے جن کی وجہ  
 سے تم زار زار روتے اور ہائے ہائے کرتے ہو۔

غنیہ ناشگفتہ کو دور سے مست لکھا کہ یوں      بوسہ کو پوچھتا ہوں میں سے مجھے بتا کہ یوں  
 فرماتے ہیں میں نے جو یہ دریافت کیا کہ بوسہ کو نہ پوچھا جاتا ہے تو نے مجھ بندہ کلی کو انگلی کے  
 اشارہ سے دکھا دیا کہ دیکھ بوسہ لینے کی یہ صورت ہوا کرتی ہے۔ میں خاک نہیں بجا میسر  
 پاس آ کر اور میرا بوسہ لے کر مجھ کو بتا کہ دیکھ یوں لیتے ہیں۔

پرسشِ طرزِ دہری کیجئے کیا کہ بن کسے      اس کے ہر اک اشاعت سے نکلیے جو یہ ادا کیوں  
 فرماتے ہیں۔ دل چھین لینے کے طریقہ کو اس سے کیا دریافت کیا جائے اس کی تو ہر ادا سے

یہ اشارہ پیدا ہوتا ہے کہ دیکھو دل یوں چھین لیا جاتا ہے۔

رات کے وقت تھے پئے ساتھ قریب کھٹے آئے وہ یاں خدا کرے پر نہ کئے خدا کی یوں  
فرماتے ہیں۔ یہ تو ہماری دلی آرزو ہے کہ وہ شوخ ہمارے گھر میں قدم رنجہ کرے لیکن خدا  
نہ کرے کہ وہ یوں آئے یعنی شراب پی کر اور غیر کو ساتھ لے کر نہ آئے۔

غیر سے رات کیا بنی یہ جو کہا تو دیکھئے سامنے آئی بیٹھنا اور یہ دیکھنا کہ یوں  
فرماتے ہیں میں نے اس سے یہ پوچھا تھا کہ رات کو غیر سے کیا بنی اس کے جواب میں اس نے  
یہ کہا کہ میرے سامنے آ بیٹھا اور اس ادا سے یہ ظاہر کر دیا کہ دیکھنا یوں یعنی میں اُس کے  
سامنے اسی طرح دوڑ بیٹھا رہا۔

بزم میں اُس کے روبرو کوشِ خموش بیٹھئے اُسکی تو خاموشی میں بھی جو سی مدعا کہ یوں  
فرماتے ہیں اُس کے روبرو بزم میں کیونکر خاموش نہ بیٹھا جائے اس کی تو خاموشی میں بھی  
یہ مدعا نکلا ہے کہ ہماری طرح تم بھی خاموش بیٹھے رہو۔

میں نے کہا کہ بزمِ ناز چاہئے غیر سے تھی سُن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں  
ستم ظریف وہ شخص کہ جس کے ستم میں خلافت ہو۔ فرماتے ہیں میں نے اس سے کہا تھا کہ بزمِ ناز  
غیر سے خالی ہونی چاہئے۔ یہ بات سُن کر اُس ستم ظریف نے مجھ کو اپنی بزم سے اٹھا دیا  
کہ یوں خالی ہونی چاہئے یعنی ہماری بزم میں ایک تو ہی غیر تھا۔

مجھ سے کہا جو یار نے جلتے ہیں غموش کس طرح دیکھ کے میری بخودی پہنے لگی ہوا کہ یوں  
فرماتے ہیں مجھ سے یار نے یہ دریافت کیا تھا کہ ہوش و خواہش کس طرح سے جاتے ہیں میری  
بخودی کو دیکھ کر ہچا پہنے لگی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ درک ہے ہوش یوں اُڑ جاتے ہیں۔

کب مجھے کوئے یار میں رہنے کی وضع یاد تھی آئینہ دار بن گئی حیرتِ نقشِ پاکہ یوں  
فرماتے ہیں مجھے کوئے یار میں رہنے کی وضع یاد نہ تھی۔ نقشِ پائے مجھے سکھا دیا کہ  
دیکھ اس طرح خاک میں مل کر اور جلوہ یار سے حیرت زدہ ہو کر مشوق کے کوچہ میں

ہا کرتے ہیں۔

گرتے دل میں تو خیال فصل میں شمع کا زوال موج محیط آب میں مارے ہو دستِ پاکہ یوں فرماتے ہیں۔ اگر تیرے دل میں یہ نیرال ہو کر زلزلے کا میاب ہو کر شوق کیو نہ زوال پذیر ہوتا ہے اور عاشق و معشوق میں اتحاد کمال کس طرح ہوتا ہے تو سن محیط آب۔ کو دیکھ لے وہ بتا رہی ہے کہ یوں دست دیا مارتے مارتے انجام کار اتحاد پیدا ہو جا ہے جس سے اطمینان و سکون کی شکل نکل آتی ہے۔

جو یہ گمے کہ رنجیتہ کیونکر ہو رشکِ فارسی غصہ غائب ایک بار چڑھ کے اُسے سُنا کہ یوں رنجیتہ اردہ میں شکر کرنے کو کہتے ہیں۔ فرماتے ہیں جو شخص یہ پوچھے کہ رنجیتہ کیونکر رشکِ ناری ہو کر تاپے تو غائب کے اشعار ایک بار چڑھ کے سُنا کہ یوں ہوتا ہے۔

## ردیف (و)

### غزل

مسد سے دل گر افسردہ ہو گرم تماشا ہو کہ چشم تنگ شاید کثرتِ نظارہ سے داہو  
یہ محض خیالی مضمون نہیں ہے بلکہ حقیقت۔ واقعی کو ایک خدایت عمدہ پہرایہ میں بیان کیا ہے فی الواقع جب انسان گھر کی چار دیواری میں محصور دُنیا کے حالات سے ناواقف اور لوگوں کی ترقی و منزل کے اسباب سے بے خبر ہوتا ہے تو اپنی محدود جماعت میں سے کسی کو عمدہ حالت میں نہیں دیکھ سکتا۔ لیکن جس قدر اس کا دائرہ تجارت زیادہ وسیع ہوتا جاتا ہے اسی قدر اُس پر یہ بات صحت پاتی ہے کہ لوگوں کی خوشحالی محض اتفاقی نہیں ہے جس پر مسد و رشک کیا جائے بلکہ ان کی محنت اور تہذیب کا نتیجہ ہے اور اس لئے انصاف اور فیاضی اس کے دل میں پیدا ہوتی ہے اور وہ خود بخود خوش و تہذیب کی طرف مائل ہوتا ہے اور بجائے مسد و رشک کے اور دلوں کی دیکھ، رہی ہوں

کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اس معقول بات کو ایک محسوس تخیل میں بیان کرتا ہے کہ چشم بچک شاید کثرتِ نفاذ سے وہ جو جس طرح شعرا نے بخیل کے دل کو تنگ بنا دھا ہے اسی طرح حاسد کی آنکھ کو تنگی کے ساتھ موصوفت کیلئے (از یادگارِ نقاب) بقدر حسرتِ دل چاہئے ذوقِ معاصی بھی بھروں یک گوشہ دامنِ گرابِ ہفت دریا ہو بقدر حسرتِ دل کے برابر ذوقِ گناہ بھی ہونا چاہئے میں اپنے دامن کا ایک گوشہ تر کروں اگر سات دریاؤں کا پانی مجھ کو مل جائے آج ہفت دریا سے کثرتِ معاصی کا استعارہ ہے۔

اگر وہ سرودِ گرمِ خرام ناز ہو جائے کفِ ہر خاک گلشنِ شکلِ قمری نامہ فرسا ہو فرماتے ہیں۔ اگر وہ سرودِ قد اپنے خرام ناز کے ساتھ گلزار کی سیر کو آجائے تو ایک ایک مٹھی خاکِ گلشن کی قمری بنا کر اس کے عشق میں نالے کرنے لگے۔ قمری کا رنگِ خاکستر ہوا کرتا ہے۔

### عَنْزَل

کعبہ میں جا رہا تو نہ دو طعنہ کیا کہیں بھولا ہوں حقِ صحبتِ اہلِ کنشت کو فرماتے ہیں۔ اگر میں ہندوستان سے ہجرت کر کے کعبہ میں جا رہا تو مجھ کو طعنہ کیوں دیتے ہو، میں جگہ کی صحبتوں کو بھولنے والا آدمی نہیں ہوں۔ طاعت میں تار ہے نہ خے دانگیں کی لاگ دوزخ میں ڈال دو کوئی لیکر بہشت کو فرماتے ہیں۔ بہشت میں جو شد و شربت کی نہیں چیں ان کے لالچ سے اگر عبادتِ الہی کی تو کیا کیا بہشت ہو دوزخ میں جھونک دینا چاہئے۔ جب بے غرض عبادت کا مزد ہے۔

ہوں سخنِ نیکو راہ در رسمِ ثواب سے ٹیڑھا لگا ہے قوطِ قلمِ سرِ نوشت کو فرماتے ہیں۔ نیکو راہ در رسمِ ثواب سے پریشانی کیوں نہ رہوں۔ کاتبِ تقدیر نے جس

قلم سے میری سرفروخت لکھی ہے اُس پر قسطیڑھا کا ٹھنڈا پودہ ہے میری دہم ثواب سے برعکست ہونے کی۔

غالب کچھ اپنی سعی سے ملتا نہیں مجھے خرمین جلے اگر نہ تلخ کھلے کشت کو فرماتے ہیں۔ اے غالب اپنی کوشش سے فائدہ اٹھانا میری تقدیر میں نہیں لکھا۔ اگر ٹڈیاں میری کھیتی کو نہ کھالیں تو انداز کے خرمین میں آگ لگ جائے۔

### عزل

وارستہ اس سے کہ محبت ہی کیوں نہ ہو کیجئے ہمارے ساتھ عداوت ہی کیوں نہ ہو فرماتے ہیں۔ ہم اس خیال سے آزاد ہیں کہ تم سے اس بات کی فرائش کی جائے کہ ہمارے ساتھ تم محبت کا برتاؤ کرو۔ ہاں یہ کہتے ہیں ہمارے ساتھ عداوت بھی کی جائے تو اس میں بھی غیر کی شرکت نہ ہو۔ مطلب یہ ہے کہ دوستی اور دشمنی ان دونوں باتوں میں سے ہمارے ساتھ وہ کرو جو دشمن کے ساتھ نہ کی جائے۔ چھوڑا نہ مجھ میں ضعف نے رنگ اختلاط کا ہے دل پہ بار نقش محبت ہی کیوں نہ ہو فرماتے ہیں ضعف نے مجھے ایسا ٹکھا دیا ہے کہ میرے مہم میں خون باقی نہ رہا اور خون باقی نہ رہنے سے رنگ اختلاط بھی مٹ گیا۔ اب میرے دل پر نقش محبت بھی یار ہے۔

ہے مجھ کو تجھ سے تذکرہ غیر کا حکلم ہر چند برسبیل شکایت ہی کیوں نہ ہو فرماتے ہیں۔ مجھ کو تم سے غیر کے ذکر کرنے کی شکایت ہے۔ باوجودیکہ تم نے اس کا ذکر شکایت آمیز لفظوں میں کیا ہے مجھ سے اس کی شکایت نہ کیا کرو۔ پیدا ہونے سے کہتے ہیں ہر درد کی دوا یوں ہو تو چارہ غمِ الفت ہی کیوں نہ ہو فرماتے ہیں۔ لوگوں کا بیان ہے۔ دُنیا میں ہر درد کی دوا پیدا ہوئی ہے۔ اگر یہ بات سچ ہو تو عشق سہ بیمار اچھا ہی کیوں نہ ہو جائے۔



ڈالا نہ جیسی نے کسی سے معاملہ اپنے سے کھینچتا ہوں خجالت ہی کیوں نہ ہو فرماتے ہیں فکر ہے۔ میرا معاملہ میری جیسی نے کسی غیر سے نہ ڈالا۔ کسی غصہ شخص کا احسان مجھ پر نہ ہوا۔ اگر لوگوں سے مجھ کو کچھ نفع بھی نہ پہنچتا تو شرمندگی ضرور اٹھانی پڑتی۔ اب اگر شرمندہ بھی ہوں تو اپنی ہی ذات سے۔

بے آدمی بجائے خود راگِ محشر خیال ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو فرماتے ہیں۔ تنہائی اور خلوت میں بھی تو خیالات اور تصورات کی ہنگامہ آرائی رہتی ہے۔ وہ کیا انجمن سے کم ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تخلیقِ نفس نہایت دشوار کام ہے اور فطرتِ قلب پر قابو پانا اس سے بھی دشوار تر۔ یہ شعر قصوت ہے۔ ہنگامہ زبانی بہت ہے انفعال حاصل نہ کیجئے دہرے عبرت ہی کیوں ہو فرماتے ہیں کسی شخص سے کچھ حاصل کرنا یعنی اس کا احسان لینا انفعال کا سبب ہے۔ اور شرمندگی حاصل کرنی کم ہمتی کا کام ہے یہاں تک کہ زمانہ سے عبرت بھی حاصل نہ کرنی چاہئے۔

واریستگی بہانہ بیگانگی نہیں اپنے سے کرنے غیرے وحشت ہی کیوں ہو فرماتے ہیں۔ واریستگی اور آزادی اس کو نہیں کہتے کہ لوگوں سے وحشت اور بیگانگی کا برتاؤ کیا جائے۔ اور یہ خیال موجبِ فخر و فائدہ ہو کہ ہم دنیا سے آزاد ہو گئے نہیں بلکہ بیگانگی و وحشت اپنے نفس سے کی جائے، اس کا نام آزادی ہے۔

مستجابِ فوتِ فرصت ہستی کا غم کوئی عمر عزیز صرف عبادت ہی کیوں نہ ہو فرماتے ہیں۔ وقت کے ضائع ہونے اور گزرنے کا غم ایسا ہے کہ جس کا غم ابدل ممکن ہی نہیں۔ عمر عزیز اگر صرف عبادت بھی ہو تو بھی اس کا غم کرنا چاہئے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر عبادت سے جڑ کر اور کوئی اچھا کام کیا جاتا تو ممکن ہے کہ زیادہ موثر اور سودمند ہوتا۔

اس فتنہ خو کے ڈر سے اب اٹھتے نہیں آسند اس میں ہمارے سر پہ قیامت ہی کیوں ہو  
 فرماتے ہیں۔ اے آسند ہم تو اب اس فتنہ گر کے ڈر سے اٹھتے نہیں۔ بلا سے ہمارے سر پر  
 قیامت ہی کیوں نہ گزر جائے لطف اس شعر میں یہ ہے کہ روز قیامت میں سب  
 اٹھیں گے مگر ہم جب بھی نہیں اٹھیں گے۔

### غزل

قفس میں یوں گرا تپتا بھی جانیں سحر شیون کو ہرا ہونا بُرا کیا ہے نوا سبجان گلشن کو  
 فرماتے ہیں۔ مجھے گرفتار رنج و محن اور سرگرم نالہ و فریاد دیکھ کر میرے وہ دوست  
 جو زمانے کی گردشوں سے محفوظ اور دنیا کے رنج و آلام سے بچے ہوئے ہیں کیوں نفرت  
 ظاہر کرتے ہیں، میں نے ان کا کیا بگاڑا ہے۔

نہیں گریہ سہمی آساں ہو یہ رشک کیا کم ہے نہ دی ہوتی خدا یا آرزو کے دوست دشمن کو  
 فرماتے ہیں کہ تو میں نے مانا کہ میرا سا جوش عشق اور نالہ و گداز میرے دشمن کو نہیں  
 ملا ہے لیکن یہ رشک کیا کم ہے کہ میری طرح وہ بھی آرزو کے دوست رکھتا ہے  
 یارب العالمین یہ آرزو دشمن کو نہ دی جاتی تو بہتر تھا۔

نہ نکلا اکٹھے سے تیری اک آنسو اس جراحت پر کیا سینہ میں جس نے خونچکاں مزرگان سوزن کو  
 فرماتے ہیں تیری اکٹھے سے ان زخموں کا حال میں کرایک آنسو بھی نہ نکلا۔ جن زخموں کو میرے  
 دل میں دیکھ کر سوزن غم کی آنکھوں سے خون جاری ہو گیا۔

خدا خدائے ہاتھوں کو رکھتے ہیں کشمکش میں کبھی سیب گریبان کبھی جاناں کے دامن کو  
 میرزا صاحب نے اس شعر میں یہ خونخو بھری ہے کہ اپنے جوش عشق اور دھور شوق کا  
 الزام بے گناہ ہاتھوں پر لگا دیا ہے۔

ابھی ہم قتلگاہ کا دیکھنا آساں سمجھتے ہیں نہیں دیکھا خدا اور جوئے خوں میں تیرے تون گ  
 فرماتے ہیں۔ ابھی تک ہم قتل گاہ کا تماشا دیکھنا آساں ہی سمجھے ہوئے ہیں۔ تیری سواری

کے گھوڑے کو خون کے دریا میں تیرنے ہوئے نہیں دیکھا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم سمجھتے ہیں ہمارا قاتل گردہ عشتاق میں سے ایک خوش نصیب عاشق کو انتخاب کر کے خنجر ناز یا تیغ غمزہ سے شہید کر دے گا، یہ نہیں معلوم کہ اس تماشے کے بعد اتنے آدمی رشک سے اپنے گلے کاٹیں گے کہ خون کا دریا بہہ جائے گا۔

ہوا چرچا جو میرے پاؤں کی زنجیر بننے کا کیا بتا بکال میں جنبش جو ہرنے آہن کو فرماتے ہیں۔ میری دیوانگی کا رتبہ اس بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ میرے پاؤں کی زنجیر بنائے جانے کا چرچا سن کر فولاد کو جو ہر فولاد نے معدن میں بیتاب کر دیا یعنی وہ یہ چاہتا تھا کسی طرح کان سے باہر آکر اس دیوانہ کی زنجیر یا بن جاؤں۔

خوشی کیا کھیت پر میرے اگر توبار ابر کئے سمجھتا ہوں کہ ڈھونڈتے ہو ابھی برق خرمین کو فرماتے ہیں۔ میرے کھیت پر بار بار کا آنا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ یہ میری زراعت کی پرورش کے لئے آتا ہے۔ بات یہ ہے کہ یہ پہلی ابھی سے میرے خرمین کو تلاش کر رہی ہے اور اس کی جستجو میں دوڑ دوڑ کر آتی ہے۔ مطلب یہ ہے میں ایسا نامراد شخص ہوں کہ جس کی ساری کوشش بے کار ثابت ہوتی ہے۔

وفاداری بشرط استواری اصل ایمان ہے مرے بچانے میں کعبہ میں گاڑوہر بہن کو یعنی جب برہن اپنی ساری عمر بیت خانہ میں کاٹ دے اور وہیں مر رہے تو وہ اس بات کا مستحق ہے کہ اس کو کعبہ میں دفن کیا جائے اس لئے کہ اس نے وفاداری کا پورا پورا حق ادا کر دیا اور یہی ایمان کی اصل ہے (از یادگار غائب)

شہادت تھی مری قسمت میں دی تھی یہ جو مجھ کو جہاں تلوار کو دیکھا جھکا دیتا تھا گردن کو فرماتے ہیں۔ میری قسمت میں مرتبہ شہادت کبھی دیا گیا تھا اسی واسطے کہ جو یہ عادت عطا ہوئی تھی کہ جہاں تلوار کو دیکھتا تھا گردن جھکا دیتا تھا۔ گویا تلوار میری آنکھوں میں محراب عبادت کا کام دیتی تھی۔ نہایت بیخ اور پر لطف شعر ہے۔

نہ لٹنا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا رہا کھٹکانہ چوری کا دُعا دیتا ہوں زمین کو  
اس شمر کا یہ مطلب ہے کہ انسان دنیا میں آرام اسی صورت میں پاسکتا ہے جب تعلقات  
دنیوی کو دل سے مٹا دے۔

سمن کیا کہ نہیں سکتے کہ جو یاں ہیں جو اہر کے جگر کیا ہم نہیں رکھتے کہ کھو دیں جا کے معدن کو  
فرماتے ہیں جگر کا دی کے ساتھ شمر کو سوزوں کر نامعدن کو کھود کر جو اہر بھالنے سے بدرجا  
ہمتر ہے۔

ہرے شاہ سلیمان چاہئے نسبت نہیں غالب فرید دن و جم و دیکھو دراب و بسمن کو  
میرزا صاحب کا مدعا شاہ سلیمان جاہ کئے سے یہ ہے کہ بادشاہ مسلمان تھے اور نہایت  
دیندار یہ سب بادشاہ جن کا مصرعہ شافی میں ذکر کیا ہے کافر تھے۔ وجہ فرقیّت ثابت ہے۔

### عَنْزَل

دھوتا ہوں جب میں نے کو اس سیم تن کے پائو رکھتا ہوں خند سے کھینچ کے باہر لگن کے پائو  
پائو دھو کر پینا غماز جوش محبت کا استعارہ ہے۔ باقی شعر کے معنی صاف ہیں۔  
دی سادگی کی زبان چروں کو کہن کے پائو ہسپات کیوں نہ ٹوٹ گئے پیرزن کے پائو  
میرزا صاحب کے زمانہ میں یوقونی آدمی کو بنانے کے موقع پر کہا کرتے تھے تو اس کے  
پائو پڑے اب ایسے موقع پر کہتے ہیں ان کا پاؤ پوجئے شعر کا مطلب یہ ہے کہ فراد  
نے یوقونی سے ایک عیار کے دم میں آکر جو پیرزن کا بھیس بدل کر آیا تھا جان  
دے دی۔

بھاگے تھے ہم بہت سو اسی کی سزا یہ ہو کر اسیر دابے ہیں راہزن کے پائو  
مطلب یہ ہے کہ تقدیر الہی کے خلاف کوشش بیکار ثابت ہو کر قی ہے اور اگر اثر آئے  
نتیجہ برعکس ہوتا ہے۔

مریم کی جستجو میں پھرا ہوں جو دور دور تن سے سوانگاریں اس خستہ تن کے پائو

مطلب یہ ہے، جستجو سے جو ہر مراد ہمیشہ نہیں ملا کر، ابھی مل جائے۔

اللہ سے ذوقِ دشمنِ نوری کہ بعدِ مرگ ملتے ہیں خود بخود مرے اندر کفن کے پاؤں فراتے ہیں۔ شوقِ صحرا نوری مرنے کے بعد بھی میرے ساتھ ہے زندگی میں دُنیا کے جنگلوں میں پھرتا تھا۔ موت کے بعد میدانِ عدم طے کر رہا ہوں۔ بالکل اچھوتا خیال ہے۔ بے جوشِ گل بہار میں ان تک کہ ہر طرت اُڑتے ہوئے اُکھٹتے ہیں مرغِ چمن کے پاؤں میرزا صاحب نے اس شعر میں عجب نزاکتِ معنی سے کلام ایسا ہے۔ مطلب یہ ہے اس بہار کے ساتھ چمن میں بہار آئی ہے کہ جو پرندے بارغ پر اُڑتے ہوئے گزرتے ہیں۔ وہ تماشا گلِ دلِ دیکھ کر دل گرفتہ ہو جاتے ہیں اور آگے جانے کا ارادہ فسق کر کے وہیں اُتر پڑتے ہیں۔

شب کو کسی کے خواب میں آیا نہ ہو کہیں دُکھتے ہیں آج اُس بُتِ نازکِ بدن کے پاؤں فراتے ہیں۔ آج اُس بُتِ نازکِ بدن کے پاؤں دُکھتے ہیں۔ شاید کہیں گیا ہو گا جانے کے خیال کے ساتھ رشک نے اس بات کی اجازت نہ دی کہ اس کا بیداری میں جلنا بیان کیا جائے، اس لئے یہ بات بنائی گئی کہ شاید وہ خواب میں کسی کے پاں گیا ہو گا۔

غائبِ مرے کلام میں کیونکر مزا نہ ہو پیتا ہوں صبح کے خسر و شیریں سخن کے پاؤں خسر و شیریں سخن کا اشارہ بہادر شاہ ثانی المتخلص بہ ظفرِ آخر بادشاہِ دہلی کی طرف ہے۔ باقی شعر صاف ہے۔

### قطعہ

داں اسکو ہولِ دلِ جو توں میں میں شرسار یعنی یہ میری آہ کی تاشیر سے نہ ہو جوشِ محبت کی کیا خوب تصویر کھینچی ہے۔ مَشُوق کو کوئی تکلیف یا بیماری پیدا ہو جاتی ہے تو عاشق اپنی آہ یا دُعا یا جذبہٴ دل کے اثر سے اس کا ہونا سمجھا کرتا ہے۔

اپنے کو دیکھتا نہیں ذوقِ ستم کو دیکھ آئینہ تاکہ دیدہء نچھیر سے نہ ہو  
 فرماتے ہیں۔ جب تک دیدہء شکار کا آئینہ رو برو نہ ہو وہ ستم آرا اپنا سکہ نہیں  
 دیکھتا ہے۔

### غزل

داں پہنچ کر جو غش آتا یہ ہم ہے ہم کو صدرہ آہنگ زریں بوسِ قدم ہے ہم کو  
 فرماتے ہیں۔ کوچہ یار میں پہنچ کر جو ہم کو یہم غش آتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ہماری  
 ناتوانی اور کمزوری میں یہاں تک پاؤں نے پہنچا دیا۔ اس احسان کا ہم یہ بدلہ کرنا  
 چاہتے ہیں کہ اپنے قدم چومنے کے ارادہ سے اس زمین پر گر پڑتے ہیں جس پر ہمارا  
 نقشِ قدم ہوتا ہے۔

دل کو میں اور مجھے دلِ محوِ وفا رکھتا ہے کس قدر ذوقِ گرفتاری ہم ہے ہم کو  
 فرماتے ہیں۔ دل کو میں محوِ وفا رکھتا ہوں اور مجھ کو دلِ محوِ وفا رکھتا ہے آپس میں ہم  
 دونوں ایک دوسرے کو گرفتارِ وفا رکھنا چاہتے ہیں۔

ضعف کا نقش پہلے سور ہے طوقِ گردن تیرے کوچہ سے کہاں طاقتِ رم ہے ہم کو  
 فرماتے ہیں۔ جیونئی کا نقش قدم ہم سے کمزور آدمی کے واسطے طوقِ گردن کا حکم  
 رکھتا ہے اتنے بھاری بوجھ کو لے کر ہم کو تو تیرے کوچہ سے بھاگ سکتے ہیں۔

جان کر کچھ تغافل کہ کچھ اُمید بھی ہو یہ نگاہِ غلطِ انداز تو ستم ہے ہم کو  
 فرماتے ہیں۔ جان کر یہی سمجھ کر ارادہ کے ساتھ مجھ سے چشم پوشی کیجئے تو مجھ کو رحم  
 آجانے کی اُمید بندھ جائے لیکن ایسی نا آشنا نظر سے دیکھ لینا تو میرے لئے  
 زہر سے کم نہیں ہے۔

ریشک ہم ملرچی و درد اثرِ بانگِ خیز نالہء مرغِ سحر تیغِ دو دم ہے ہم کو  
 فرماتے ہیں۔ ایک تر ہنوائی کا ریشک دوسرے دردِ فریاد کا اثرِ ان دونوں باتوں نے

نالہ مرغِ سحری کو میرے واسطے ہرڑواں بارِ جد کی تلوار بنا دیا ہے۔

سر اٹھانے کے جو وعدے کو کر چاہا ہنس کے بولے کہ تیرے سر کی قسم ہے ہم کو  
اس شعر میں دو معنی پیدا ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ تیرے سر کی قسم ہم ضرور تیرا سر کاٹیں گے  
اور دوسرے معنی یہ ہیں کہ تیرا سر کاٹنے کی ہم کو قسم ہے۔ ہم تیرا سر ہرگز نہ کاٹیں گے۔  
معاورہ میں اسی طرح بولا جاتا ہے۔ یعنی آج ہم کو پانی پیئے کی قسم ہے۔ آج ہم پانی  
نہ پئیں گے۔

دل کے خون کر نیکی کیا وجہ ولیکن ناچار پاس بے رونقئی دیدہ نم ہے ہم کو  
فرماتے ہیں۔ دل کے خون کرنے کی کوئی خاص وجہ نہیں ہے۔ صرف اس مجبوری سے  
دل کو خون کرتے ہیں کہ بغیر احکامِ خونی کے آنکھیں ذرا بے رونق ہی معلوم ہوتی ہیں۔  
تم وہ نازک کہ خموشی کو فغاں کہتے ہو ہم وہ عاجز کہ تغافل بھی قسم ہے ہم کو  
فرماتے ہیں تم اس قدر نازک ہو کہ فغاں ترک کر دینے کے بعد ہماری خاموشی کو  
بھی فغاں کہتے ہو۔ اور ہم اتنے کمزور ہیں کہ قسم سو فوٹ کر کے تم نے تغافل اختیار  
کیا تو ہمارے حق میں اس نے بھی قسم کا کام دیا۔

قطع

لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا یعنی ہوسِ سیر و تماشا سودہ کہہ ہے ہم کو  
فرماتے ہیں لکھنؤ آنے کا کچھ سبب ہم پر ظاہر نہیں ہوا یعنی سیر و تماشا کی غرض سے  
انسان سفر کیا کرتا ہے تو دونوں باتیں نہیں ہیں۔

مقطع سلسلہ شوق نہیں ہے یہ شہر عزمِ سیرِ نجف و طوافِ حرم ہے ہم کو  
فرماتے ہیں۔ یہ شہر سلسلہ شوق کا مقطع نہیں ہے۔ یعنی اس کا ختم کرنے والا نہیں  
ہے۔ سیرِ نجف اور طوافِ حرم کا ارادہ ہم کو ہے۔

لئے بجاتی ہے کہیں ایک توقعِ غالب جادہ رہ کششِ کافِ کرم ہے ہم کو

میرزا صاحب بمرض استفاہ پیش کشکلتے جاتے ہوئے چند ماہ مکھنٹو اور بنارس میں ٹھہرے تھے، اس مقطع میں اسی بات کی طرف اشارہ ہے۔

### غزل

تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو  
فرماتے ہیں۔ غیر کی رسم و راہ کے ساتھ اگر مجھ سے بھی ربط و ضبط رہے تو یہ کچھ بُری  
بات نہیں ہے ترک ملاقات سے کیا فائدہ ہوگا۔

بچتے نہیں مواخذہ روزِ حشر سے قاتل اگر رقیب ہے تو تم گواہ ہو  
فرماتے ہیں۔ تم کسی طرح مواخذہ حشر سے بچ نہیں سکتے۔ یہ میں نے مانا کہ میرا قاتل  
رقیب ہے یعنی اس کی طبع و فطرت نے مجھ کو قتل کیا ہے لیکن گواہی میں تم بھی ضرور  
پیش ہو گے۔

کیا وہ بھی بیگنہ کش و ناحق شناس ہیں مانا کہ تم بشر نہیں خورشید و ماہ ہو  
فرماتے ہیں۔ کیا خورشید و ماہ بھی تمہاری طرح بے گناہ قتل کرنے والے اور حق نہ  
پہچاننے والے ہیں۔ یہ تو میں نے مانا کہ تم بشر نہیں ہو۔ خورشید جمال اور راہ پیکر ہو۔  
اُبھرا ہوا نقاب میں ہو اُن کے ایک تار مڑا ہوں میں کہ یہ نہ کسی کی نگاہ ہو  
فرماتے ہیں۔ اس کی نقاب میں ایک تار اُبھرا ہوا ہے۔ مجھے اُس کو دیکھ کر یہ خوف  
پیدا ہوتا ہے کہ یہ کسی مشتاق جمال کی نگاہ تو داخل نقاب نہیں ہو گئی ہے۔ میرزا صاحب  
نے اس شعر کا مصرعہ اولیٰ بے مثل لکھا ہے۔ ثبوت دعویٰ کے واسطے اس سے بہتر  
خیال کا بہم پہنچنا ممکن نہیں۔

جب میکہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید مسجد ہو۔ در رس ہو، کوئی خانقاہ ہو  
اس شعر میں از راہ تہذیب اس کا ذکر نہیں کیا جس کے کرنے کے لئے مسجد و در رس  
و خانقاہ کو مساوی قرار دیتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میکہ جہاں حریفوں کے ساتھ



شراب پینے کا لطف تھا جب وہی چھٹ گیا، اب مسجد میں مل جائے تو اور بدرستہ  
و خالقانہ میں ہاتھ آجائے تو سب جگہ پی لینی برابر ہے۔ مسجد وغیرہ کی تخصیص  
ازراہ شوخی کے کی گئی ہے یعنی یہ مقامات جو اس شغل کے بالکل لائق نہیں ہیں  
وہاں بھی میکہ چھٹنے کے بعد پی لینے سے انکار نہیں ہے اور شراب پینے کی تصریح  
نہ کرنا عین مقتضائے بلاغت ہے۔ (از یادگار غائب)

مُسْتَعِی ہیں جو بہشت کی تعریف درست لیکن خدا کرے وہ تیری جلوہ گاہ ہو  
فرماتے ہیں۔ بہشت کی جو کچھ تعریف ہم مُسْتَعِی ہیں وہ سب بجا و درست ہے ہم کو  
اس کی اور خوبیوں سے کچھ غرض اور مطلب نہیں ہے لیکن خدا ایسا کرے کہ وہ  
تیری جلوہ گاہ قرار پا جائے تو سب کچھ ہے ورنہ کچھ بھی نہیں۔

غائب بھی گرنے ہو تو کچھ ایسا ضرر نہیں دُنیا ہو یا رب اور میل بادشاہ ہو  
فرماتے ہیں غائب کا سنا باکمال شاعر اگر دربار میں نہ ہو تو اس سے کچھ نقصان نہیں  
پہنچتا لیکن یارب دُنیا ہو اور اس میں میرا ممدوح بادشاہ زندہ سلامت رہے۔

### غزل

گئی وہ بات کہ ہو گفتگو تو کیونکر ہو کسے سے کچھ نہ ہوا پھر کہو تو کیونکر ہو  
فرماتے ہیں۔ وہ زمانہ گزر گیا کہ جب ہم یہ سوچا کرتے تھے کہ ان سے اظہار کی تمنا  
کی ابتدا کیونکر اٹھانی چاہیے خوش نصیبی سے ہمیں ایسا موقع مل گیا کہ بہت سی فکر  
کے بعد جو ایک تجویز ہم نے سوچی تھی اس کے موافق ہم نے ایک ایسی چوڑی تقریر کی  
اور انھوں نے وہ سب سنی مگر اس کا نتیجہ کچھ بھی نہ نکلا۔ اب کیونکر ہمارا کام بنے۔  
مطلب یہ ہے کہ ہم نے سب کچھ کہا مگر ان پر اثر خاک بھی نہ ہوا اور ہمارے کہنے کا  
کچھ بھی نتیجہ نہ نکلا اب کیا کریں مجبور ہیں۔

ہمارے ذہن میں اس فکر کا جو نام و سال کہ گرنے ہو تو کہاں جائیں ہو تو کیونکر ہو

ہمارے نزدیک اسی کا نام وصال ہے کہ پہرے بیٹھے ہوئے یہ سوچا کرتے ہیں کہ اگر وصل یا رخصتہ خواستہ نصیب نہ ہو تو ہم کیا کریں گے۔ کہاں جائیں گے اور اگر ہر گاہ تو کیونکر ہو گا اس کے لئے کیا سائبان ہونے چاہئیں۔ کس قسم کی کوشش کی جائے۔ ادب ہے اور یہی کشمکش تو کیا کیجئے حیا ہے اور یہی گونگوں تو کیونکر ہو فرماتے ہیں۔ ارمان۔ شوق۔ تمنا ہم کو اس بات پر مجبور کرتے ہیں کہ ہم اپنی مراد دلی حاصل کریں مگر ادب روکتا ہے اور ان دونوں فریقوں میں باہم کشمکش پیدا ہو جاتی ہے ان کی حیا ان کو صاف جواب نہیں دینے دیتی۔ ان کی طرف سے گونگوں میں بات جا بڑتی ہے اب کامیابی حاصل ہو تو کیونکر ہو۔

تھیں کہو کہ گزارا صنم پرستوں کا۔ بتوں کی ہو اگر ایسی ہی خو تو کیونکر ہو فرماتے ہیں۔ ہم تھیں سے پوچھتے ہیں۔ تم ہم کو یہ بات بتا دو کہ صنم پرستوں کا گزارا یعنی ان کا حصول دعا کس طریقہ سے حاصل ہو اگر سارے جہان کے معشوقوں کی ایسی عادت ہو جائے کہ جیسی تمھاری ہے کسی بات کو ماننے ہی نہیں۔ ہر سوال پر انکار کر دیتے ہو۔

اُکھٹے ہو تم اگر دیکھتے ہو آئینہ جو تم سے شہر میں ہیں ایک وہ تو کیونکر ہو اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ جب تم جیسے نازک مزاج شہر میں ایک دو اور ہوں تو خسر کا کیا حال ہو۔ اور دوسرے معنی یہ ہیں کہ جب تم کو اپنے عکس کا ہی اپنی مانند گوارا نہیں تو شہر میں اگر فی الواقع تم جیسے ایک دو حسین موجود ہوں تو تم کیا قیامت برپا کرو۔

جسے نصیب ہو روز سیاہ میرا سا وہ شخص دن نہ کے رات کو تو کیونکر ہو اس دن کی سیاہی کیسی ہوگی جس کے آگے رات بھی دن معلوم ہوتی ہے (از یاد کا رغبہ) ہمیں پھر ان سے اُمید اور انھیں ہمارے اندر ہماری بات ہی پوچھیں وہ تو کیونکر ہو

فرماتے ہیں۔ ہم کو ان سے کسی بھلائی کی امید کیونکر ہو اور ان کو ہم جیسے جانناز عاشق کی قدر ہو تو کیونکر جب وہ ہماری بات ہی نہ پوچھیں اور ہم سے اپنے دل کا کوئی مدعا بھی نہ کہیں اور جان نثاری کا موقع بھی نہ دیں۔

غلط نہ تھا ہمیں خط پر رگیاں تسلی کا نہ مانے دیدار جو تو کیونکر ہو فرماتے ہیں۔ ہمارا یہ گمان غلط نہ تھا کہ ان کے خط سے ہمارے دل کو تسلی ہو جائیگی ہمیشہ دنیا میں ایسا ہوتا ہے کہ معشوق کی تحریر سے عاشق کی بیتابی کم ہو جایا کرتی ہے مگر یہاں بد نصیبی سے دیدار طلب نے دل مضطر سے بھی زیادہ پاؤں پھیلانے وہ کمبخت کسی طرح اس کے خط سے ہلنا ہی نہیں اور یہی ضد کے جاتا ہے کہ میں تو اس کا دیدار ہی دیکھوں گا اب تسلی ہو تو کیونکر ہو۔

بتاؤ اس کی مرثہ دیکھ کر کہ مجھ کو قرار یہ نیش ہو رگ جاں میں فرد تو کیونکر ہو فرماتے ہیں۔ سائے حضرت ناصح آپ کا یہ ارشاد کہ تو پنجاب نہ ہو اور صبر کر میرے سر سمجھوں پر مگر ذرا اس ظالم کی ہلکوں کو دیکھ کر فرمائیے کہ ایسے فخر جب دل میں چھپے ہوئے ہوں تو صبر و قرار کیونکر ہو۔

مجھے جنوں نہیں غالب دے بقول حضور فراق یار میں تسکین ہو تو کیونکر ہو فرماتے ہیں۔ اسے غالب میں کچھ دیوانہ تو نہیں ہوں کہ خواہ مخواہ بے قرار اور پریشان رہوں بقول حضور کے (حضور سے مراد ظنل سبحانی بہادر شاہ ثانی المتخلص بظفر بادشاہ آخر دہلی ہیں یہ مصرعہ ثانی ان کا ہے) فراق یار میں تسکین کا کوئی پہلو کچھ میں نہیں آتا اب تسکین ہو تو کیونکر ہو۔

## غزل

کسی کو دیکھے دل کوئی نواسخ فغاں کیوں نہ ہو جب دل ہی سینہ میں تھم چڑھ میں باں کیوں ہو فرماتے ہیں۔ کسی پر عاشق ہو مگر فریاد و فغاں کرتے رہنا مٹانی شان عشق ہے۔ عاشق

کو خاموش رہنا چاہئے۔ گویا پردہ داری عشقِ شاہی عاشقی ہے۔ جب دل سینہ میں نہ ہو اور وہ کسی کو دے دیا جائے تو لازم ہے کہ زبان بھی منہ میں نہ ہو۔ اس کو بھی کاٹ کر پھینک دینا چاہئے یا کیل دینا مناسب ہے۔ کیا خوب مطلع فرمایا ہے۔ وہ اپنی خونہ پھوڑیں گے ہم اپنی ریشہ نژادیں جبکہ سر جی کیا پرچیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو اس شعر کا مضمون نثر کے فقرہ میں بھی اس برجستگی کے ساتھ ادا نہیں ہو سکتا جس طرح میرزا صاحب نے ان دو مصرعوں میں ادا کیا ہے۔ قنادِ انکلامی کی صد ہو گئی۔ فرماتے ہیں وہ اپنے روٹھے رہنے کی عادت نہ چھوڑیں گے۔ ہم اپنی خود داری کی وضع کیوں ترک کریں حقیرین کو ان سے کیا پوچھیں کہ ہم سے اکوڑہ کیوں ہو۔

کیا غمخوار نے سرا لگے آگ اس محبت کو نہ لائے تاب جو غم کی وہ میسر از داں کیوں ہو فرماتے ہیں۔ رازِ عشق ہم نے تو چھپایا تھا مگر ہمارے غمخوار کی بتائیوں نے اس کو ظاہر کر دیا اس محبت کو آگ لگے جس کی وجہ سے ہمارا غمخوار ہماری مصیبتوں کو دیکھ کر گھبرا گیا جو رنج و غم کی تاب نہ لاسکے وہ کج محبت ہمارا راز داں ہی کیوں بنے۔ ادائے مطلب میں بلاغت ختم ہو گئی۔

وفا کیسی کہاں کا عشق جب پھوڑا ٹھہرا تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگ آستان کیوں ہو فرماتے ہیں۔ وفا داری کیسی اور عشق و محبت کیا۔ جب سر پھوڑ کر مرجانے ہی کی ٹھکان لی تو پھر نہ کورہ بالا دونوں باتوں کا پاس اور خیال کیسا اور جب سر پھوڑ کر مرجانے کی تجویز دل میں قرار پا ہی چکی تو پھر اے سنگ دل تیرے سنگ آستان کو کیا احتیاج ہے۔ یہ نہیں اور کسی پتھر سے سر پھوڑ لیں گے جو اہر کے ٹکڑے ہیں الفاظ نہیں ہیں۔ قفس میں بچہ سے رد و اوجہ کہتے نہ ڈر ہمدم گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آستان کیوں ہو فرماتے ہیں۔ اے ہمدم، یعنی اے ہمصفر تو آج ہی گرفتار ہو کر چین سے آیا ہے اور میں بہت دنوں سے اسیرِ قفس ہوں تو مجھے یہ تو بتادے کہ چین کی کیا حالت ہے اور تو اس کے بیانی

کرنے میں جھجکتا کیوں ہے۔ صاف صاف کہہ۔ رواداد میں بیان کر دے۔ کل جس آشیانہ پر بجلی گری ہے وہ شاید میرا آشیانہ ہو تو اس کے بیان کرنے میں پس و پیش نہ کر۔ ایسا بلج شو اور پھر اس زمین میں مرزا کے سوا کون کہہ سکتا ہے۔ یہ کہہ سکتے ہو ہم دل میں نہیں ہیں پر یہ بتلاؤ کہ جب تئیں تم ہی تم ہو تو آنکھوں سے نہا کیوں ہو اس شعر میں مخاطب معشوق حقیقی ہے۔ فرماتے ہیں یہ تو تم کہہ نہیں سکتے کہ ہم دل میں نہیں ہیں مگر ہم کو یہ بتادو کہ جب دل میں تم ہی تم ہو اور کوئی دوسرا نہیں ہے تو پھر آنکھوں سے پوشیدہ کیوں ہو جس طرح دل میں رہتے ہو اُسی طرح آنکھوں کے سامنے بھی رہا کرو۔

غلط ہے جذب دل کا شکوہ دیکھو جو کس کالج نہ کھینچو گر تم اپنے کوشا کوش دریاں کیوں فرماتے ہیں غم جو مجھ سے میرے جذب دل کی شکایت کرتے ہو کہ یہ ہم کو اپنی طرف کھینچتا ہے غلط ہے خیال کر کے دیکھو اس میں تصور کس کا ہے، یعنی میرا یا تمہارا ساگر تم سے نہ کھینچو تو آپس میں کشاکش کیوں ہو۔ مطلب یہ ہے کہ تم مجھ سے کھینچتے ہو میرا جذب دل تم کو کھینچتا ہے باہم کشمکش کی صورت پیدا ہو گئی ہے۔

یہ فتنہ آدمی کی خانہ دیرانی کو کیا کم ہے ہو تم دوست جس دشمنی اسکا آسمان کیوں فرماتے ہیں یہ فتنہ تمہارا دوست ہونا خانہ دیرانی کے لئے کافی ہے۔ تم جس کے دوست ہو آسمان اُس کا دشمن کیوں ہو۔ یعنی تمہاری دوستی اس کے برباد کر دینے کے لئے ہر پہلو سے کافی ہے۔ آسمان کو کیا ضرورت پڑی ہے کہ وہ بھی دشمنوں میں اپنا نام لکھوا سکے۔

یہی ہے آزمائش اتنا کس کو کہتے ہیں عدد کے ہولے جب تم تو میرا امتحان کیوں فرماتے ہیں۔ جب تم ہمیشہ کے واسطے دشمن کے ہولے اور اس کے عمر بھر پناہ دینے کا وعدہ کر چکے تو پھر میرے مشق و محبت اور وفادار موت کا امتحان کیوں لیتے ہو۔ تم

بیری آزمائش تو نہیں کرتے بلکہ ظلم کرتے ہو۔

کہا تم نے کہ کیوں ہونے کے لئے میں رسوائی بچا کئے ہو سچ کئے ہو پھر کہو کہ ہاں کیوں ہو فرماتے ہیں کہ تم نے جو یہ کہا کہ غیر سے ملنے ہیں بدنامی دُرُسوائی کیوں ہو، کیا وجہ ہے بچا کئے ہو سچ کئے ہو۔ پھر دوبارہ تو کہو کہ ہاں رسوائی کیوں ہو۔ مطلب یہ ہے کہ رسوائی تو ضرور ہوگی تمہاری خاطر سے کہو تو کہہ دوں کہ ہاں غیر سے ملنا رسوائی کا موجب نہیں ہے۔ نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو غالب ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہر ہاں کیوں ہو میرزا صاحب نے یہ ساری غزل مرصع لکھی ہے۔ ایک ایک شعر کا جواب نہیں ہے اور مقطع سونے پر ساگہ کا کام دے رہا ہے۔ فرماتے ہیں۔ اے غالب تو انجائے موقع پر ملنے دے کر اپنا کام نکالا چاہتا ہے۔ اپنے دل میں یہ تو سمجھ کہ وہ ترے بے مہر کہنے سے تجھ پر مہر ہاں کیوں ہو۔ خوبی اس مقطع میں یہ رکھی گئی ہے کہ معشوق کی عادت کوئی شوخی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ ہمیشہ کہنے کے خلاف کیا کرتا ہے۔ اور یہ بات سمجھ کر اُس کو نہ مہر ہاں کہا ہے کہ وہ اپنی قدیم ضد کے موافق مہر ہاں ہو جائے یعنی جو اس سے کہا جاتا ہے وہ اس کے برعکس ہوتا ہے۔

### قطع

رہے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہنر ہاں کوئی نہ ہو فرماتے ہیں۔ تجھ کو اپنے دوستوں بہو طوں۔ ہساریں۔ ہمدموں۔ ہم سخنوں سے اتنے رنج و ملال پہنچے ہیں کہ اب میں ایسے مقام پر جا کر رہنا چاہتا ہوں کہ جہاں یہ سب ذات شریف نہ ہوں۔

بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہئے کوئی ہسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو فرماتے ہیں۔ کسی میدان میں کڑیاں کڑی کر کے ایک چھتر ڈال لینا چاہئے جو گھر کا بھی کام دے اور اس میں در و دیوار بھی نہ ہوں۔ دروازہ نہ ہو گا تو پاسباں کی

کیا احتیاج رہے گی اور دیوار نہ ہوگی تو کوئی ہمسایہ میں آکر کیونکر رہے گا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں کسی سے میل جول نہ رکھا جائے تو رنج نہ پہونچے گا۔  
 پڑیے گریہ بیمار تو کوئی نہ ہوتا بیمار اور اگر مر جائے تو نوحہ خواں کی نوبت فرماتے ہیں۔ ایسے غیر آباد مقام پر نصیب دشمنان اگر بیمار پڑ جائے تو ان دشمنوں میں سے کہ جن سے رنج پہونچے ہیں کوئی تیمار دار بن کر نہ آئے گا اور اگر خدا نخواستہ مر جائے تو ان ظالم دوستوں میں سے جنہوں نے تکلیفیں دی ہیں۔ بزم ماتم میں نوحہ خواں کوئی نہ ہوگا۔

## (ردیف ہائے ہوز)

از ہر تابہ ذرہ دل دل ہے آئینہ طوطی کوشش جہت مقابل ہے آئینہ فرماتے ہیں۔ ہر سے ذرہ تک عالم میں رخ و رخ اور دل و دل آپس میں آئینہ ہیں۔ اس کو اُس میں اور اُس کو اس میں اپنی ہی صورت نظر آتی ہے مطلب یہ ہے کہ سارا عالم متحد بہ وجود واحد ہے اور ایک ذات کو دوسری ذات سے غیرت نہیں ہے یہ اس میں اپنے کو اسی طرح دیکھتا ہے جس طرح آئینہ میں کوئی اپنی صورت دیکھے جب یہ حال ہے تو طوطی شش جہت میں سے جس طرف منہ کرے آئینہ اُس کے سامنے موجود ہے۔ طوطی کی مثال آئینہ سے استعاراً لکھی گئی ہے۔ مُراد اس دیاں سے وہ صوفی شخص ہے جس کو یہ اتحاد باہمی دکھائی دیتا ہے اور وجد و حال کی حالت میں نور انا الحق بلند کرتا رہتا ہے۔

## عَنْزَل

ہے سبزہ زار ہر درو دیوار غم کدہ جس کی ہمسایہ ہو پھر اسکی خزانہ پوچھ فرماتے ہیں۔ میرے غم کدہ کے دیوار و درایسے منہدم ہو گئے ہیں جن پر برسات کے

موسم میں ہری بھری گھاس اُلگ کر ہبزہ زار کا سماں دکھاتی ہے جس گھر کی بہاریہ ہو،  
 یعنی ایسا اُجھاڑ ہو گیا ہو اس کی خزاں کا حال نہ پوچھو کہ وہ کس قیامت کی ہوگی۔  
 ناچار ہیکسی کی بھی مسرت اُٹھائے دُشواری رہ و ستم ہماراں نہ پوچھ  
 فرماتے ہیں۔ راہ کی دُشواریاں اور ہمارا ہوں کے ستم کا حال مجھ سے نہ پوچھو وہ اس  
 حد تک پہنچ گیا ہے کہ مجبور ہو کر میں نے یہ ارادہ کر لیا ہے کہ اب ہیکسی اور تنہائی کی  
 مسرت اُٹھانی چاہئے اور ایسے دُشوار گزار راستہ میں اس قدر غلاموں کا ساتھ ٹھیک  
 نہیں ہے۔

## ردیف (ی)

### عزل

صد جلوہ رو برو ہے جو خرگاں اُٹھائے طاقت کہاں کہ دید کا احساں اُٹھائے  
 فرماتے ہیں سو جلوے رو برو ہیں اگر آنکھ اُٹھا کر دیکھے یہ طاقت کہاں ہے کہ دید کا  
 احساں اُٹھائے مطلب یہ ہے کہ اس کی قدرت کے گوناگوں تماشے نظر آرہے ہیں۔ یہ  
 کس میں طاقت ہے کہ ان سب کیفیتوں کو دیکھے اور سمجھے۔ آدمی دیکھتے دیکھتے تھک جاتا  
 ہے اور اس کی قدرت کی نیرنگیاں ختم نہیں ہوتیں۔

ہے سنگ پر برات معاش جنون عشق یعنی ہنوز منت طفلان اُٹھائے  
 برات تنخواہ کی چٹھی کو کہتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔ پتھروں پر معاش جنون عشق کی تنخواہوں  
 کی چٹیاں لکھی ہوئی ہیں اس لئے مناسب ہے کہ ابھی اور کچھ دن پتھر مارنے والے  
 لڑکوں کا احساں اُٹھاتے رہنا چاہئے۔ مطلب یہ کہ جنون عشق میں لڑکوں کے ہاتھ  
 سے پتھر کھانے چاہئیں۔

دیوار بار منت مزدور سے ہے خم اے خانماں خراب نہ احساں اُٹھائے



فرماتے ہیں۔ احسان اس قدر جو جمل چیز ہے کہ دیوار میں بھی اس کے اُٹھانے کی طاقت نہیں ہے۔ وہ بھی مزدور کے برابر احسان سے ختم ہو گئی ہے۔ اسے خانہ خراب دُنیا میں رہ کر کسی شخص کا احسان نہ اُٹھا اور دیوار کو دیکھ کر عبرت حاصل کر کہ ایسی مضبوط چیز بھی ایسے سنگین بار کو اُٹھانے کے بعد ختم ہو گئی۔

یا میرے زخمِ شک کو رسوا نہ کیجئے یا پردہٴ بستمِ پنہاں اُٹھائے فرماتے ہیں۔ رنجِ رقیب کے زخم جو میرے دل کے اندر پڑ گئے ہیں اور وہ خندہ زن ہیں۔ یا تو ان زخموں کو رسوا نہ کیجئے اور یا ایسا کیجئے کہ پردہ میں رقیب کے ساتھ چھپ چھپ کر مسکرانا چھوڑ دیجئے۔

### عزل

مسجد کے زیر سایہ خرابات چاہئے بھوں پاس آنکھ قبلہ حاجات چاہئے شہر آنکھ کو میخانہ اور ابرو کو محراب مسجد سے تشبیہ دیا کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔ اے قبلہ حاجات یہ اشارہ واعظ یا تنبیہ کی طرف ہے اس مسجد کے برابر میخانہ ضرور بنا چاہئے۔ جس طرح بچوں کے پاس آنکھ اللہ تعالیٰ نے بنادی۔

عاشق ہوئے ہیں آپ بھی اک اور شخص پر آخر ستم کی کچھ تو مکافات چاہئے فرماتے ہیں۔ ہم جس طرح آپ پر عاشق ہیں اسی طرح آپ بھی ایک اور شخص پر عاشق ہو گئے ہیں اور یہ راز ہم پر کھل گیا ہے۔ آپ نے اپنے عاشقوں پر بہت سے ظلم کیا اور ناروا کئے ہیں آخر ان کا بدلہ کچھ تو آپ کو بھی فدا کی طرف سے ملنا چاہئے۔

وے داداے فلک دلِ حسرت پرست کی ہاں کچھ نہ کچھ تلافیِ مافات چاہئے فرماتے ہیں۔ اے فلک بہت سی حسرتیں تو نے خاک میں ملا دی ہیں۔ اب تو ان حسرتوں کی ہم کو داد ملنی چاہئے۔ میرا دل حسرت پرست بہت متحرم ہو گیا ہے اور کوئی آئندہ تو ہماری گلی پوری کر دے کہ جس سے گزری ہوئی باتوں کی تلافی ہو جائے۔

سیکھے ہیں سرسختوں کیلئے ہم مصوری تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہئے  
 فرماتے ہیں۔ خوبصورت لوگوں کے واسطے ہم نے تصور کی بجائی سیکھی ہے یا یوں سمجھنا  
 چاہئے کہ شاعری سیکھی ہے۔ مسخروں کی ملاقات کے لئے کوئی ذریعہ ہونا چاہئے۔  
 مے سے غرض نشاط ہے کس رو سیاہ کو اک گو نہ بخودی مجھے دن رات چاہئے  
 فرماتے ہیں۔ مے پینے سے میری یہ غرض نہیں ہے کہ نشاط سرور حاصل کروں بلکہ میں تو رنج  
 و غم فراموش کرنے کی غرض سے شراب پیتا ہوں۔ مجھ کو دن رات اک تھوڑی سی بخودی  
 درکار ہے۔

بے رنگ لالہ و گل و نسرں جدا جدا ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہئے  
 فرماتے ہیں۔ لالہ و گل و نسرں کا رنگ علیحدہ علیحدہ ہوتا ہے یعنی لالہ بہت سے رنگوں  
 کا ہوتا ہے مگر اس کے ہر رنگ کے پھول پر داغ ہوتا ہے۔ گل گلاب کے پھول کو کتے  
 میں اس میں بھی بہت سے رنگ ہیں۔ نسرں بیشتر سفید ہوتے ہیں۔ درغایہ ہے کہ رنگوں  
 یا صورتوں کے اختلاف سے غرض نہیں ہے ہر رنگ میں بہار کا ثابت ہونا لازمی  
 ہے۔ بہار سے یہاں ظہور باری تعالیٰ کا خیال مقصود ہے مشرقیوں میں ہے اور  
 خوب ہے۔

### قطعہ

سرپائے خم پہ چاہئے ہنگام بخودی روسے قبلہ وقت مناجات چاہئے  
 فرماتے ہیں۔ بخودی کے وقت سر کو پائے خم پر ہونا لازمی ہے اور مناجات کے وقت  
 منہ کو قبلہ کی طرف ہونا لازمی ہے۔  
 یعنی بحسب گردش پیمانہ صفات عارف ہمیشہ مست ہے ذات چاہئے  
 فرماتے ہیں۔ حسب منشاء گردش پیمانہ صفات۔ عارف کو ہمیشہ ذات سے  
 مست و مرشار رہنا چاہئے۔

نشود نما ہے اصل سے غائب فرغ کو خاموشی ہی سے نکلے بے جوابات چاہئے  
 فرماتے ہیں۔ اصل سے معنی جڑ سے نشیوں کا بڑھنا اور پھولنا پھلنا ہے۔ اسے غائب  
 جوابات انسان کے کُتھ سے نکلتی ہے۔ پہلے آدمی اس کا مطلب سوچ بچھ لیتا ہے جب  
 زبان سے کسی بات کو نکالا کرتا ہے۔ اس سارے قطعہ میں ان ہی تصورات کے خیالات کو  
 باندھا ہے اور ان شعروں میں یہ تین باتیں بیان کی ہیں۔ پہلی بات یہ ہے کہ تمام عالم  
 اجسام کا مبدع جسم و شکل سے منزہ ہے اور اس عالم ظہور سے باہر ہے جس طرح درخت  
 کی شاخیں خواہ وہ کتنی ہی کیوں نہ ہوں لیکن سب کی سب جڑ سے بھوٹ کر نکلتی ہیں۔  
 مگر ان کی جڑ پوشیدہ ہے دوسری مثال یہ ہے کہ ہر بات خاموشی سے نکلی ہے۔ یعنی  
 اس کے معنی اول ذہن میں گزرتے ہیں۔ بعد ازاں اس سے بات پیدا ہوتی ہے اور خود  
 معنی پوشیدہ ہیں۔ تیسری مثال یہ ہے کہ جن میں بہت سے رنگوں کے پھول کھلے ہوئے  
 ہیں اور ہر رنگ کے پھول سے بہار کا وجود ثابت ہے اور خود آنکھوں سے نہاں ہے  
 اور یہ بھی کہتے ہیں کہ رنگ ہر رنگ کے پھولوں سے یہ سبق حاصل کرنا چاہئے کہ ہر رنگ  
 میں انسان اپنے مبدع کو ثابت کرتا ہے۔ کبھی نشتے میں سرشار ہے کبھی زاہد خراب پیدا  
 ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کے یہ سارے رنگ ذات کی صفات ہیں اور یہ ساری  
 صفات اپنے اپنے وقت پر ظاہر ہو کر وجود ذات کی شہادت دیتی ہیں۔

### غزل

بساطِ عجز میں تھا ایک دل یک قطرہ خون بھی سورتا ہی اندازِ چکین سرنگوں وہ بھی  
 فرماتے ہیں۔ بساطِ عجز میں ایک دل تھا اور وہ بھی صرف ایک خون کا قطرہ تھا اس کی  
 حقیقت اس سے زیادہ کچھ بھی نہ تھی مگر چپکنے کے انداز سے وہ کینت بھی سرنگوں رہتا  
 ہے خبر نہیں کس وقت ٹپک جائے۔ انسان کے پہلو میں دل ایک رووے کے ذریعہ سے  
 لٹک رہا ہے۔ اور اس کی وہی صورت ہے جو چپکنے وقت قطرہ خون کی ہوتی ہے مطلب

یہ ہے کہ میرے عشق کا سراپہ جو کچھ تھا وہ ایک دل تھا اب رنج و غم سے سنے سنے اس کی بھی یہ حالت ہو گئی ہے کہ خون کے قطرہ کی طرح ہر وقت ٹپک جانے پر آمادہ رہتا ہے۔  
میں اس شخص سے آزدہ ہم چندے تکلف سے تکلف برطرف تھا ایک انداز جنوں وہ بھی فرماتے ہیں۔ اس شوخ سے تھوڑے دن تک بناوٹ اور قصص سے آزدہ خاطر رہے بکاؤد پاس کیا وہ بھی ایک انداز جنوں تھا پہلے مصرعہ میں تکلف کے معنی بناوٹ کے ہیں اور دوسرے مصرعہ میں شرم و محاذ کے۔

خیال مرگ تب تسکین دل آزدہ کو بخشے مرے دام تنہا میں اک صید زبوں بھی فرماتے ہیں۔ ہمارا آزدہ و غمناک دل مرجانے کے خیال سے بھی کچھ خوش نہیں ہونا چاہیے تینا کے جال میں خیال مرگ بھی ایک مرل سا شکار ہے یہ مطلب یہ ہے کہ عشق کے نزاریں سے مرنے کے بعد بھی چپے کا راہ ہوتا ہوا معلوم نہیں ہوتا اس لئے موت کا خیال بھی کچھ تسلی بخش نہیں ہے۔

آہ! کاش نالہ مجھ کو کیا معلوم تھا بہم کہ ہوگا اعش از آتش دردِ دروں بھی فرماتے ہیں۔ اے بدم کاش میں نالہ نہ کرتا تو بھرتھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ دل کے چھپے ہوئے رنج و غم اس نالہ کے ذریعہ سے ظاہر ہو جائیں گے مطلب یہ ہے میں یہ سمجھتا تھا کہ نالہ میں ضرور اثر ہوگا اور اس کے ذریعہ سے کوئی کامیابی کی صورت نکل کے گی مگر اس کے بے اثر ثابت ہونے سے دلی صدمات اور زیادہ ہو گئے۔

نہ اتنا بڑش تیغ جفا پر نازہ فرماؤ مرے دریائے قیامی میں اک موج خون بھی فرماتے ہیں۔ اے میرے قاتل بڑش تیغ جفا پر تو ایسا مغرور کون ہے۔ یہ میں نے مانا کہ تیرے حتم کی تلوار مجھ کو قتل کر رہی ہے۔ مگر وہ کیا ہے میرے دریائے قیامی کی اک دلی سی موج خون ہے مطلب یہ ہے کہ یہاں دریائے قیامی اس قدر موحزن ہو رہا ہے کہ اس میں ایسی ایسی سیکنگروں تلواریں میرے حلق پر چل رہی ہیں۔

سے عشرت کی خواہش ساقی گردوں کا کیا کچھ لے بیٹھا ہو ایک دو چار جام واڑ گوں بھی  
 فرماتے ہیں۔ شراب عیش و عشرت کی خواہش ساقی فلک سے کس اُسید پر کی جلے۔ دہکن  
 ایک دو چار کٹے ہوئے جام لے بیٹھا ہے۔ ایک دو چار مل کر سات آسمان ہو گئے اور  
 اُٹے ہوئے جام خالی ہوا کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ آسمان کے پیالوں میں شراب عشرت  
 ہے کہاں جس کی ہم غما کریں۔  
 مرے دل میں غائب شوق وصل شکوہ سیرا خدا وہ دن کرے جو اس میں یہ بھی کو وہ بھی  
 یہاں نکلنے نے عجیب لطف دیا ہے۔ وہ معنی پیدا ہو گئے ہیں۔ باقی مطلب تو صرف اتنا ہی ہے  
 خدا وہ دن دکھائے جو میں اس سے شوق وصل بھی کہوں اور شکوہ سیرا بھی کر دوں یعنی کسی  
 طرح اس سے ملاقات کا موقع ملے۔ یہ مقطع بے مثل لکھا ہے۔

### غزل

بے بزم بُتال میں سخن آزرده لبوں سے تنگ آئے ہیں ہم ایسے خوشامد طلبوں سے  
 اس مطلع میں دو معنی پیدا کئے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ اس کی محفل نماز میں رعب فسی سے بات  
 کرتے ہوئے سیرا دل کا پتا ہے اور جو کہنا چاہتا ہوں وہ زبان سے ادا نہیں ہوتا۔ اس  
 مطلب کو میرزا صاحب نے یوں فرمایا ہے کہ سخن خوشامد طلب ہو گیا ہے اس لئے ہمارے  
 ہونٹوں سے بار بار روٹھ کر یہ چاہتا ہے کہ ہم اس کی خوشامد کریں۔ ایسے خوشامد طلبوں سے  
 ہم تنگ آ گئے۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ معشوقوں کو خوشامد طلب کہا گیا ہے اور ان کی جاوید جا  
 خوشامد کرنے کی وجہ سے سخن ہمارے لبوں سے بیزار ہو گیا ہے۔

بے دور قدح وجہ پریشانی صبا کیا رگ دو حتم ہے میرے لبوں سے  
 فرماتے ہیں صبا تر باعث دبستگی ہے اس کو پریشان کرنا زیبائیں ہے اور دور قدح  
 وجہ پریشانی ہے یعنی تھوڑی تھوڑی شراب کمال کر جو دو گوں کو تقسیم کی جاتی ہے۔ بظاہر  
 شراب کے پڑاگندہ اور پریشان ہونے کا سبب ہے ایک یا شراب کے شگے کو میرے منہ

سے نکال دیا کہ میں ڈوگڈھاکر سارا چٹکاپنی جاؤں۔ اس صورت میں شراب ایک ہی جگہ  
 ہے گی جگہ جگہ نہ پھیلے گی۔ اپنے مطلب کی بات اس خوبی سے اور دلیل کے ساتھ  
 بیان کرتی لطف سے خالی نہیں۔

زندگیاں درمیکدہ گستاخ ہیں زاپہ زہنہار نہ ہوا طرٹ ان بے ادبوں کے  
 فرماتے ہیں۔ اسے حضرت زاپہ یہ رندوں کی بھیڑ جو درمیانہ پر جمع ہو گئی ہے یہ لوگ  
 نہایت گستاخ اور حاضر جواب ہیں۔ خبردار آپ ان لوگوں کے ٹھنڈے نہ لگے۔ یعنی ان پاک  
 شہدوں کے سامنے شراب کی مذمت کا بیان نہ فرمائیے گا۔

بیدار و فادیکھ کے جاتی رہی آخر ہر چند میری جان کو تھاربط لبوں کے  
 فرماتے ہیں۔ باوجود کہ میری جان میرے لبوں کی قدم آشنا تھی اور دل سے بہت ہی  
 محبت رکھتی تھی۔ ہمیشہ ہونٹوں پر رہا کرتی تھی لیکن وفا کے ظلم و کجیہ کر اس نے یوفائی  
 اختیار کر لی اور ہمیشہ کے لئے ان دوستوں یعنی لبوں سے رخصت ہو گئی۔

### قطع

تاہم کوشکایت کی بھی باقی نہ رہے جا سکن لیتے ہیں گو ذکر ہمارا نہیں کرتے  
 فرماتے ہیں۔ ہمارے مشوق نے یہ وضع اختیار کر لی ہے کہ اگر کوئی اس کے سامنے ہمارا ذکر  
 چھوڑ دیتا ہے تو وہ اس کو منع نہیں کرتا تو میرے سامنے یہ ذکر نہ کرچو کہ شیخ کرنے میں  
 ایک قسم کی بے مروتی پائی جاتی ہے اس لئے وہ اس بات سے گریز کرتا ہے اور خود بھی  
 ہمارا ذکر کبھی کسی کے سامنے نہیں کرتا اور ان دونوں باتوں سے اس کا مطلب صرت  
 یہ ہے کہ ہم کو اس سے شکایت کرنے کا بھی موقع نہ ملے۔

غائب ترا احوال سنا دیں گے ہم ان کو وہ سُن کے بلالیں یہ اجارا نہیں کرتے  
 کیا خوب مقلع فرمایا ہے اور الفاظ نے کس قدر بلاغت کے پہلو اختیار کر لئے ہیں کہ تعریف  
 نہیں ہو سکتی۔ مطلب یہ ہے کہ اسے غائب تیرا حال کسی خاص موقع پر اپنی جان پر کھیل

ہم ان کو سنا تو دیں گے یعنی آمہ، سخن یا کوئی بات کا پلو نکال کر تیرا ذکر ان کے گوش گزار کریں گے لیکن اس بات کا ذمہ نہیں لے سکتے کہ وہ تیری محبت یا مصیبتوں کا حال سن کر تجھ کو اپنی بزمِ از میں باریابی کی اجازت بھی فرمادیں۔

گھر میں تھا کیا کہ ترا غم کے غارت کرا وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرتِ تعمیر سو بے فرماتے ہیں۔ اگرچہ غمِ عشق نے ہم کو برباد کر دیا لیکن حسرتِ تعمیر کو وہ کبھی غارت نہ کر سکا اور یہی حسرتِ تعمیر ہمارے گھر کی سب سے بڑی پرچی تھی۔ اس کے سوا ہمارے جھونپڑے میں کچھ تھا ہی نہیں کہ جس کو غمِ عشق برباد کرتا۔

### غزل

غمِ دنیا سے گریانی بھی فرصت اٹھانکی فلک کا دیکھنا تقریب تیرے یاد آنے کی یعنی جب غمِ دنیا سے سُر اٹھانے کی فرصت ملتی ہے تو سُر اٹھاتے ہی آسمان پر نظر جا پڑتی ہے۔ اور چونکہ وہ جفا پیشہ ہے اس کے دیکھنے ہی تو یاد آ جاتا ہے اب دوسرا غم شروع ہو جاتا ہے غرض کہ کسی حالت میں غم سے نجات نہیں۔ (از یادگار غالب) کھٹے لگا کس طرح مضمون کے مکتوب کا ایاز قسم کھائی ہو اس کا فرنے کاغذ کے جلانے کی فرماتے ہیں۔ دوسو رتوں سے میرے خط کا مضمون اس پر ظاہر ہو سکتا تھا ایک اس طرح کہ وہ میرے خط کو کھول کر پڑھتا تو اس کے مطالب سے خیردار اور آگاہ ہو جاتا مگر اس بات کی تو اس کا فرسے اُمید ہی نہیں وہ کیوں میرا خط کھولے اور پڑھے۔ دوسری یہ صورت تھی کہ میرے خط کو غصہ میں اگر جلا دیتا اور اس وقت میرے سوزِ عشق اور آتشِ فراق سے آگاہ ہو جاتا مگر اس نے کاغذ کے جلانے کی قسم کھالی ہے یہ بھی اُمید قطع ہو گئی۔ پسنا پر نیاں میں شعلہ آتش کا آسان ہے دے مشکل چمکت دل میں سوزِ غم جھیلنے کی فرماتے ہیں کہ جارِ حریر میں شعلہ آتش کو پیٹ کر باندھ لیتا جو نا ممکن ہے۔ ممکن سمجھا جاتا ہے۔ یہ نسبت اس کے کہ دل میں سوزِ غم کو پوشیدہ رکھا جائے۔ مطلب یہ ہے کہ

دل عاشق پر نیل سے بھی زیادہ نازک ہے اور سوزِ غم عشق شعلہ آتش سے بھی زیادہ سرکش ہے۔

انھیں منظور اپنے زخمیوں کا دیکھ آتا تھا اٹھے تھے سیرِ گل کو دیکھنا شوخی بہانے کی فرماتے ہیں۔ ان کو اپنے زخمیوں کا دیکھ آنا منظر تھا۔ اس کا اظہار غیر دل کے ردِ بردِ صاف صاف تو وہ نہ کر سکے۔ یہ کہہ دیا کہ دریا باغ کی سیر کو جاتے ہیں گلِ دلالہ کا تماشہ دیکھیں گے۔ اس حیلہ سے اپنے زخمیوں کو دیکھ تو یا اگر گلِ دلالہ کی سیر اور زخمیوں کا دیکھنا سادھی درجہ میں ان کے خیال کے موافق ثابت ہوا اور یہی بہانے کی شوخی تھی۔

ہماری سادگی تھی التفاتِ ناز پر مرنا تر آنا نہ تھا ظالم مگر تمہید جانے کی فرماتے ہیں۔ یہ ہماری سادگی یعنی حماقت تھی کہ تیرے التفاتِ ناز پر فریفتہ ہو گئے۔ ہمارے گھر میں تیرا آنا آنا نہ تھا بلکہ جانے کی تمہید۔ مطلب یہ ہے کہ اسی غرض سے آیا تھا کہ تھوڑی دیر میں واپس جائے اور ہم تیرے فراق میں مبینوں تر پڑتے ہیں۔ لکہ کو بے حوادث کا تحمل کر نہیں سکتی مری طاقت کہ ضامن شعی ہوں گے ناز اٹھانے کی فرماتے ہیں۔ اب ہم ایسے کمزور ہو گئے ہیں کہ باوجود حوادث بھی اٹھانے ہوئے پچکے جاتے ہیں۔ وہی ہم تھے کہ ہوں کی ناز برداری کی طاقت رکھتے تھے۔ گویا زمانے کے حوادث و آفات ہوں کے ناز و انداز سے بوجہ ہمارے کم ہیں۔

کہوں کیا خوبی اذ ضلعِ ابتائے زماں غائب بدی کی ہنس جس سے ہم نے کی بھی بار بار نیکی اس تافیکہ کہ معمولہ کہتے ہیں۔ ایک دو شعروں میں ایسا قافیہ باندھنا محسوس کلام سمجھا جاتا ہے۔ فرماتے ہیں۔ ابتائے زماں کی کچھ ایسی وضع ہو گئی ہے کہ ہم ان کی خوبی یا نیکی ہی نہیں کر سکتے۔ ہم نے جس سے بار بار نیکی کی تھی اسی نے ہمارے ساتھ بُرائی کی اور ہر کے مصرع میں خوبی کا لفظ طرز استعمال ہوا ہے جو بُرائی کے معنی دیتا ہے۔



## غزل

حاصل سے ہاتھ دھو بیٹھے آرزو خرامی دل جوش گریہ میں ڈوبی ہوئی اسامی  
 ڈوبی ہوئی اسامی زمینداروں کی اصطلاح میں اُس کا شکار کہہ سکتے ہیں جس کو کسی افتادگی کی  
 وجہ سے نقصان پہنچا ہو اور مالگزاری کا رویہ مساجن کا فرض اُس کے ذمہ ایسا باقی ہو جس کی  
 وصولی کی اُسید قطعی ہو گئی ہو اور جواریل کی اصطلاح میں اُس شخص کو کہتے ہیں جو ہمیشہ بازتا  
 رہتا ہو میرزا صاحب فرماتے ہیں کہ دل جوش گریہ میں اثر گریہ کو اپنی بد نصیبی سے کھو بیٹھا ہے۔  
 اثر گریہ گریا حاصل گریہ ہے مطلب یہ ہے کہ اسے آرزو تو گریہ پر بھروسہ کر کے اپنی مراد دلی  
 حاصل کرنی چاہتی ہے اور گریہ کی بے اثری دل کو لے ڈوبی ہے تیرے حسب مراد کوئی کام  
 نکلتا معلوم نہیں ہوتا۔

اس شمع کی طرح سے جس کو کوئی بجھادے میں بھی جلے ہوؤں میں ہوں داغ ناتماہی  
 فرماتے ہیں۔ داغ ناتماہی ہوں یعنی بجھ کر اپنے ناتمام رہنے کا داغ اس شمع کی طرح سے ہے  
 جس کو کسی قدر جل چکنے کے بعد کوئی شخص اراداً ناکل کر دے اور وہ ناتمام اور ناکام ہدہ جا۔

## غزل

کیا تنگ ہم تنگ زدگان کا جہان ہے جس میں کہ ایک بیضہ مور آسمان ہے  
 فرماتے ہیں۔ ہم تنگ کے مارے ہوؤں کا جہان ایسا چھوٹا سا ہے کہ اس جہاں کا آسمان صرف  
 ایک چیز نیکی کا اتنا ہے مطلب یہ ہے کہ مظلوم آدمی یہ سمجھ لیتا ہے کہ میرے واسطے دنیا میں  
 بہت ہی تنگ دائرہ میں آگئی ہے۔ نہ کوئی میرا سواوی ہے نہ فریاد رس۔

بے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے پر تو سے آفتاب کے ذرے میں جان ہے  
 فرماتے ہیں۔ ساری کائنات نے تجھ کو اپنا بندہ حاصل قرار دے لینے کے بعد فطرت کے  
 تقاضائے لازمی سے تیری جانب اپنی ساری توجہ مبذول کر دینے کے بعد رجوع کی ہے  
 جس طرح آفتاب کی روشنی سے خاک کے ذروں میں جان پڑتی ہے۔ ذرات کی حرکت

کہ جان بڑ جانے سے محمول کیا ہے جس میں عجیب لطف پیدا ہو گیا ہے۔

حالانکہ یہ یہ سلی خارا سے لالہ رنگ غافل کو میرے شیشے پہ لے گا گمان ہے  
 فرماتے ہیں حقیقت حال تو یہ ہے کہ میرے شیشے دل کو سنگ خارا کی چوٹ یعنی زمانے کی  
 سختی نے لال کر دیا ہے جس کا اثر میری آنکھوں کو سُرخ رکھتا ہے۔ آنکھوں کی سُرخی اکثر  
 نشاط کی وجہ سے بھی ہوا کرتی ہے اس لئے نادانقت لوگوں کو یہ گمان ہے کہ میرا شیشہ دلا  
 شراب سے لبریز ہے حالانکہ یہ بات نہیں ہے۔

کی اس نے گرم سینہ اہل ہوس میں جا آئے نہ کیوں پسند کہ ٹھنڈا مکان ہے  
 فرماتے ہیں۔ رقیبوں کے دل میں ہماری طرح سودا عشق کی اس نہیں ہے اور اسی لئے مستحق  
 نے رقیبوں کے دل میں جگہ کرنی ہے۔ ٹھنڈے مکان میں رہنا ہر شخص پسند کرتا ہے اور  
 جس دل میں آتش عشق نہیں ہے وہ ضرور سرد خانہ کا کام دے گا۔

کیا خوب تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا بس چپ رہو ہمارے بھی منہ میں زبان ہے  
 ہمارے بھی منہ میں زبان ہے۔ اس میں دوسنی رکھے ہیں ایک یہ کہ ہمارے پاس ایسے  
 ثبوت ہیں کہ اگر بوسے پر آئے تو تم کو قائل کر دیں گے اور دوسرے شوخ معنی یہ ہیں کہ  
 ہم زبان سے کچھ کہتا رہیں گے کہ غیر نے بوسہ لیا یا نہیں (ازیا دکھار غائب)

بیٹھا ہے جو کہ سایہ دیوار یار میں فرمانروائے کشور ہندوستان ہے  
 فرماتے ہیں۔ جو عاشق سایہ دیوار یار میں بیٹھا ہوا ہے وہ گویا کشور ہندوستان کا  
 بادشاہ ہے۔ ہندوستان کی تخصیص باعتبار رنگ سایہ کے ہے یعنی سایہ بھی کالا ہوتا  
 ہے اور ہندوستان کالا ملک سمجھا جاتا ہے۔

ہستی کا اعتبار بھی غم نے مٹا دیا کس سے کہوں کہ داغ جگر کا نشان ہے  
 یہ مضمون بالکل اچھوتا مضمون ہے۔ فرماتے ہیں۔ ہجوم غم نے میرے جگر پر داغ ڈال دیا  
 تھا۔ رفتہ رفتہ اس داغ نے جگر کو نوش جان فرمایا۔ داغ ہی داغ باقی رہ گیا جگر کی

ہستی مٹ گئی۔ اب اگر کسی سے یہ کہتا ہوں کہ کبھی میں بھی جگر رکھتا تھا اور اب تک اس کی نشانی یعنی داغ میرے سینہ میں موجود ہے تو کسی شخص کو میرے کہنے کا یقین نہیں آتا۔

ہے بارے اعتماد و فاداری اس قدر غائب ہم اس میں خوش ہیں کہ نامہر ہائے فرماتے ہیں۔ ہماری وفاداری پر اس کو ایسا بھروسہ اور یقین کامل ہے کہ باوجود نامہریان ہونے اور تم کرنے کے بھی اُس کو یہ گمان بھی نہیں ہوتا کہ غائب ہماری بے رخی سے ترک محبت کرے گا۔

### عزل

درد سے مجھے ہے تجھ کو بیکاری پاپائے کیا ہولی کالم تری غفلت شکاری پاپائے یہ ساری غزل قطعہ بند اور مشوق کام یہ ہے اس کو نزع میں دیکھ کر فرماتے ہیں کہ میں تجھ کو اس حالت میں دیکھ کر درد مند ہو رہا ہوں اب تو اس حال میں بھی میرا رنج و غم گوارہ نہیں کرتا۔ اور میرے تڑپنے سے تو خود بھی بیکار ہو رہا ہے۔ تیری وہ غفلت شکاریاں کیا ہو گئیں جب میری جان پر ہستی تھی اور تو میری بات بھی نہ پوچھتا تھا۔

تیرے دل میں گرنے کا آشوب غم کا حوصلہ تو نے پھر کیوں کی تھی میری نگساری پاپائے فرماتے ہیں اگر تیرے دل میں غم کی سختیاں اٹھانے کی برداشت نہ تھی تو تیرے میری نگساری کا دعویٰ ہی کیوں کیا تھا یعنی مجھ سے تجھے ملنا ہی نہ تھا اسی طرح نا اشرار ہوتا۔ کیوں میری غمخواری کا تجھ کو آیا تھا خیال دشمنی اپنی تھی میری دوستداری پاپائے فرماتے ہیں۔ کاش تو میرا غمخوار نہ بنا ہوتا اور میرے ساتھ غمخواری کرنے کا خیال تجھے پیدا نہ ہوا ہوتا تو نے مجھ سے غمخواری کر کے اپنے سوسائے خلق کو یہاں انجام کار رسوائی کے خوت سے اپنی جان دے دی۔

عمر بھر کا تو نے پیمان وفا باندھا تو کیا عمر کو بھی تو نہیں پامداری ہائے فرماتے ہیں۔ تو نے تمام عمر وفاداری کے ساتھ چلے رہے کا مجھ سے عہد بھی کیا تو کیا تیری عمر ہی نے تیرے ساتھ وفائے کی ادا مجھے تڑپاتا ہوا چھوڑ کر تجھ کو دُنیا سے جانا پڑا۔  
 زہر لگتی ہے مجھے آب و ہوائے زندگی یعنی تجھ سے تھی مائے ناسازگاری ہائے فرماتے ہیں۔ میرے لئے زندگی کی آب و ہوا زہر کا اثر رکھتی ہے۔ جب اس نے تجھ سے وفا نہ کی تو میں بھی ایسی زندگی کو موت سے بدتر سمجھتا ہوں۔

گلفشاں نہائے نازِ جلوہ کو کیا ہو گیا خاک پر ہوتی ہے تیری لالکاری ہائے فرماتے ہیں۔ تیری جلوہ افروزی کے وقت تیرے ناز و انداز سے جو پھول جھٹکارتے تھے وہ کیا ہو گئے یا تو وہ زمانہ تھا اب یہ وقت آگیا کہ تیری قبر پر پھول رکھے ہوئے ہیں۔  
 شرم رسوائی سے جا چھپنا نقابِ خاک میں ختم ہے الفت کی تجھ پر پردہ داری ہائے فرماتے ہیں۔ سو اہو جانے کی شرم سے تو زمین کا پیوند ہو گیا اور تو نے خاک کی نقاب اپنے چہرے پر ڈال لی۔ تجھ سے زیادہ دُنیا میں محبت کا پردہ پوش کون ہو سکتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ غمِ رسوائی سے تو نے اپنے کو ہلاک کر لیا۔

خاک میں ناموسِ پیمانِ محبت مل گئے اٹھ گئی دُنیا سے راہ و رسمِ یاری ہائے فرماتے ہیں۔ تیرے مرنے سے ناموسِ پیمانِ محبت خاک میں مل گئی گویا دوستی کی راہ و رسم ہی دُنیا سے اٹھ گئی۔ یعنی تیرے بعد اب کوئی معشوق و فادارِ نمانہ میں پیدا نہ ہوگا۔  
 بات ہی تیغِ آزما کا کام سے جاتا رہا۔ دل پہ اک لگنے نہ پایا زخمِ کاری ہائے فرماتے ہیں۔ افسوس کی جگہ ہے کہ درست قاتل بیکار ہو گیا۔ مجھ کو تو یہ کہ زخمی کہ میرے دل پر اس کے ہاتھ سے تلواروں کے زخم لگے وہ آئندہ میری پوری ہونے نہ پائی۔ نہ حُسن اُٹھانے کی حسرتِ دل کی دل ہی میں رہ گئی۔ مطلب یہ ہے کہ تیرے ناز و انداز کے لطف حسبِ درخواستِ محال نہ کر سکا۔

کس طرح کلمے کوئی شبہائے تار پر رنگاں ہے نظر خود کو دہ اختر شماری ہائے ہائے  
 فرماتے ہیں۔ ہم کو تو اس بات کا مرنا چاہا ہوا تھا کہ افتخار کی گھڑیاں اور فراق کی باتیں نام سے  
 بگن گن کر بسر کرتے تھے۔ اب یہ برسات کی اندھیری راتیں کیونکہ ہم سے کہیں گے شبہائے غم  
 کو شبہائے تار سے تعبیر کیا ہے اور برسات رونے کا استعارہ ہے۔

گوشِ مجبورِ پیام و چشمِ محرومِ جمال ایک لہلہ اس پر یہ نا اُمید داری ہائے ہائے  
 فرماتے ہیں۔ مکانِ تو پیام یار کے بچہ میں مبتلا ہیں اور آنکھیں جمال یار سے محروم ہوئی ہیں۔  
 میرے ایک دل پر یہ دو مصیبتیں نا اُمید داری کی بلائیں نازل کر رہی ہیں۔

عشق نے پکڑا نہ تھا غالب ابھی دشت کا رنگ رنگا تھا دل میں جو کچھ ذوقِ خواری ہائے ہائے  
 فرماتے ہیں۔ اے غالب میرے عشق نے ابھی تک دشت کا رنگ اختیار نہ کیا تھا یعنی  
 ابھی میں نے ہرزہ گردی و دشت نوردی شکی تھی کہ رسوائی کے ڈر سے میرے معشوق نے  
 اپنی جان دے دی۔ اور میرے دل میں ذوقِ خواری اسی طرح رہ گیا۔

### غزل

مرگشتگی میں عالم ہستی سے پاس ہے نسکین کو دے نوید کہ مرنے کی آس ہے  
 فرماتے ہیں۔ اپنی مرگشتگی کی وجہ سے زندگی سے نا اُمید ہو گیا ہوں۔ اب نسکین کو جا کیا  
 دینی چاہیے کہ موت آجانے کے بعد یقینی مرگشتگی سے نجات حاصل ہو جائے گی۔  
 لیتا نہیں مرے دل آوارہ کی خبر اب تک وہ جانتا ہے کہ میرے ہی پاس ہے  
 فرماتے ہیں۔ میرا دل میرے اختیار سے باہر ہو کر آوارہ گدہ ہو گیا ہے لیکن معشوق کو اب تک  
 یہی یقین ہے کہ وہ میرے ہی پاس ہے۔ اسی یقین کے بھر دوسرے پر وہ میرے دل سے  
 بے پرواہ ہو گیا ہے اور اس کی خبر نہیں لیتا ہے۔

کچھ بیاں سرور تپ غم کہاں تلک ہر سو میرے بدن پہ زبانِ پیاس ہے  
 فرماتے ہیں تپ غم کے بڑھنے سے جو خوشی حاصل ہوئی ہے کہاں تک اس کا بیاں کروں۔

مختصر یہ ہے کہ۔ دو ٹکڑا روٹھا میرے جسم کا ٹکڑا گنداری کے واسطے زبان ہی گیا ہے۔ جانے  
کے بخار میں جسم پر دو گئے ٹکڑے ہو جاتے ہیں۔

ہے وہ غرورِ حسن سے بیگانہ، وفا ہر چند اس کے پاس دلِ حق شناس ہے  
فرماتے ہیں۔ میرا دل حق شناس تو اسی کے پاس رہا کرتا ہے اور مجھ کو اس بات کا کامل  
یقین ہے کہ اس ظالم کو میرے دلِ حق شناس نے رسمِ دریاہ و فاسے بخوبی خبردار کر دیا ہوگا۔  
مگر وہ اپنے غرورِ حسن میں کس کی سنتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب تک رسمِ دریاہ و فاسے  
بیگانہ رہا۔

پی جس قدر ملی شبِ مہتاب میں شراب اس بلغمی مزاج کو گرمی ہی اس ہے  
فرماتے ہیں شبِ مہتاب میں جس قدر شراب میسر آسکی میں نے پی لی۔ میرا مزاج بلغمی ہے  
اور بلغمی مزاج والے کو چار چیزیں ہمیشہ مفید ہوا کرتی ہیں۔ شراب کو آتشِ تر سے قسیر  
کرتے ہیں جو اس کی گرم مزاجی کا ادنیٰ ثبوت ہے اور شبِ مہتاب بھی ٹھنڈی ہوا کرتی  
ہے۔ اس وجہ سے شبِ مہتاب میں شراب کا استعمال زیادہ مفید ثابت ہوا ہے۔

ہر اک مکان کو ہے کیس سے شرفِ اسد مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگلِ اُداس ہے  
فرماتے ہیں۔ اسے اسد ہر مکان کو یکس سے شرفِ حاصل ہو کر رہا ہے۔ جنگل کی آبادی مجنوں  
کے دم سے تھی۔ اس کے مرجانے کے بعد جنگلِ اُداس ہو گیا ہے۔

### غزل

گر خاموشی سے فائدہ اخفائے حال ہے خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے  
فرماتے ہیں۔ اگر خاموشی سے یہ فائدہ ہے کہ دل کا حال کسی پر ظاہر نہیں ہوتا اور راز دل  
رہتا ہے تو میں اپنی گفتگو سے بھی خوش ہوں۔ یہ بھی خاموشی کے برابر کام دینی ہے  
اس لئے کہ میری بات کوئی سمجھ ہی نہیں سکتا۔ خاموشی اور گفتگو کو مساوات کا درجہ  
دینا نہایت بلغمی خیال ہے۔

کس کو سناؤں حسرتِ اظہار کا لگہ دل فرد جمع و خرچ زباناہ لال ہے  
 فرماتے ہیں حسرتِ اظہار زبان کے گویا نہ ہونے کی لگہ مند ہے۔ میں کس کے آگے جا کر  
 اس کا ذکر مار دوں اور دل میرا ایک فرد حساب ہے جس پر جمع و خرچ زباناہ لال  
 لال کا حساب رقم ہے مطلب یہ ہے کہ حسرتِ اظہار ان لوگوں سے لگہ مند ہے جو  
 لوگوں کی طرح زبانوں کو منہ میں رکھتے ہیں یعنی مجھ سے میری مصیبتوں کا حال  
 نہیں پوچھتے۔ باوجودیکہ میرے چہرے سے حسرتِ اظہار ظاہر ہو رہی ہے۔

کس پردہ میں ہے آئینہ پرواز اے خدا رحمت کہ عذر خواہ لب بے سوال ہے  
 فرماتے ہیں۔ اے خدا تیری رحمت کس پردہ میں چھپی ہوئی آئینہ بخشش کی جلا کر ہی  
 ہے اور کس پردہ سے باہر نہیں آتی اب تو اُسے ہر ہو جانا چاہئے اس لئے کہ میرا  
 لب بے سوال عذر خواہ مصیبت ہے مطلب یہ ہے کہ میرے لب رحمت کا سوال اس  
 شرم سے نہیں کرتے کہ میں نے بے انتہا گناہ کئے ہیں اور میری یہ خاموشی میرے گناہوں  
 کا عذر ہے۔ اس صورت میں اظہارِ رحمت ضروری ہے۔

ہے خدا نخواستہ وہ اور دشمنی اے شوقِ منفعل یہ تجھے کیا خیال ہے  
 فرماتے ہیں۔ اے شوقِ محبت تو جو اس خیال سے منفعل ہو رہا ہے کہ اس شوقِ خنے  
 تیرے ساتھ دشمنی برتی جا رہے گا۔ ہے خدا نخواستہ وہ ایسا کیوں کرنے لگے یہ  
 خیال تیرا بالکل غلط ہے۔

مشکینِ لباسِ کعبہ علی کے قدم سے جا ناپِ زمیں ہے نہ کہ ناپِ غزال ہے  
 یہ شعر منقبت میں ہے۔ فرماتے ہیں۔ غلاتِ کعبہ کو خشک آگیں علی کے قدم سے جانور یعنی  
 خانہ کعبہ سے جو فیض و برکت تمام دنیا کو پہنچ رہا ہے وہ اس وجہ سے ہے کہ حضرت  
 علی کرم اللہ وجہہ نے خانہ کعبہ کی دیواروں سے تلوں کو توڑ کر نکالا ہے۔ اگر بُت نہ توڑ  
 جاتے تو اس پر گھار کا قبضہ رہتا، مسلمانوں کو اس سے فیض نہ پہنچتا اور خانہ کعبہ زمیں

کی ناث ہے۔ ناث غزال نہیں ہے جس میں شک ہوتا ہے شک کے اعتبار سے  
خانہ کعبہ کو شکیں لباس نہ سمجھنا چاہئے دوسری خصوصیت یہ ہے کہ حضرت پیدا بھی  
خانہ کعبہ میں ہوئے ہیں۔

دشت پر میری عرصہ آفاق تنگ تھا دریا زمین کو عرق انفعال ہے  
فرماتے ہیں میدان دنیا میری صحرا نوردی کے مقابلہ میں بہت چھوٹا ہے اور اس لئے  
زمین عرق انفعال میں ڈوبی ہوئی ہے۔ یہ دریا اور سمندر گریزا زمین کے واسطے عرق  
انفعال کا حکم رکھتے ہیں۔

ہستی کے مت فریب میں آجائید اسد عالم تمام حلقہ ردام خیال ہے  
فرماتے ہیں۔ اس اسد پر ساری دنیا صرف خیالی اور اعتباری وجود رکھتی ہے یہاں اپنے  
موجود ہونے کو بھولے سے اپنی ہستی نہ سمجھ لینا۔ یہ سارا عالم حلقہ ردام خیال سے زیادہ  
وقت نہیں رکھتا۔

### عزل

تم اپنے شکوہ کی باتیں کھود کھود کے پوچھو حذر کرو میرے دل سے کہ اس میں گڈنی ہے  
فرماتے ہیں تمہاری شکایتیں میرے دل میں اسی طرح چھپی ہوئی ہیں جس طرح چو لھے میں آگ  
دبی ہوئی ہوتی ہے۔ اگر تم انھیں کھود کھود کر اور گریہ کرید کر پوچھو گے تو ان باتوں کا  
شکایت آمیز اظہار دشمنی کی آگ کو مشتعل کر دے گا۔ مطلب یہ ہے کہ دوستوں میں رنج  
اکثر شکوہ شکایت سے پیدا ہوتا ہے۔

دلایہ درد و الم ہی تو منتہم ہے کہ آخر نہ گریہ سحری ہے نہ آہ نیم شبی ہے  
فرماتے ہیں۔ یہ درد و الم کا خیمہ ہونے والا ہے کہ ایک دن ہم مر جائیں گے اور پھر نہ گریہ  
سحری باقی ہے گانہ آہ نیم شبی کا وجود ہوگا۔ اسے دل درد و الم کی حالت کو غنیمت سمجھنا  
چاہئے کہ جس وقت تک یہ ہے ہماری زندگی بھی ہے۔



## غزل

ایک جا حرفِ فاکلکھا تھا وہ بھی مٹ گیا ظاہر کا غذبہ خط کا غلط بردار ہے  
غلط بردار اس کا غذبہ کو کتے ہیں جس پر سے حرفِ آسانی کڑک وغیرہ سے اڑ سکے اور  
کا غذبہ پر اس کا نشان باقی نہ رہے۔ مگر یہاں ازراہِ ظرافت غلط بردار کے یہ معنی لئے  
ہیں جس پر سے حرفِ غلط خود بخود اڑ جائے۔ کہتا ہے کہ قونے اپنے خط میں صرف  
ایک جگہ حرفِ وفا لکھا تھا سو وہ بھی مٹ گیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے خط  
کا کاغذ غلط بردار ہے کہ حروفِ پختہ دل سے اس پر نہیں لکھی جاتی وہ خود بخود مٹ  
جاتی ہے۔ (ازراہِ نگار غالب)۔

جی جلتے ذوقِ فنا کی ناتمامی پر نہ کیوں ہم نہیں جلتے نفس ہر چند آبشار ہے  
فرماتے ہیں۔ ہر سانس بھنے کے اندر پہنچ کر اشتعال پیدا کرتا ہے اور یہی اشتعال زندگی  
کا باعث ہے۔ باوجود اس کے کہ ہر اشتعال میں جسم کا انس اور بدن کا حصہ فنا ہوتا ہے۔  
اس سے یہ امر بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ بقضاءِ فطرت و طبیعت ہر ذی حیات کو فنا  
کا ذوق ہے یعنی یہ وہی اشتعال ہے جو فنا کرتا ہے اور حیات بخشا ہے۔ اس ذوقِ فنا  
کی ناتمامی پر دل جلتا ہے کہ ایک بار جسم کو جلا کیوں نہیں دیتا۔

اگلے پانی میں بجھتے وقت اٹھتی ہر جسد ہر کوئی در ماندگی میں نالہ سے لاچار ہے  
فرماتے ہیں۔ آگ ایک خاموش چیز ہے۔ غل خود سے قفل نہیں کھتی لیکن جب اسے پانی  
میں ڈال دیتے ہیں تو اس میں سے بھی ایک آواز پیدا ہو جاتی ہے۔ اس سے یہ بات ثابت  
ہو گئی کہ ہر کوئی مصیبت کے وقت نالہ کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔

ہے وہی بستی ہر ذرہ کا خود غدر خواہ جس کے جلوے سے زمین آسمان سرشار ہے  
ہر ذرہ یعنی ہر مخلوق غدر خواہ۔ مٹانی چاہئے والا یا سندور رکھنے والا۔ اس شعر میں دعویٰ  
ایسے طریقہ سے کیا گیا ہے کہ خود دعویٰ شخصِ دلیل واقع ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ذرات

عالم معنی ممکنات جو فی الحقیقت معدوم محض ہیں۔ ان کی بدستی و غفلت کا غدر خواہ وہی ہے جس کے پر تو وجود سے یہ تمام معدومات وجود کا دم بھرتے ہیں (زیادہ کا رہنا سبک) مجھ سے مت کہہ تو ہمیں گستاخا اپنی زندگی زندگی سے بھی مزاجی ان دنوں بیزار ہے فرماتے ہیں تو مجھ سے یہ نہ کہہ کہ تو بھی، اپنی زندگی گما کرنا تھا۔ جب میں ایسا گستاخا وہ اور وقت اور زمانہ تھا۔ اب تو اپنی زندگی سے بھی میرا مزاجی بیزار ہو گیا ہے۔

آنکھ کی تصویر سنا منہ پہ کھینچی ہے کہ تا تجھے یہ کھل جائے کہ اس کو حسرت دیدار ہے فرماتے ہیں میں نے الفاظ خط پر بجائے چہ کھنے کے آنکھ کی تصویر قلم سے بنا دی ہے اور اس سے میرا مدعا یہ ہے کہ تجھ پر یہ بات ظاہر ہو جائے کہ کاتب خط کو حسرت دیدار بہت زیادہ ہے۔

### شعر

پینس میں گزرتے ہیں جو وہ کوچے سے میرے کندھا بھی کماروں کو برائے نہیں دیتے  
فرماتے ہیں جس طرح میرے صدمت سے من کو نفرت ہے اسی طرح سے میرے محبت سے بھی ہے  
میرے کوچہ میں اتنی دربر توقف فرماتا بھی گوارا نہیں ہوتا کہ جتنی دیر میں کمار کندھا بدل لیتے  
ہیں۔ اس لئے کماروں پر تاکید ہوتی ہے کہ اس کوچے سے باہر نکل کر کندھا بدل لیا یہاں سے  
جلد گزر جاؤ۔

### غزل

میری ہستی فضائے حیرت آباد تمنا ہے جسے کہنے میں نالہ وہ اسی عالم کا غنقا ہے  
فرماتے ہیں میری ہستی آباد تمنا کو تو فی سچنے والی ہے۔ نالہ و فریاد جس کو ادائ کا نام اہل دنیا  
نے مقرر کر لیا ہے وہ اس عالم کا غنقا ہے۔ یعنی کسی قسم کی آواز بند ہی نہیں ہوتی۔ صوفیا  
کی اصطلاح میں مقام حیرت اس مقام کو کہتے ہیں جہاں طالب پر تجلی ذات وارو  
ہوتی ہے۔

خزاں کی فصل محل کہتے ہیں کس کی کوئی موسم ہو وہی ہم ہیں قفس پر اور ماتم بال و پر کا ہے  
 میرزا صاحب نے چھ جملے دو مصرعوں میں عجیب حسن و خوبی کے ساتھ لاد کر دیے ہیں  
 اور اس میں لطف یہ ہے کہ یہ سب جملے زبانی بلبل سے ادا کئے گئے ہیں فرماتے ہیں ہمیں معلوم نہیں  
 خزاں کس کو کہتے ہیں اور بہار کس کو کہتے ہیں۔ ہماری حالت کسی موسم میں بدلتی ہی نہیں۔ ہم وہ  
 بلبل گرفتار ہیں کہ قفس میں مدت سے بند ہیں اور ہمیشہ بال و پر کے ماتم میں گرفتار ہیں۔  
 وفائے دلبر ایں ہے اتفاقی در نہ اے ہمدم اثر فریاد دلہائے حزیں کا کس نے دیکھا ہے  
 فرماتے ہیں۔ وفادار معشوق کامل جانا خوش نصیبی سے اتفاقاً امر ہے در نہ اے ہمدم  
 فریاد کے اثر اور محبت کی تاثیر کے ہم قائل نہیں ہیں یعنی نہ محبت کے اثر سے معشوق رام ہوتا  
 ہے نہ آہ و نالہ کی تاثیر کارگر ہوتی ہے۔

نہ لائے شوخی اندیشہ تاب کیج تو میدی کف افسوس لٹا عہد تجدید تمنا ہے  
 فرماتے ہیں۔ شوخی اندیشہ سے نا اُمیدی اور مایوسی کا عہد نہیں اٹھ سکتا اس واسطے ایسی  
 تمنا میں ہمیشہ مبتلا رہنا مایوس ہو جانے سے بدرجہا بہتر ہے اس لئے کف افسوس کا  
 لٹانا اُمیدی کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ دوبارہ تمنا سے تجدید بیعت کرنی ہے مطلب یہ  
 ہے کہ میں جو یاس کے عالم میں کف افسوس لٹا ہوں یہ نا اُمیدی کی وجہ سے نہیں لٹا  
 بلکہ تمنا کے ہاتھ پر دوبارہ بیعت کرتا ہوں بیعت کرنے کے وقت مر یہ اپنے دونوں  
 ہاتھوں میں پیر کا ایک ہاتھ تھام کر توبہ استغفار کرتا ہے اور کف افسوس لٹنے کی بھی  
 یہی صورت ہوتی ہے۔

رحم کر ظالم کہ کیا بور د چراغ کشتہ ہے نبض بیمار وفا دو د چراغ کشتہ ہے  
 چراغ کشتہ استعارہ ہے بیمار وفا سے۔ فرماتے ہیں۔ رحم کر ظالم کہ بیمار وفا کی ہستی ہی  
 کیا ہے گویا اس کی نبض دو د چراغ کشتہ ہے۔ نزع کے وقت کی نبض کو الٹا دو دی  
 کہتے ہیں اور زلی بھی کہتے ہیں۔

دل لگی کی آرزو بے چینی رکھتی ہے ہمیں ورنہ یاں بیرونقی سود چرل غم شہ ہے  
 فرماتے ہیں۔ دل لگی کی آرزو ہم کو بے چین رکھتی ہے اور اس کی مثال یہ پیش کرتے ہیں کہ رونق  
 چراغ اس کے نقصان کا باعث ہے یعنی چراغ جلتا رہتا ہے تو اس کا تیل اور بجی دونوں  
 ختم ہو کر چراغ کو نقصان پہنچ جاتا ہے اور اگر وہ بجھ جاتا ہے تو اس کی بے رونقی طغ  
 کے واسطے مفید ہے۔

### غزل

چشمِ خروباں خاموشی میں بھی نوا پر داز ہے سُرمہ تو کہوے کہ دو شعلہ آواز ہے  
 فرماتے ہیں۔ حسینوں کی آنکھیں خاموشی میں بھی گفتگو کرتی رہتی ہیں۔ گویا ان کی آنکھوں  
 کا کامل شعلہ آواز پر اُپار اُگیا ہے۔ سُرمہ خورائیدن یا سُرمہ آواز یہ دونوں فارسی دلوں  
 کے محاورے ہیں خاموش کر دینے کے معنی پران کا استعمال ہوتا ہے۔ میرزا صاحب یہ  
 کہتے ہیں کہ یہ کامل شعلہ آواز پر بنایا گیا ہے اس لئے اس کا اثر خلوت اور سُرموں کے  
 قوت گویا بالیٰ بخشا ہے تو کہوے تو گوئی کا ترجمہ ہے۔

پیکرِ عشاق ساز طالعِ ناساز ہے نالہ گویا گردشِ سیارہ کی آواز ہے  
 فرماتے ہیں پیکرِ عشاق یعنی عاشقوں کے جسم بہ نصیبی کے ساز ہیں اور ان کے نالے  
 گویا بدبختی کے ستاروں کی آواز ہیں عشاق ہمہ تن نالہ و فریاد ہو کرتے ہیں اس لئے  
 ان کو بدبختی کا ساز کہا گیا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اہلِ غم کے محاورے میں مقام  
 عشاق ایک راغنی کا نام ہے۔

دستگاہِ دیدہ خونبارِ مجنوں دیکھنا یک بیاباں جلوہ گلِ فرشِ پا انداز ہے  
 فرماتے ہیں۔ دیدہ خونبارِ مجنوں کی دستگاہ تو ملاحظہ فرمائیے کہ آنکھوں سے خون کی ندی  
 بہی ہے اس نے نجد کے جنگل کو ایسا فرشِ پا انداز بنا دیا ہے جس میں کوسوں تک  
 جلوہ گل کا سماں نظر آتا ہے۔

## غزل

عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی میری وحشت تیری شہرت ہی سہی  
 فرماتے ہیں۔ تو جو میرے دعوے عشق پر کتاب ہے کہ مجھ کو عشق نہیں ہے بلکہ یہ دیوانگی  
 کا جوش ہے جس میں وحشت پیدا ہو گئی ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اچھا مجھے عشق  
 نہ سہی وحشت ہی سہی اور یہ میری وحشت تیری شہرتِ حسن کا باعث ہی سہی۔

قطع کیجئے نہ تعلق ہم سے کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی  
 یہ مضمون میرزا صاحب کے حصہ میں آگیا۔ جہاں نظم کیا ہے بے مثل نظم کیا ہے۔ ہر جگہ  
 نئے انداز سے بانہ صاب۔ فرماتے ہیں۔ ہم سے قطع تعلق آپ کیوں کرتے ہیں۔ اگر کچھ بھی  
 لگاؤ باقی نہیں ہے تو ہمارے ساتھ دشمنی ہی کیجئے۔ محبت نہ سہی عداوت سہی۔

میرے ہونے میں ہے کیا رُسووائی اے وہ مجلس نہیں خلوت ہی سہی  
 فرماتے ہیں۔ اگر تنہائی میں آپ سے ملوں گا تو اس میں کون سی آپ کی بدنامی ہوگی ملنا  
 و دونوں جگہ یکساں ہے مجلس نہ سہی خلوت سہی۔

ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی  
 فرماتے ہیں۔ ہم کچھ اپنے عداوت تو نہیں ہیں کہ تجھ سے محبت کر کے اپنے ساتھ دشمنی کریں  
 جب تجھے غیر کی محبت کا یقین کامل ہے اور اس کو اپنا سچا عاشق سمجھتا ہے ہم تجھ سے  
 کیوں ملیں۔

اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو آگئی گر نہیں غفلت ہی سہی  
 فرماتے ہیں۔ اپنی ہستی کو جانتا میں عرفان ہے۔ بے صداق من غریک نفسہ نقد غرث  
 رتبہ یعنی جس نے پہچانا اپنے نفس کو اس نے پہچانا اپنے رب کو۔ دوسرے مصرعہ میں  
 کہتے ہیں۔ اگر اپنے نفس سے آگئی حامل نہ ہوئی تو اپنی ہستی سے غفلت ہی کر یعنی مناسب  
 ہے مٹی جب اپنے کو نیست سمجھ لیا تو موجود کتن کا جلوہ ضرور نظر آجائے گا۔ یہ شعر بھی میرزا

کے نشروں میں کا ایک آبدار نشتر ہے۔

عمر ہر چند کہ ہے برق حشرام دل کے خون کرنے کی فرصت ہی سہی  
فرماتے ہیں۔ یہ تو ہم نے مان لیا کہ عمر قیام بکلی کی چمک کی مانند ہے لیکن پھر بھی اتنی  
فرصت مل جاتی تھیں کہ دل کو خون کر لیا جائے۔

ہم کوئی ترک وفا کرتے ہیں نہ سہی عشق مصیبت ہی سہی  
فرماتے ہیں۔ ہم عشق کی تکلیفوں سے گھبرا کر ترک وفا نہ کریں گے یوں سہی کہ عشق  
کہ ہم ذریعہ رامت نہ سمجھیں باعث مصیبت سمجھیں گے۔

مجھ تو دے اے فلک نا انصاف آہ فریاد کی رخصت ہی سہی  
فرماتے ہیں۔ اے فلک میں تجھ سے یہ تو نہیں کہنا کہ تو میری مراد ہی پوری کر دے اے  
ظالم فرصت فریاد تو مجھے دے کہ اس کے دینے میں بھی تیرا کچھ نقصان ہے۔

ہم بھی تسلیم کی خود ڈالیں گے بے نیازی تری عادت ہی سہی  
فرماتے ہیں۔ رفتہ رفتہ ہم بھی تسلیم درمنا کی عادت ڈال لیں گے جب یہ سمجھ لیں گے کہ  
بے نیازی تیری عادت میں داخل ہو گئی ہے۔

یار سے چھیڑ چلی جائے آسہ غم نہیں وصل تو حسرت ہی سہی  
فرماتے ہیں۔ اے آسہ یار سے مدعا طلبی کی چھیڑ چھاڑ ہوئے جائے۔ خاموش ہو کر  
بیٹھ رہنا کچھ کام کی بات نہیں ہے اگر وصل نہیں ہوا تو اظہارِ حسرت ہی سہی۔

### غزل

ہے آرمیدگی میں نکو ش بجا مجھے صبح وطن ہے خندہ دندانِ نما مجھے  
فرماتے ہیں۔ آرام لینے کی حالت میں اس بات کا سزاوار ہوں کہ مجھ کو سزاؤ کی بجائے  
وطن میں رہ کر صبح کا ہونا میرے واسطے خندہ دندانِ نما ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مجھ کو  
تلاش یار میں ترک وطن کرنا لازمی اور ضروری ہے۔ میں آرام طلبی کی وجہ سے جو گھر

میں بیٹھا ہوا ہوں تو وطن کی صبح میری حالت پر ہر روز فندہ زن ہوتی ہے۔  
 ڈھونڈ رہے ہیں اس معنی آتشِ نفس کو جی جس کی صدا ہو جلوہ برقِ فنا مجھے  
 فرماتے ہیں۔ میرا دل اُس گمانے والی کو ڈھونڈ رہا ہے جس کی آواز کی بجلی مجھ پر گر کر  
 فنا کر دے اور میں غمِ ماسوا کے سانچہ اپنی ہستی کو بھی بھول جاؤں۔

مستانہ طے کروں ہوں رہِ وادیِ خیال تا بازِ گشت سے نہ رہے عجب مجھے  
 فرماتے ہیں۔ میدانِ خیال میں مستانہ وار راہ کو طے کر رہا ہوں اور وہ اس لئے گم پلٹ کر  
 آنے سے مجھ کو غرضِ مطلب نہ رہے یعنی میں اپنے کو اس صرحِ غم کر دوں کہ پھر خوش میں  
 نہ آسکوں۔

کرتا ہے بسکہ باغ میں قہے حجابیاں آنے لگی ہے نکمتِ گل سے حیا مجھے  
 فرماتے ہیں میں تو ہمیشہ نکمتِ گل کو بے حجابی کا الزام دیتا رہا ہوں اور اس سے یہی کہتا  
 رہا ہوں کہ ذرا ہوا چلی اور تو جامہ سے باہر ہو گئی مگر تو آج اس سے بھی زیادہ بے حجاب  
 اور بے شرم نکلا اب مجھے نکمتِ گل سے خرسار ہونا پڑا یعنی تیری بے حجابیاں دیکھ کر  
 بوسے گل کو کس منہ سے بے حجاب کہوں۔

کھلتا کسی پہیوں پرے دل کا معاملہ شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے  
 فرماتے ہیں کسی شخص پر میرے دل کا معاملہ یعنی میرا رازِ عشق کیوں ظاہر ہوتا مگر اشعار کے  
 انتخاب نے مجھے بدنام کر دیا یعنی میں ایسے ہی شریفین کر پڑھا کرتا تھا جن میں معلومات  
 عشق و محبت کے مضامین بندھے ہوئے ہوتے تھے۔

زندگی اپنی جیب اس رنگِ گزری غائب ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خُدا رکھتے تھے  
 فرماتے ہیں۔ اے غائب جیب ہماری زندگی گایا ایسے برے حالوں سے گزری تو ہم کیا ذکر  
 کریں گے کہ خُدا رکھتے تھے۔

## غزل

اس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کئے بیٹھا رہا اگر یہ اشارے ہوا کئے  
میزدا صاحب نے اس شعر میں حیا کے معنی غیرت کے لئے ہیں۔ فرماتے ہیں۔ اس کی بزمِ  
میں مجھ کو غیرت سے کام لیتے ہوئے ہی نہیں آتی۔ میں بیٹھا رہا باوجودیکہ غیرے اُن کے  
اشارے ہوتے رہے۔

دل ہی تو ہے سیاست درباں سے ڈر گیا میں اور جاؤں در سے ترے بے صدا کئے  
فرماتے ہیں۔ دل ہی تو ہے یعنی دل کی یہ کیفیت ہے کہ کبھی مضبوط ہو جاتا ہے اور کبھی ہلکا  
ہو جاتا ہے۔ اس وقت اس کا یہ حال ہوا کہ در سے دربان کے دھمکا دینے سے ڈر گیا  
ورنہ میں ایسا نہ تھا کہ ترے دروازہ پر سے بغیر صدا کئے چل جاتا۔

رکھتا پھروں ہوں خرقہ و بجاوہ رہن سے مدت ہوئی بے دعوتِ آب و ہوا کئے  
فرماتے ہیں۔ خرقہ و بجاوہ شراب کے بدلے گرد رکھتا پھرتا ہوں۔ اس لئے کہ سال بھر کے  
بعد بہار کا موسم آیا ہے۔ یعنی برس رہا ہے اور ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے۔ مناسب ہے کہ  
اس وقت فصل بہار کی دعوت کی جائے اور شراب کا دھڑ بھڑا اور دونوں چیزوں کو ملا کر  
گروں رکھتے ہیں۔ یہ خوشی رکھی ہے کہ ایک چیز سے قیمتِ شراب ادا نہ ہوئی۔

بے صرفہ ہی گزرتی ہے ہو گرچہ غمِ خضر حضرت بھی کل کیس گئے کہ ہم کیا کیا کئے  
فرماتے ہیں۔ تعلقاتِ دنیا سے چھٹکارا کس کہ عمر کو عبادتِ انہی میں صرف کیا جائے غیر  
اگرچہ خضریٰ کی کیوں نہ ہو مگر بیکار ضرور گزرے گی۔ حضرت خضر بھی کل فرما ئیں گے کہ معلوم  
نہیں ہم کیا کرتے رہے۔

مقدور ہو تو خاک ہے پوچھوں کسائے لیم تو نے وہ گنجائے گراں مایہ کیا کئے  
فرماتے ہیں مگر یہ قدرتِ حاصل ہو جائے تو میں ضرور خاک سے دریافت کر دوں کہ اسے



لیم تو نے وہ قیمتی خزانے کیا کر دیئے یعنی بڑے لوگ تیری آغوش میں آئے اور تو نے ان کو خاک میں ملا دیا اس طرح کہ کسی کا بھی نشان باقی نہ رہا۔

کس روز ہمتیں نہ ترا شا کئے عدو کس دن ہمارے سر پہ نہ آئے چلا کئے خزانے ہیں۔ وہ کون سا دن تھا کہ میں دن دشمنوں نے ہمارے اوپر ہمتیں نہ باندھیں اور وہ کون سا دن تھا کہ میں دن ان کی جھوٹی باتوں میں اگر تم نے ہمارے سر پر آ کرے نہ بھیرے۔ صحبت میں غیر کی نہ پرستی ہو کہیں یہ خو دینے لگا ہے بوسہ بغیر التجا کئے فرماتے ہیں مجھ کو یہ دہم پیدا ہو گیا ہے۔ کہیں غیر کی صحبت میں تو اس کو یہ عادت نہیں پڑ گئی وہ بغیر التجا کئے بوسہ دیتا ہے اور اس دہم نے دھل کی خوشی کو غم سے بدل دیا ہے۔ ضد کی ہے اور بات گر خوبڑی نہیں بھوئے سے اُس نے سینکڑوں وعدے وفا کئے فرماتے ہیں ضد کی تو بات ہی اور ہے کہ اسے ہم سے کسی وقت کسی بات پر خاص ضد پیدا ہو جائے ورنہ یہ عادت بُری تو نہیں ہے اکثر اس نے بھوئے سے وعدے وفا کئے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اس کی بھول بھی بعض اوقات لطف کا کام دے جاتی ہے۔

غالب تم ہی کو کہ ملے گا جواب کیا مانا کہ تم کہا کئے اور وہ سنا کئے فرماتے ہیں۔ اے غالب تو خود ہی سوچ کر اس بات کا جواب وہ کہ وہاں سے تم کو جواب کیا ملے گا۔ یہ تو ہم نے فرض کر لیا کہ تم اپنا مطلب اس سے کہتے رہے اور وہ سنتے بھی رہے لیکن تمہاری مطلب برآری کی کیا صورت ہوگی۔ وہاں تمہاری پہونچ کیونکر ہو سکے گی اور پھر رعب حسن اظہار تمنا کی اجازت کس طرح دے گا تم کہاں وہ کہاں کچھ دل میں تو اپنے سوچو۔

### عزل

رفتار عمر قطع رہ اضطراب ہے اس سال کے حساب بقیہ آفتاب ہے فرماتے ہیں۔ جس طرح اہل تحیم آفتاب کی رفتار سے سال کا حساب لگا لیتے ہیں عمر مرزاں کا حساب آفتاب کے بدلے تجلی سے کرنا چاہئے۔ سال یعنی عمر بھی استعمال ہوتا ہے راہ نظر

وہ راستہ ہے جو حالت اضطراب میں طے کیا جائے۔

مینائے مے ہے سرو نشاط بہار سے بال تدرد جلوہ موج شراب ہے  
فرماتے ہیں نشاط بہار سے سبز نشیہ شراب سرو کا دم مقابل بن گیا ہے اھ شراب تہ  
کی لہر بال تدر کا نمونہ دکھا رہی ہے۔

زخمی ہوا ہے یا نشہ یا نئے ثبات کا نے بھاگنے کی گوں نہ اقامت کی تاب  
فرماتے ہیں۔ پائے ثبات کی ایڑی زخمی ہو کر مشکل یہ ہو گئی ہے کہ اب نہ میدان عشق سے  
بھاگ سکتا ہوں اور نہ ٹھہر سکتا ہوں۔

جاداد بادہ نوشی رنداں پر کشش جہت غافل گماں کرے ہے کہ گنتی خراب ہے  
فرماتے ہیں۔ جاداد یعنی جادو۔ بادہ نوشی سے مراد شراب عرفان ہے۔ رند سے مراد  
عارف۔ مطلب یہ ہے اہل عرفان کو کشش جہت پر اپنے عرفان کی وجہ سے قبضہ حاصل  
ہو گیا ہے۔ وہ ہر طرف ذات باری تعالیٰ کی تجلیاں دیکھ رہے ہیں اور جو شخص جلوہ حقیقت  
سے ناکشنا یعنی غافل ہے اس کے گمان میں دنیا خراب ہے مینی غافل ہو رہی ہے۔  
نظارہ کیا حریت ہو اس برق حسن کا جوش بہار جلوہ کو جس کے نقاب ہے  
فرماتے ہیں ظہور عالم اجسام شاہد حقیقی کے واسطے پر وہ کا حکم رکھتا ہے نظر اس کو دیکھ ہی  
نہیں سکتی یعنی نظر جب دیکھے گی نقاب ہی کو دیکھے گی۔ آنکھ جب اٹھے گی اجسام ہی پر  
پڑے گی۔ جوش بہار استعارہ ہے ظہور عالم کا۔ اور نقاب کہنے سے اس کو یہ مراد ہے کہ  
نقاب جس طرح چہرے کو چھپا لیتی ہے اسی صورت سے عالم اجسام کا حمارہ صوفیہ  
کے نزدیک عالم لاہوت تک جانے سے روکتا ہے۔

میں نامراد دل کی تسلی کو کیا کروں؟ مانا کہ تیرے رخ سے نگہ کامیاب ہے  
فرماتے ہیں۔ میں اپنے دل نامراد کی تسلی کیونکر کروں؟ یہ تو میں نے مانا کہ صرف تیرے دیکھ  
لینے سے نگاہ کو تسلی ہوگی مگر دل کو تسلی اسی صورت میں ہوگی کہ جب تجھ سے وصل جہانی

بھی حاصل ہو گا۔

گزارا اسد مسرت پیغام یار سے قاصد پہ مجھ کو رشک سوال و جواب ہے  
فرماتے ہیں۔ اے اسد میں پیغام یار کی خوشی و مسرت کو لے کر کیا کروں، مجھ کو یہ رشک  
قتل کئے ڈالتا ہے کہ اگر میں قاصد کو بھجوں گا تو قاصد جا کر اس سے گفتگو کرے گا۔  
ہر کلام ہو گا اور مجھے یہ بات کسی طرح گوارا نہیں۔

### غزل

دیکھنا قسمت کہ اپنے پر رشک آجائے ہے میں اُسے دیکھوں بھلا کب مجھے دیکھا جائے  
فرماتے ہیں میری بد نصیبی تو دیکھو کہ مجھ کو آپ اپنے پر رشک آجاتا ہے (انتہائے  
محبت یہ ہے کہ محبت میں بدگمانی پیدا ہو جائے اور انتہائے بدگمانی یہ ہے کہ انسان  
کو کامیابی کی صورت میں خود اپنے پر بھی رشک آئے) رشک کی حالت میں اسے کیونکر  
دیکھ سکتا ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ انتہائے محبت کا میاں بی محبت سے بھی محروم رکھتی ہے۔  
ہاتھ دھو دل سے ہی گرمی گزرتی ہے آگینہ مندی صبا سے پگھلا جائے ہے  
فرماتے ہیں اگر آتش دہریہ اسی ہی گرمی ہے تو دل سے نا اُمید ہو جانا چاہئے۔ دوسرے  
مصرعہ میں اسی مضمون کو تشبیہ کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ آگینہ یعنی دل کا شیشہ شراب  
کی تیزی سے پگھلا جاتا ہے۔

غیر کو یارب وہ کیونکر شگستاخی کرے گر حیا بھی اُس کو آتی ہے تو شرابا جاتے ہے  
یہ شعر معاملہ کا ہے جو طالب و مطلوب کے درمیان اکثر گزرتا ہے اور شاعرانہ نزاکت  
دوسرے مصرعہ میں پائی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ حیا آتی اور شرابا جانا دو حقیقت ایک کا  
چیز ہے پھر اس کے کیا معنی کیا حیا بھی آتی ہے تو شرابا جاتا ہے۔ بات یہ ہے کہ اس  
مقام پر حیا آنے کا مطلق اور ہے اور شرابا جانے کا مطلق اور۔ اگر حیا بھی اُس کو آتی ہے  
یعنی غیر کی شگستاخی اور خواہش، بیجا سے اور شرابا جائے ہے یعنی غیر سے یا اس کے ساتھ

نکار کرنے سے۔ (از یادگار غالب) شوق کو یہ نکت کہ بردم نالہ کھینچے جائے دل کی وہ حالت کہ دم لینے سے گھبرا جائے فرماتے ہیں۔ شوق کو نالہ کرنے کا ایسا پیکا چڑ گیا ہے کہ کسی وقت کہ وہ فریاد سے اُٹتا بھی نہیں اور دل کی حالت ایسی زار۔ نزار ہو گئی ہے کہ سانس لینا بھی ناگوار گزرتا ہے۔ نکت کے معنی بُری عادت کے ہیں جیسے کہتے ہیں کہ اُس کو جُوا کھیلنے کی نکت ہے۔

دُور چشم بدتر می بزمِ طرب سے واہ واہ نغمہ ہو جاتا ہے وہاں گزراں مل جاتا ہے فرماتے ہیں، چشم بدتر می بزمِ طرب کی کیا بات ہے یعنی اس قدر خوشی سے معمور ہے کہ میرا نالہ بھی وہاں پہنچ جاتا ہے تو وہ بھی نغمہ بن جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میری فریاد کو سُنی کہ تو خوش ہوتا ہے اس شگ دونی پر اللہ رحم کرے۔

گرچہ ہے طرزِ تفاضل پر وہ دارِ رازِ عشق پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پا جاتا ہے فرماتے ہیں۔ اگرچہ اس کی چشم پوشی یعنی بے توجہی رازِ عشق کی پردہ پوش ہے لیکن ہم اس کے ردِ ہر ویسے بدحواس اور خود رفتہ ہو جاتے ہیں کہ وہ رازِ عشق سے خبردار ہو جاتا ہے۔ کھوئے جانے سے پا جانا ایسے دو محاورے اس شعر میں نظم کئے گئے ہیں کہ جن کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ اُسکی بزمِ آرا میاں سُک کر دلِ رنجوریاں شل نقشِ مدغائے غمیر بیٹھا جاتا ہے اُس کی غفلت ناز کی خبریں سُک کر میرا دلِ رنجوریاں اس طرح سے بیٹھا جاتا ہے (یعنی نا اُمید ہو جاتا ہے) جس طرح رقیب کی دغا کا سکتے اس کے دل پر بیٹھ گیا ہے۔

ہو کے عاشق وہ پری سُخ اور نازک بن گیا رنگ گھٹتا جاتا ہے جتنا کہ اُڑتا جاتا ہے فرماتے ہیں۔ وہ پری سُخ غیر پر عاشق ہو کر اور زیادہ نازک بن گیا۔ محبت کے مصدبے جس قدر کہ اس کا رنگ اُڑتا ہے اتنا ہی رنگ کھرتا جاتا ہے یعنی زیادہ گلا رہتا ہے۔

نقش کو اُس کے مصدور بھی کیا کیا ناز ہیں کھینچتا ہے جس قدر اتنا ہی کھینچتا جاتا ہے فرماتے ہیں۔ اس کی تصویر بھی مصدور کے ساتھ ناز و غرور کا بڑا ڈکرتی ہے یعنی جس قدر مصدور

تصور رکھتے ہیں جانا ہے اسی قدر اس کی تصویر مصور سے کشیدگی پیدا کرتی جاتی ہے۔  
 سایہ میرا مجھ سے مثل دود بھاگے ہو اسد یاس مجھ آتش بجاں کے کس سے ٹھہرا جائے؟  
 فرماتے ہیں اسے اسد میں عشق کی بدولت ایسی مضیبتوں میں پھنسا ہوا ہوں کہ میرا سایہ بھی  
 مجھ سے گریز کرتا ہے یعنی جس طرح آگ سے دھواں اُٹھ کر بلند ہو جاتا ہے اسی طرح بہت  
 سوز و فکر کے غم سے میرا سایہ مجھ سے دود بھاگ جاتا ہے گویا شعلہ آتش فکر کا دھواں ہے  
 میرا سایہ نہیں۔ عجب پُر لطف مقطع لکھا ہے۔

### قطعہ

گرم فریاد رکھا مثل نہالی نے مجھے تب امان بھر میں ہی برویالی نے مجھے  
 فرماتے ہیں نقشِ تالین کو کچھ کر میں مصروف نام و فریاد ہوا کہ ہائے یہ شکل تو میرے پلوں میں ہو  
 اور میرا مشق نہ ہو گرم فریاد ہونے نے شب بھر کی سردی سے میری جان بچالی وہ نہ ٹھہرا  
 مر جانا۔

نسیہ و نقد دو عالم کی حقیقت معلوم لے لیا مجھ سے مری ہمت عالی نے مجھے  
 فرماتے ہیں میری ہمت کی نگاہ پر دنیا و عقبی میں سے کوئی بھی نہ چٹھہ سکی اور نسیہ و نقد ان  
 دونوں کو بے حقیقت سمجھ کر میری ہمت عالی نے مجھ کو خود خرید لیا یعنی میں وہ بیش بہا  
 جنس ہوں کہ میری خریداری کے لئے نقد دنیا اور نسیہ عقبی کافی تھا۔

کثرتِ آرائی و وحدت ہے پرستاری و ہم کر دیا کا فران اصنام خیالی نے مجھے  
 فرماتے ہیں۔ کثرت کے لباس میں وحدت کو راستہ کرنا اور وحدت پر کثرت کا فیال کرنا  
 وہم پرستی نہیں تو اور کیا ہے یعنی یہی خیال کثرتِ اصنام خیالی سمجھے جاتے ہیں اور جس طرح  
 بتوں کو بتوں کا بندہ شریک بادی تعالیٰ سمجھتا ہے اسی طرح وہ بے خبر و وجود کثرت کے  
 قائل ہیں کثرت کا وحدت کا شریک وجود کچھ رہے ہیں اور ایسا خیال کرنا گمراہی کا شرک و  
 کفر ہے۔

ہوس نکل کا تصور میں بھی کھٹکانہ رہا۔ عجب آرام دیا ہے پرو بالی نے مجھے فرماتے ہیں۔ تماشائے نکل کا تصور بھی اب آنے نہیں پاتا۔ اس کے کھٹکے سے بھی مجھ کو نجات حاصل ہوگئی۔ یہ راحت قلبی ہے بال و پری کی بدولت تجھے حاصل ہوئی مطلب یہ ہے کہ جب تک بال و پریں طاقت پر واز رہی ہیں اور ہر باغ میں پہنچ جاتا تھا سب ناطاقتی کی بدولت عشقِ نکل کی قید سے آزاد ہو بیٹھا۔

### غزل

کارِ گاہِ ہستی میں لالہ داغِ سماں ہے برقِ خرمینِ راحتِ خونِ گرمِ دہقان ہے  
سیرِ نا صاحب اپنے رفعاتِ عودِ بندہ کی میں ان تینوں شعروں کی شرح خود تحریر فرماتے ہیں۔  
وہ یہ ہے داغِ سماں مثلِ انجمِ انجم۔ وہ شخص کر داغ جس کا سرمایہ و سامان ہو جو وجودِ  
لالہ کی منحصر نمائش داغ پر ہے ورنہ رنگ تو اور بھی ہوں کا بھی لال ہو تکے بعد اس کے  
یہ کچھ بھیج کر پھول کے درخت یا غلہ جو کچھ بویا جاتا ہے وبقان کو جوتے بونے پانی دینے  
مشقت کرنی پڑتی ہے اور ریاضت میں ہو گرم ہو جاتا ہے مقصود شاعر کا یہ ہے کہ  
وجودِ محض سوخ و عناد ہے۔ مزارع کا وہ موجود کشت و کاریں گرم ہوا ہے وہی لالہ کی  
راحت کے خرمین کا برق ہے حالِ موجودیت داغ اور داغِ خالیٰ راحت اور ہوشِ سوخ و عناد۔  
غنیہ تا شگفتہا برگِ عافیت معلوم باوجود و مجموعی خوابِ گل پریشاں ہے  
کلی چنپی نکلی بصورتِ قلبِ صنوبری نظر آئی اور جب تک پھول بنے برگِ عافیت معلوم  
یہاں معلوم بمعنی معدوم ہے اور برگِ عافیت بمعنی مایہ آرام۔ مصرعہ۔ برگِ ندیشی گورِ خوش  
فرست۔ برگ اور سو برگ بمعنی ساز و سامان ہے۔ خوابِ گلِ شخصیتِ گل باعتبار غامضی  
و برجا ماندگی پریشانی ظاہر ہے یعنی شگفتگی وہی پھول کی ہلکھڑیوں کا ہکھرا ہوا ہونا۔ غنیہ  
بصورتِ دل جمع ہے یا وصفِ جمیعتِ دل گل کو خوابِ پریشاں نصیب ہے۔  
ہم سے رنجِ بیابانی کس طرح اٹھایا جائے داغِ پشتِ نرسہ عجزِ شغافہ خسِ بزدلان ہے

پشت و پشت صورت عجز اور خس بدنداں و کاہ بدنداں گرفتار بھی اظہار عجز ہے پس جس عالم میں کہ داغ نے پشت و دست زمین پر رکھ دی ہوا و شعلہ نے تنکا و انتوں میں لیا ہو ہم سے رنج و اضطراب کا تحمل کس طرح ہو قبلہ اسے فکر و غم میں تبدیل و اسیر و شوکت کے طرز پر ریختہ کھستا تھا۔ چنانچہ ایک غزل کا مقطع یہ تھا اسے طرز تبدیل میں ریختہ کھشنا + اسد اللہ خاں قیامت ہے۔ ۱۵ برس کی عمر سے ۲۵ برس کی عمر تک مضامین خیالی لکھا گیا دس برس میں بڑا دیوان جمع ہو گیا آخر جب تیز آئی تو اس دیوان کو دور کیا۔ اور قیامت چاک کئے دس پندرہ شعر واسطے نمونہ کے دیوان حال میں پہنے دیئے۔

آب رہا ہے درد و زاریہ سبزہ خباب ہم بہا باں میں ہیں اور گھر میں بہا رانی ہے فرماتے ہیں۔ ہم تو دشت دل کی بدلت دیوانگی کے عالم میں بہا باں نور و ہو گئے اور برسات نے اگر گھر کے درد دیوار پر دیوانگی کے عالم میں احساس پیدا کر دی۔ افسوس ہے کہ ہم تو جنگل میں مارے مارے پھرتے ہیں اور گھر میں بہا ر آ کر خانہ دویراں باغ بن گیا ہے میرزا صاحب نے دیوانگی کی تصویر ایسے سادے الفاظ میں کھینچی ہے کہ تعریف سے مستثنیٰ ہے۔

### غزل

سادگی پر اسکی مرچا نیکی حسرت دل میں ہے بس نہیں چلتا کہ پھر خیر کفِ قاتل میں ہے یہاں سادگی سے مراد ترک زینت و آرائش ہے۔ فرماتے ہیں۔ اس کی سادگی جو بغیر تلوار کے قتل کر رہی ہے۔ یعنی ابھی تلوار اس نے باندھی بھی نہیں ہے۔ میرا ارادہ اپنے ہاتھ سے اپنا گلا کاٹ کر فرجے کا تھا اور یہی حسرت ابھی تک میرے دل میں ہے کہ اس کی سادگی پر گلا کاٹ کر مر جاؤں مگر میرے اس ارادہ کی ٹکلیں ابھی نہ ہونے لگیں کہ خیر اس نے اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اب میری حسرت نکلنے کے یہ دو سبب مانع ہو گئے ہیں۔ ایک یہ کہ جب خیر اس کے قبضہ میں آگیا تو ہم اپنا گلا کیونکر کاٹیں۔ اور دوسرا سبب یہ ہے کہ جب خیر اس نے پہنچ یا تو اب وہ سادگی کہاں آتی رہی جس پر بہ جان قربان کرنی چاہتے تھے۔ دوسرے مصرعوں پھر کے لفظ سے یہ

ثابت ہوتا ہے کہ پہلے بھی ایسا ہو چکا ہے کہ ہم اپنا گلہ کاٹنے پر مستعد تھے مگر اس نے اسی طرح خنجر ہمارے ہاتھ سے لے لیا تھا۔

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو کس نے کہا میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے کسی کے حسن بیان کی تعریف اس سے بہتر نہیں ہو سکتی کہ جو بات فائل کے منہ سے نکلے وہ سامع کے دل میں اس طرح اُتر جائے کہ اس کو یہ شبہ ہو کہ یہ بات پہلے ہی سے میرے دل میں تھی۔ راز یادگار غائب

اگرچہ ہے کس کس بکلی سے وے بااں بہ ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے فرماتے ہیں اگرچہ ہر ذکر ان کے سامنے بُرائی کے ساتھ کیا جاتا ہے اور غیر وہ ذکر کرتے ہیں۔ مگر بہر حال مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں آ کر جاتا ہے۔

بس جو ہم نا اُسیدی خاک میں مل جائیگی یہ جو اک لذت ہماری سہمی بے حاصل میں ہے فرماتے ہیں۔ اسے جو ہم نا اُسیدی بس کر کیں ایسا نہ ہو کہ ہماری سہمی بے حاصل میں جو اک لذت اسی لذت باقی رہ گئی ہے یہ بھی خاک میں مل جائے۔

رہ کیوں بھینچے دانا مگی کو عشق ہے اٹھ نہیں سکتا ہمارا جو قدم منزل میں ہے راہ کی تکلیفیں کیوں کھینچی جائیں اور یہ کیا کوشش کیوں کی جائے۔ دانا مگی کو ہم سے عشق ہو گیا ہے یعنی ناکامی و نامرادی ہم پر عاشق ہے اور جب یہ ثابت ہو گیا کہ دانا مگی ہم پر مبتلا ہے پھر کبھی منزل مقصود تک نہ پہنچ سکیں گے تو اب ہمارا ایک ایک قدم سو سو میں کا ہو گیا۔ یعنی رستہ چلنے سے بالکل جی پھوٹ گیا۔

جلوہ زار آتش و دوزخ ہمارا دل سہمی فتنہ شوقیات کس کے آب و گل میں ہے فرماتے ہیں۔ یہ آپ ہیج کہتے ہیں ہمارے دل میں آتش و دوزخ بھری ہوئی ہے لیکن فتنہ قیامت کس کے آب و گل میں شریک ہے مطلب یہ ہے کہ تم تو سراپا فتنہ قیامت کا نمونہ ہو۔ ہے دل شوریدہ غائب طلسم ہیج و تاب رحم کر اپنی تمنا پر کہ کس شکل میں ہے



مطلب تو اس شرمسرت آتنا ہے کہ میری تنہا سے دلی نکال دو۔ میرزا صاحب نے اس کو عجیب خوشی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔ غائب کا دل خود یہ ظلم بیچ و تاب ہے۔ یعنی اس میں گو رکھ دھندے کی طرح بہت سے بے پڑے ہوئے ہیں۔ تمہاری تنہا اس کے پیچوں میں پھنس کر مشکل میں مبتلا ہو گئی ہے۔ تم غائب پر رحم نہ کرو بلکہ اپنی تنہا پر رحم کر کے اس کو اس آفت سے نکال کر لے جاؤ۔

### غزل

دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی      دونوں کو اک اداسِ رضامند کر گئی  
فرماتے ہیں۔ تری نگاہ تیر کی طرح دل سے جگر میں جا پہنچی اور ان دونوں کو ایک ہی دوائے نا  
میں رضامند کر کے واپس ہو گئی۔

شق ہو گیا ہے سینہ خوشالذتِ فراق      تکلیفِ بروہ داری زخمِ جگر گئی  
فرماتے ہیں۔ سنو تو سہی میرا سینہ شق ہو گیا ہے اور اس کے شق ہونے سے لذتِ فراق کو  
عجب سود حاصل ہوا ہے۔ برسی تکلیف زخمِ جگر چھپانے کی تھی اب وہ مٹ گئی کلمہ کلمہ  
فراق کے مزے لڑھٹے نصیب ہو گئے۔

وہ بادہ شبانہ کی سرستیاں کہاں      اٹھے بس اب کہ لذتِ خواب سحر گئی  
فرماتے ہیں۔ اب وہ رات کی پی ہوئی شراب کی سرستیاں کہاں باقی رہیں یعنی خواب کا  
زمانہ گزر گیا۔ بیدار ہونے کا وقت آگیا۔ لذتِ خواب بھر باقی نہ رہی۔ یعنی پیری کا آغاز  
ہو گیا جوانی کی نیند سونے کا وقت ختم ہو گیا۔ نفس کو غفلت کا موقع نہ رہا۔

اُڑتی پھرے ہر خاک مری کوئے یار میں      بارے اب اسے ہوا و ہوسِ بالِ و پر گئی  
فرماتے ہیں۔ مجھے برسوں سے یہ آمد و تھی کہ بال و پر پیدا ہو جائیں اور میں یار کے کوچہ میں  
اڑ کر پہنچ جاؤں زندگی میں میری یہ مراد پوری نہ ہوئی لیکن مرنے کے بعد میری خاک  
کوئے یار میں اس طرح لٹتی پھرتی ہے جس طرح میں زندگی میں چاہتا تھا۔

دیکھو تو دلفریبی انداز نقش پا سوج خرام یا رہی کیا گل کتر گئی  
 فرماتے ہیں۔ اس کی نقش پا کی دلفریبیوں کے انداز تو ذرا دیکھو سوج خرام یا مرقاض  
 بن کر کیسے پھول کتر گئی۔ دوسرے معنی یہ بھی نکلتے ہیں کہ گل کترنا محاورہ ہے جو خداداد یا  
 کر دینے کے موقع پر بولا جاتا ہے اور اس کے نقش پا نے زمین پر قائم ہو کر عشاق و اغیار  
 میں باہم فساد برپا کر دیا ہے۔

مہربانوں نے حسن پرستی شعار کی اب آبروئے شیوہ اہل نظر غمی  
 فرماتے ہیں۔ ہوس رانوں کی عادت حسن پرستی نہ تھی مگر اب انھوں نے بھی بغیر سوچے سمجھے  
 یہ عادت اختیار کر لی۔ اہل نظر کے عشق صادق کی قدر جاتی رہی۔

نظارہ نے بھی کام کیا واں نقاب کا سستی سے ہر گہ ترے رخ پر کبھر گئی  
 فرماتے ہیں۔ رخ یا رنگ پہنچ کر نگاہ ایسی بدست ہو گئی کہ اس کی رُخوں کی طرح پریشان  
 ہو کر کبھر گئی۔ اور دامن نقاب کی طرح دیدار کی مانع ہو گئی گویا خود نقاب بن گئی۔

فرداؤدی کا تفرقہ یک بار مٹ گیا کل تم گئے کہ ہم پر قیامت گزر گئی  
 کہتا ہے کہ تمھارے جاتے ہی بسبب خود رفتگی و خود فراموشی کے یہ حالت ہو گئی کہ آج اور  
 کل کی مطلق تمیز نہیں رہی اور ایسا ہی قیامت کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہاں ماضی اور  
 مستقبل دونوں مبدل بہ زمانہ حال ہو جائیں گے۔ پس تم کیا گئے گویا ہم پر قیامت گزر گئی  
 قیامت گزر جانے کے دو معنی ہیں نہایت سختی کا زمانہ گزر جانا اور خود قیامت کا آجانا  
 (انزاد گارغائب)

مارا زمانہ نے اسدا شہ خاں تمھیں وہ ولوے کہاں وہ جوانی کدھر گئی  
 فرماتے ہیں۔ اسے اسدا شہ خاں بہادر تمھیں زمانہ کی گردنوں اور بخت کی ٹکلیوں نے  
 موت سے پہلے تمام کر دیا۔ وہ جوش و خروش اب کہاں ہے اور وہ زور و شور جوانی کے  
 کدھر گئے۔

## غزل

نسکیں کو ہم نہ روئیں جو ذوقِ نظر لے حور ان غلہ میں تری صورت گر لے  
 فرماتے ہیں۔ عاشق کے لئے یہ دو باتیں ہمیش و سرت کی ہیں ایک شکیں قلب دوسری  
 ذوقِ نظر جو ان لے کہ اگر تیری ہمشکل ہوں تو ان کے غٹے سے ہم کو صرتِ ذوقِ نظر حاصل ہو سکتا  
 ہے مگر نہیں ایسا نہیں ہے کہ حوروں کی صورت تجھ سے ملتی ہوئی ہو اور اس صورت میں  
 بھی کہ ان کو تیرا ہمشکل مان لیا جائے تو بھی نسکیں قلب بغیر تیرے حاصل نہیں ہو سکتی مگر  
 ہم ذوقِ نظر لے جانے پر بھی صبر کر لیتے ہیں لیکن یہاں وہ بھی میسر نہیں اس لئے کہ خود یہ  
 تیری ثبات نہیں رکھتیں۔

اپنی گلی میں مجھ کو نہ کر دفن بعد قتل میرے پتہ سے خلق کو کیوں تیرا گھر لے  
 فرماتے ہیں۔ تو مجھے اپنی گلی میں دفن کرے گا تو اس میں دو قباحتیں پیدا ہو جائیں گی پہلی قباحت  
 یہ ہے کہ سب پتہ سے تیرا گھر مشہور ہو جائے گا یعنی قبر والی گلی مشہور کریں گے یا یہ کہیں گے  
 کہ غائب کی قبر جس گلی میں ہے اود مجھے دونوں حالتوں میں رشک آئے گا اور رشک مجھ کو  
 مرجانے کے بعد بھی گوارا نہ ہوگا۔ دوسرا بار یک معنی اس شعر میں یہ ہے کہ سب قبر کے پتہ سے  
 تیرا مکان مشہور ہو جائے گا تو لوگ تجھ کو غائب کا قاتل یا معشوق مشہور کر دیں گے اس میں  
 تیری تو بیجا اور بدنامی ہوگی۔ مجھ کو مرجانے کے بعد بھی تیری بدنامی گوارا نہ ہوگی

ساقی گری کی شرم کرو آج ورنہ ہم ہر شب پیامی کرتے ہیں جس قدر لے  
 فرماتے ہیں۔ آج تم ساقی بنے ہو چلے گئے کہ ہم کو چھکا دو۔ تم تو رزی بہت تو ہر روز اپنے گھر پر  
 بھی پیتے ہی رہتے ہیں مگر پیٹ بھر کر مینی نصیب نہیں ہوتی۔ آج تو ہمیں جی بھر کے پلاؤ۔

تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اسے نایم میرا سلام کیسے اگر نامہ بر لے  
 فرماتے ہیں۔ اسے نایم تجھ سے تو ہم کو کچھ زیادہ شکوہ شکایت نہیں ہے البتہ نامہ بر جو بڑی  
 ڈینگیں ہانکتا تھا اور دشمنی کر کے گیا تھا اس میں ضرور جواب نامہ لے کر آؤں گا اور اب تک

اس نے شکل ہی نہیں دکھائی اور فرزندگی سے چھپ کر بیٹھ گیا۔ اگر وہ مل جائے تو برا سلوک  
کدینا مطلب یہ ہے کہ فردا اس سے شکایت کرنا اور خرمندہ کرنا۔

تم کو بھی ہم دکھائیں کہ مجھ کو نے کیا کیا فرست کشاکش غم نہاں سے گرے  
فرماتے ہیں۔ ہم تم کو دکھا دیجئے کہ مجھوں یعنی قیس نے عاشقی کو کس حد تک ترقی دی ہے  
لیکن مجبوری یہ ہے کہ غم نہاں اپنی پردہ دی اور رُسوائی کے خوف سے کچھ کچھ کہے آتا  
ہے اور جنگل میں نکل جانے سے مانع ہوتا ہے۔

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں مانا کہ ایک بزرگ ہمیں ہمسفر لے  
فرماتے ہیں۔ راہ سلوک میں تو ہم خضر کے برابر ہیں لیکن راہ طلب میں خضر سے ہلکت  
لے جانی چاہتے ہیں اس لئے ان کو ایک بزرگ آدمی سمجھتے ہیں مگر ان کی پیروی کرنے سے  
قاصر ہیں۔ اس خضر سے مرزا صاحب کی شوخی طبع ظاہر ہوتی ہے۔

اے ساکنان کوچہ و لدار دیکھنا تم کو ہمیں جو غالب آشفہ سرے  
فرماتے ہیں۔ اے ساکنان کوچہ راہ سلوک تم کو غالب آشفہ سراگر مل جائے تو اس کی  
زیارت کرنا اور دیکھنا کہ جذبی کیفیت کس قدر بلند رتبہ رکھتی ہے۔ تم جس کوچہ میں ہونو پڑی  
چھاکر رہ پڑے ہو وہ وہاں سے کس طرح بے تعلقی کے ساتھ گزر جاتا ہے۔

### عَنْزَل

کوئی دن گر زندگانی اور ہے اپنے ہی میں ہم نے ٹھکانی اور ہے  
فرماتے ہیں۔ ہم نے اب تک تمھاری التجائیں غیروں کی منتیں کیں اور راہ عشق کی  
ٹھوکریں کھائیں مگر اب ہم نے اپنے دل میں ٹھکان لی ہے کہ تم سے ترک تعلق کر کے ایک  
گوشہ میں بیٹھ جائیں گے۔ اگر عشق کامل اور جذبہ صادق رکھتے ہیں تو تم خود ہمیں پوچھتے  
ہوئے ہمارے گھر چلے آؤ گے مگر یہ ساری باتیں اسی صورت میں ہو سکتی ہیں کہ ہماری  
زندگی بھی وفا کرے۔ اور غم فراق ہماری جان پر نہ بنا دے۔

آتش دوزخ میں یہ گرمی کہاں! سوزِ غمہائے نہانی اور ہے  
 فرماتے ہیں۔ یہ گرمی آتش دوزخ کو کہاں نصیب ہے۔ غمِ نہاں کا سوز کچھ دوسری  
 چیز سے مطلب یہ ہے کہ سوزِ غم عذابِ دوزخ سے بھی زیادہ سخت ہے۔  
 بار بار دیکھی ہیں اُن کی رنجشیں پر کچھ اب کے سرگرائی اور ہے  
 فرماتے ہیں۔ دُورِ محبت کی برگمائی غنیمت کی چیز ہے۔ باوجودیکہ بہت دُور اُن سے  
 بگاڑ ہوا ہے اور پھر باہم صفائی ہو گئی ہے لیکن اب کی بار یہی یقین ہے کہ اب اُن سے  
 ملاپ نہ ہوگا۔

دے کے خط سُکھ دیکھتا ہے نامہ بر کچھ تو پینامِ زبانی اور ہے  
 فرماتے ہیں۔ نامہ بر نے اُن کا خط مجھے دے دیا لیکن اُس کے منہ دیکھنے سے یہ ثابت  
 ہوتا ہے کہ منہ زبانی بھی کچھ کہلا بھیجا ہے اور وہ ایسی بات ہے کہ اُس کے دُہرائے میں  
 قاصد کی زبان نہیں اُٹھ سکتی، معلوم ہوتا ہے دو چار گالیاں بھی خط کے ساتھ دی گئی  
 ہیں۔ میرزا صاحب کی شوخی اور طرافت ہر غزل میں ضرور اپنی جھلک دکھا جاتی ہے۔  
 قاطع اعمار ہیں اکثر نجوم وہ بلائے آسمانی اور ہے  
 فرماتے ہیں۔ اکثر ستارے ایسے ہیں جن سے عمریں قطع ہو جاتی ہیں، لیکن یہاں  
 جس بلائے آسمانی سے کام پڑا ہے وہ ان منحوس ستاروں کے مقابلہ میں قضاے  
 مبرم کا حکم رکھتی ہے۔

ہو چکیں غائبِ بلائیں سب تمام ایک مرگِ ناگہانی اور ہے  
 فرماتے ہیں۔ اے ناگہانِ زندگی میں جس مصیبتوں کا سامنا ہوا وہ انجامِ کار سب  
 ختم ہو گئیں اب تو ایک مرگِ ناگہانی کی آفت اور باقی رہی ہے۔ موت کچھ کہہ کر تو  
 آتی ہی نہیں، کیا معلوم کس وقت آجائے۔ آئے گی ضرور اور بے خبر کئے یکایک  
 آدھے گئے ہیں اس کا ہر وقت منتظر ہوں۔

## غزل

کوئی اُمید بر نہیں آتی کوئی صورت نظر نہیں آتی

فرماتے ہیں۔ حصول اُمید کی کوئی صورت نظری نہیں آتی۔ ناکامی اور نامرادی میں زندہ گی بسر ہو رہی ہے۔

موت کا ایک دن معین ہے نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

فرماتے ہیں۔ موت کے واسطے ایک دن معین ہو چکا ہے، جب تک وہ دن نہ آئے گا موت کیونکر آ سکتی ہے۔ لیکن نیند کو شبِ فرقت میں کیا ہو جاتا ہے۔ وہ کوئی سببی موت نہیں ہے کہ اس کے آنے کے لئے کسی خاص دن کی قید لگادی گئی ہو۔ وہ (یعنی نیند) شبِ فرقت میں رات رات بھر کیوں نہیں آتی۔

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی اب کسی بات پر نہیں آتی

میرا اگر زندہ ہوتے تو میرزا صاحب کے اس شعر کی داد دیتے۔ پریشانِ خاطر کی تصویر سن سادے نظروں میں کھینچی ہے کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔ فرماتے ہیں پہلے تو مجھے اپنے دل کی مصیبت پر ہنسی آ جایا کرتی تھی۔ اب میری مصیبتوں نے اس قدر مجھ کو افسردہ خاطر کر دیا ہے کہ اب خوشی کی بات پر بھی مجھ کو ہنسی نہیں آتی۔

جانتا ہوں ثوابِ طاعت وزہد پر طبیعتِ ادھر نہیں آتی

فرماتے ہیں۔ زہد و عبادت کو ثواب جانتا ہوں اور ان دونوں باتوں کی خوبیوں سے بخوبی آگاہ ہوں لیکن طبیعتِ ادھر رجوع نہیں ہوتی، اس کا کیا علاج۔ مطلب یہ ہے کہ جبکہ اللہ تعالیٰ لائق نہ دے انسان کوئی نیک کام نہیں کر سکتا۔

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہل دن نہ کیا بات کر نہیں آتی

فرماتے ہیں۔ بہتر یہ ہے کہ میرا منہ نہ کھلواؤ ورنہ بیٹھے بٹھائے رُسوا ہو جاؤ گے مطلب یہ ہے کہ مجھے وہ راز کی باتیں معلوم ہو گئی ہیں کہ جن کے بیان کر دینے میں بدنامی کا خوف ہے۔

کیوں نہ چنچول کہ یاد کرتے ہیں میری آواز گرنہیں آتی

فرماتے ہیں۔ میری نالہ کشی کو میرا معشوق اپنی شہرت کا ذریعہ سمجھتا ہے اس لئے اس کو میری فریاد میں ایک قسم کا لطف شامل ہوتا ہے۔ اگر میں خاموش ہو جاتا ہوں تو وہ لوگوں سے کہتا ہے کہ ہمارے مکان کے قریب ایک دیوانہ سا آدمی بیٹھا ہوا نالے کیا کرتا تھا آج اس کی آواز نہیں آتی شاید کہیں چلا گیا اس لئے میں رات دن جیٹی کرتا ہوں۔

داغ دل گر نظر نہیں آتا بو بھی اے چارہ گرنہیں آتی

فرماتے ہیں سائے چارہ گر اس بات کو تو میں تسلیم کرتا ہوں کہ میرا داغ دل پردہ میں یعنی میرے سینے کے اندر چھپا ہوا ہے تو اس کو دیکھ نہیں سکتا۔ لیکن اے کبوت کیا تیرا داغ بند ہے کہ تجھ کو اس کے جلنے کی بو بھی نہیں آتی۔ سانس کے ساتھ کباب کی بو آرہی ہے اور تو اس کو نہیں سونگھ سکتا اور دل کے کباب ہونے سے انکار کرتا ہے۔ مصرعہ ثانی میں استغمام اقرای ہے۔ یعنی بو آکر ہی ہے یعنی بو آکر ہی ہے۔

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی کچھ ہماری خبر نہیں آتی

فرماتے ہیں۔ خود رفتگی اور خود فراموشی اس قدر بڑھ گئی ہے کہ ہم کو اپنے حال کی خبر نہیں۔

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی موت آتی ہے پر نہیں آتی

فرماتے ہیں۔ مرنے ہیں۔ یعنی موت کے بے انتہا شوق و آرزو مند ہیں۔ موت آتی ہے یعنی موت کا آنا لازمی اور ضروری ہے۔ رات وہی سینکڑوں آدمیوں کا مرنے سننے رہتے ہیں مگر ہم کو موت نہیں آتی ہم نہیں مرنے۔

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غائب شرم تم کو مگر نہیں آتی

فرماتے ہیں۔ اے غائب ساری عمر تو شاہ پرستی اور شراب خواری کرتے رہے اب کیا کعبہ کے منہ سے جاؤ گے غائب۔ تم کو شرم نہیں آتی۔

## غزل

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے آخر اس درد کی دوا کیا ہے  
 فرماتے ہیں، دلِ ناداں تجھے کو کیا ہو گیا ہے تو کسی طرح اپنے کوگوں سے باز نہیں  
 آتا آخر اس دردِ دینی دردِ عشق کی دوا کیا ہے۔ تیرا کیا علاج کریں جو توانِ حرکتوں  
 سے باز آئے۔

بم ہیں مشتاق اور وہ بیزار یا الہی یہ ماجرا کیا ہے  
 گویا ابھی عشق کے کوپہ میں قدم رکھا ہے اور مشق و عاشق میں جو راز و نیاز کی باتیں  
 ہوتی ہیں۔ ان سے ناواقف ہے اس نے باوجود اپنے خشتی ہونے کے مشق کے ہزار  
 ہونے پر تعجب کرتا ہے (از یادگار غالب) یہ شعر بھی مرزا کے فستردوں میں کا ایک  
 خسر ہے۔

میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے  
 فرماتے ہیں کہ غیروں سے تو تم ان کی حالت پوچھتے رہتے ہو۔ مجھ کو بھی اللہ تعالیٰ نے زبان  
 عطا فرمائی ہے مجھ سے بھی تو کہی پوچھو کہ تیرا مدعا کیا ہے۔ دیکھو میں تم کو اس کا کیا جواب  
 دیتا ہوں۔

## قطعہ

جبکہ تجھ پہن نہیں کوئی موجود پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے  
 فرماتے ہیں۔ اے خدا جس صورت میں کہ تیرے سوا دنیا میں کوئی دوسرا موجود ہی نہیں  
 ہے پھر یہ ہنگامہ آرائی کیسی ہے۔ یعنی:-

یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے  
 جب تیرے سوا کوئی دوسرا اس عالم میں نہیں ہے تو یہ پریوں کے سے حسین اور  
 خواجہ صورت لوگ کیسے نظر آ رہے ہیں۔ ان لوگوں کے یہ غمزے اور ناز و ادائیں کیا چیز ہیں۔



شکمن زلف عنبریں کیوں ہے نگہ چشم سُرمہ سا کیا ہے  
یہ خوشبو دار گھونگر والی رُفیں کس لے بنائی گئی ہیں۔ اور یہ نگہ سُرمہ سا کب کام  
دے رہی ہے۔

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے  
یہ سبزہ و زار اور یہ خوشبو دار پھول کہاں سے آئے ہیں۔ کس نے ان کو پیدا  
کر دیا ہے اور یہ ابر کیا چیز ہے اس کی ماہیت کیا ہے اور یہ ہوا کیا ہے۔ اس کی حقیقت  
حال کیا ہے۔ اس قطعہ کا مطلب یہ ہے کہ زبان حال سے مرزا صاحب فریاد کر رہے  
ہیں کہ اس دلکش اور دلفریب منظر کو دیکھ کر ایسا مطمئن نفس کس کے پاس ہے کہ آدمی  
ان سب تماثلوں کو بیچ کچھ کر ذات باری تعالیٰ کی طرف رجوع ہو جائے۔ مطلب اس کا  
یہ ہے کہ اس ناکش و دلفریب نے انسان کو ایسا مشغول کر لیا ہے کہ ذات باری تعالیٰ کی  
طرف توجہ کرنی دُشوار ہو گئی ہے۔ فریاد اس امر کی ہے کہ ہم چاہتے ہیں کہ ان ساری لذتوں  
کو ترک کر کے اس ذات واحد کی طرف رجوع کریں، لیکن ان منظروں کی دلفریبیاں ہم کو  
اپنی جانب کھینچ لیتی ہیں۔

ہم کو اُن سے وفا کی ہے اُمید جو نہیں جانتے وفا کیا ہے  
فرماتے ہیں۔ وہ ابھی سلامتی سے اس قدر کس اور نادان ہیں کہ برسے سے وفا ہی کو  
نہیں جانتے کہ وفا کس جانور کا نام ہے اور ہم عشق کے دام میں پھنس کر ایسے نادان بن گئے  
ہیں کہ اس پر بھی ان سے وفا کی اُمید رکھتے ہیں۔

ہاں بھلا کر ترابھلا ہوگا اور درویش کی صدا کیا ہے  
فرماتے ہیں۔ جو کچھ کہتا ہے سچ کہتا ہے۔ اس میں شک و شبہ کرنے کی کیا بات ہے۔ فقیر  
کی یہ صدا کہ جو بھلا کرے گا، یعنی دُنیا میں کسی کو کچھ فائدہ پہنچائے گا، دونوں جہان  
میں اس کو فائدہ پہنچے گا۔

جان تم پر نشان کرتا ہوں میں نہیں جانتا دُعا کیا ہے  
 فرماتے ہیں۔ اوروں کی طرح زبانی خرچ میرے پاس نہیں ہے یعنی میں خالی دُعا دینی  
 نہیں جانتا۔ جان کو تم پر قربان کرتا ہوں۔ میری بڑی دُعا یہی ہے کہ اپنی جان تمہارے  
 صدقہ میں اتارتا ہوں۔

میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالب مُفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے  
 فرماتے ہیں۔ اس بات کو تو میں تسلیم کرتا ہوں کہ غالب ایک بیکار سا آدمی ہے لیکن تم کو تو  
 مُفت کا غلام ملتا ہے۔ تم کو اس کے غلام بنانے میں کیا بُرائی ہے۔ کچھ گرہ سے دام تو  
 خرچ کرنے ہی نہیں پڑتے مُفت کا سودا ہے لے لو۔

### غزل

کہتے تو ہو تم سب کہ بُتِ غالبیہ مو آئے اک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ وہ آئے  
 فرماتے ہیں۔ اے دو دُعاؤں اے ہمدردوں اے نہ میاں اے مخمور اے تم سب میرے لیے یہ دُعا تو  
 کرو کہ ہو کہ خدا کرے وہ بُتِ غالبیہ سو آجائے۔ ایسا ہو کہ ایک بار تم سب لوگ گھبرا کے یہ  
 کہ اٹھو کہ وہ آگئے۔

ہوں کشمکشِ نزع میں یاں جذبِ محبت کچھ کرنے سکوں پر وہ مرے پوچھنے کو آئے  
 فرماتے ہیں۔ میں تو اس وقت کشمکشِ نزع میں مبتلا ہوں مگر ہاں اے جذبِ محبت چلتے چلتے  
 ایک کشش تو تو بھی دکھا دے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ مجھ میں بات کرنے کی طاقت باقی نہیں رہی  
 ہے لیکن وہ میرے پوچھنے کو تو آجائے بلا سے جواب نہ دے سکوں نہ بھی۔

بے صاعقہ و شعلہ و سیلاب کا عالم آنا ہی سمجھ میں مرے آتا نہیں گو آئے  
 فرماتے ہیں۔ باوجودیکہ وہ میرے گھر میں تشریف لے آئے ہیں لیکن ان کی حالت صاعقہ و  
 شعلہ و سیلاب کی سی ہے یعنی دم نہیں لیتے بیٹھے نہیں۔ ٹھہرے نہیں۔ آتے ہی جانے کا  
 سوال ہو رہا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسا آنا بھی کسے میں شمار ہوتا ہے۔

ظاہر ہے کہ گھبراہٹ نہ بھگائیں گے نکیریں ہاں منہ سے گربادہ دوشینہ کی بو آئے  
بادہ دوشینہ۔ یعنی رات کی پنی ہوئی شراب جو مرنے سے پہلے پی تھی ازراہ شوخی  
کہتا ہے کہ نکیرین کے سوال و جواب سے بچنے کی کوئی تدبیر اس کے سوا نہیں کہ شراب  
پی کر مرین تاکہ نکیرین اس کی بو کی کراہت سے بغیر سوال و جواب کئے چلے جائیں۔  
(از یادگار غالب)

جلاوے ڈرتے ہیں واعظ سے جھگڑتے ہم سمجھے ہوئے ہیں اُسے جس بھیس میں جو کہ  
یہ شعر قصوت میں ہے۔ گویا خدا کے سوا کسی کو نہیں جانتے۔

ہاں بل طلب کون سے طلعتہ نیافت دیکھا کہ وہ ملتا نہیں اپنے ہی کو کھو آئے  
فرماتے ہیں۔ یہ طلعتہ کس سے نہا جائے کہ برسوں اس کی طلب میں خاک چھانی اور پھر اس کو  
نہ پایا نہ کام نہ نامراد واپس آگئے۔ ہم نے جب دیکھا کہ معرفت الہی کے راز پوشیدہ  
دریافت نہیں ہو سکتے اور ان کا پتہ کہیں نہیں ملتا تو ہم اپنے کو کھو آئے یعنی ہوش و  
خود سے گزر کر مست و مجذوب ہو گئے۔

اپنا نہیں وہ شیوہ کہ آرام سے بیٹھیں اُس در پہ نہیں بار تو کعبہ ہی کو ہوا آئے  
فرماتے ہیں۔ ہماری یہ عادت نہیں ہے کہ طلب دوست سے اکتا کر آرام سے بیٹھیں  
جب ہم کو یہ ثابت ہو گیا کہ اس کا پتہ کہیں نہیں ملتا اور ہم کسی طرح اس تک نہیں  
پہنچ سکتے تو کعبہ جا کر خانہ کعبہ کی زیارت سے مشرف ہو آئے یعنی یہاں یا نہ ملتا تو یا  
کے گھر کو ہی دیکھ آئے۔

کی ہم نفسوں نے اثر گریہ میں تقریر اچھے مے آپ اُس سے مگر مجھ کو ڈھو آئے  
فرماتے ہیں۔ میرے ہم نفسوں نے عشق سے اثر کر کے بابت تفریق کی یعنی گریہ میں اثر ہونے  
کو ثابت کیا مگر ثابت نہ کر سکے اور وہ اس بنا پر کہ جب مشق نے یہ کہا کہ روئے میں  
اگر تاخیر ہوتی اور تم جس کے جانبدار بن کر یہ گفتگو کر رہے ہو کہ وہ میرے فراق میں

رات دن روتا رہتا ہے اور اس رونے کا تجھ پر اثر ہوگا تو نصیب دشمنان تیرے دہرے  
 بن جائے گی یہ بالکل غلط ہے۔ نہیں ایسا نہیں ہے۔ آنسو بہانے میں اگر تاثیر ہوتی تو  
 میں اس وقت رونے والے کے پاس ہوتا۔ یہ سن کر میرے ہم نفس گریہ کا بے اثر ہونا  
 مان گئے اور مایوس ہو کر واپس چلے آئے قائل ہو جانے کے بعد یہ لوگ تو اس سے  
 اچھے رہے یعنی اس کے ہمزبان بن گئے مگر مجھ کو ڈبو آئے یعنی میری گریہ کی بے اثری  
 کا قائل ہو جانا میرے لئے شرمندگی کا سبب تھا۔ دوسرا پہلو اس میں یہ بھی ہے کہ  
 معشوق سے میرے گریہ کا حال کہہ دیا جس کو میں ہمیشہ پوشیدہ رکھتا تھا اب اس  
 حال کے ظاہر ہو جانے کے بعد اس کی نگاہوں میں حقیر ہو جاؤں گا۔  
 اس انجمن ناز کی کیا بات ہے غالب ہم بھی گئے واں اور تیری تقدیر کو ردائے  
 فرماتے ہیں۔ وہ انجمن ناز یعنی میرے معشوق کی بزم۔ اسے غالب قابل تعریف ہے  
 وہاں تو کسی کی روک ٹوک نہیں ہے۔ دوست دشمن سب جمع ہو جاتے ہیں ہنسی مذاق  
 غرض یہ کہ لطف صحبت حاصل کرتے ہیں۔ تیری بے نصیبی ہے جو تو وہاں جانے سے محروم ہے  
 اور باریابی سے روکا جاسکتا ہے۔

### غزل

پھر کچھ اک دل کو بیکراری ہے سینہ جو یارے زخم کاری ہے

فرماتے ہیں۔ پھر دل میں بے چینی پیدا ہو گئی ہے اور ہر وقت گدگدی سی ہوتی رہتی  
 ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ عشق کا زخم کھانے کی دوبارہ خواہش پیدا ہو گئی ہے۔

پھر جگہ کھودنے لگا ناخن! آبدِ فصلِ لالہ کا دی ہے

فرماتے ہیں۔ ناخن نے پھر جگہ کریدنا شروع کر دیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بہار  
 کا موسم قریب آگیا ہے۔ باغ میں لالہ و گل کھلیں گے اور سودا پھر نذر و پرکڑے لگا۔  
 اہل جنوں کے زخم پھر تازہ ہو جائیں گے۔

قبلہ مقصد نگاہ نیاز پھر وہی پردہ عماری ہے  
 فرماتے ہیں۔ پھر نگاہ نیاز کا قبلہ مقصد وہی پردہ عماری بن گیا ہے جس میں محبوب  
 جلوہ گر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ پہلے کی طرح ہمارے مشوق کو بھی محل میں سوار ہونے کا شوق  
 پیدا ہو گیا ہے۔

قطع

چشم دلال جنس رسوائی دل خریدار ذوق خواری ہے  
 فرماتے ہیں۔ آنکھ جنس رسوائی کی دلالی کرنے لگی ہے اور دل ذوق خواری کا خریدار  
 بن گیا ہے یعنی دیوانہ بن گیا ہے۔

وہی صد رنگ نالہ فرسائی وہی صد گونہ اشکباری ہے  
 پہلے شعر کی تفصیل اس شعر میں فرمائی ہے۔ یعنی دل سو سو طرح سے نالہ و فریاد کرتا ہے  
 جس کا انجام ذلت و خواری کے اور کیا قرار پاسکتا ہے اور آنکھ سو سو طرح سے اشکباری  
 کرتی ہے جو رسوائی اور بدنامی کا موجب ہے۔

دل ہوائے خرام ناز سے پھر محشرستان بے قراری ہے  
 فرماتے ہیں۔ خرام نازیار کے شوق میں پھر ہمارا دل بیقراری کے لئے میدان محشر  
 بن گیا ہے۔

جلوہ پھر عرض ناز کرتا ہے راز بازار جانپاری ہے  
 فرماتے ہیں۔ جلوہ یا رمتاع ناز و غرور کو دکھا کر کہہ رہا ہے کہ کون عاشق جانبا ز اس کا  
 خریدار بنتا ہے۔ گو بازار جانپاری کی ہر روز گرجی بازار ہے۔

پھر اسی بے وفا پر مرتے ہیں پھر وہی زندگی ہماری ہے  
 فرماتے ہیں۔ پھر اسی بے وفا کا عشق دوبارہ پیدا ہو گیا ہے یعنی پہلے جس پر مرتے  
 تھے اور پھر اسی طرح سے زندگی کے دن بسر کر رہے ہیں جس طرح پہلے بسر ہوتے تھے۔

### قطعہ

پھر گھلا ہے درِ عدالتِ نازِ گرم بازارِ فوجداری ہے  
فرماتے ہیں۔ تعطیل ختم ہو گئی۔ پھر عدالتِ ناز کے دروازے کا قفل دبا ہو گیا۔ آج کل  
پھر فوجداری کا بازار گرم ہو گیا۔ مطلب یہ ہے کہ فصلِ محل کے آتے ہی پھر عشق و جنوں کے  
دولے دلوں میں پیدا ہونے شروع ہو گئے۔

ہو رہا ہے جہان میں اندھیر زلف کی پھر سرشتِ داری ہے  
فرماتے ہیں۔ جہان میں پھر وہی اندھیر ہو رہا ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ زلف کو  
پھر عمدہ سرشتِ داری مل گیا ہے۔

پھر کیا پارہ جگر نے سوال! ایک فریادِ آہ و زاری ہے  
فرماتے ہیں۔ پارہ جگر نے پھر دعویٰ دائر کر دیا ہے پھر چاروں طرف سے فریادی ٹوٹ  
پڑے ہیں۔

پھر ہوئے ہیں گواہ عشقِ طلب اشکباری کا حکم جاری ہے  
فرماتے ہیں۔ پھر عدالت کے روبرو عشق کے گواہ پیش ہو رہے ہیں۔ اشکباری کا حکم جاری  
ہے۔ آنسوؤں کے ساتھ خوب دل، لختِ جگر کو عشق کی شہادت میں پیش کر رہا ہے۔

دل و مڑگاں کا جو مقدمہ تھا آج پھر اس کی رو بکاری ہے  
فرماتے ہیں۔ مڑگاں یا ر اور دل عاشق میں جو مقدمہ بازی ہو رہی تھی آج عدالتِ ناز  
میں اس کی رو بکاری ہے۔ یعنی دونوں فرق اپنا اپنا ثبوت دعویٰ اور جواب  
دعویٰ پیش کر رہے ہیں۔ مرزا صاحب کی جدت پسند طبیعت اشعار میں نئی نئی ترکیبیں  
پیدا کئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ چنانچہ یہ قطعہ بھی نہرتِ بیان کا ایک ادنیٰ نمونہ ہے۔

بیخودی بے سبب نہیں غالب کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے  
فرماتے ہیں۔ اسے غالب یہ بیخودی بے سبب تو نہیں ہے۔ کچھ نہ کچھ بات تو ضرور ہے

میں کے چھپانے کی غرض سے یہ یخودی طاری ہوئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اخفائے راز  
 حلقی کے لئے یہ پردہ یخودی حائل ہوا ہے۔

قطع

جنوں تہمت کش تسکین ہو کر شادمانی کی ٹھک پاش خراش دل پر لذت زندگانی کی  
 فرماتے ہیں۔ اے جنوں تجھ پر تسکین کی تہمت میرے تھوڑی دیر کے لئے شادمان ہو جانے کی  
 وجہ سے نہیں عام ہو سکتی۔ اگر میں دم بھر کے لئے خوش ہو گیا تو اس کے معنی یہ نہیں  
 ہیں کہ تجھ پر عہدِ نخواستہ شادمانی کی تہمت لگا دی جائے گی۔ مجھ کجخت کی شادمانی تو  
 زخمِ دل پر ٹھک پاشی کے سبب سے ہے تسکین کی وجہ سے ہرگز نہیں ہے بلکہ اس  
 زخمِ دل پر لذتِ زندگانی کا ٹھک پاش ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہمارا ایسے بُرے  
 حال سے زندہ رہنا زخمِ دل پر ٹھک چھڑک رہا ہے اور زخمِ پر ٹھک چھڑکنے سے زخموں  
 میں سوزش اور تکلیف زیادہ ہو جاتی ہے نہ کہ تسکین۔

کشاکش ہائے ہستی کو کسے کیا سعی آزادی ہوئی زنجیرِ مروج آب کو فرصتِ روانی کی  
 فرماتے ہیں۔ آزادی چلبے جتنی کوشش کرے مگر دنیا میں آکر ہستی سے کوئی آزاد نہیں  
 ہو سکتا دریا کی موجوں کو دیکھ لو وہ آزاد ہونے کے لئے جس قدر ہلکتی ہیں اسی قدر  
 زنجیروں میں زیادہ الجھتی چلی جاتی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ خلائی ہستی سے انسان  
 جس قدر آزاد ہونے کی کوشش کرتا ہے اسی قدر اس کی گرفتاری بڑھتی جاتی ہے۔  
 انجام کار اس کی کوشش کشش سے مغلوب ہو جاتی ہے۔

پس از مردن بھی دیوانہ زیارت گاہِ طفلان؟ شرارہ سنگِ تربت پہ میرے گلفشانی کی  
 فرماتے ہیں۔ مرجانے کے بعد بھی تیرے دیوانہ کو لڑکوں نے زیارت گاہ بنا رکھا ہے اور  
 وہ اب تک بھی میری قبر پر آکر چھڑک رہے ہیں۔ شرارہ سنگ کے پھول قبر پر ہر روز  
 چڑھائے جاتے ہیں۔

## غزل

نکوش ہے سزا فریاد کی بیداد دلبر کی میا دا خندہ دندان نما ہو صبح محشر کی  
 فرماتے ہیں ظلم مشوق کی فریاد کرنے والے مجرم کی سزا زجر و ملامت ہے میں گدھا ہوں  
 کیوں ایسا نہ ہو صبح محشر بھی اس گنہگار کے حق میں خندہ دندان نما بن کر نمودار ہو۔  
 رگِ بلی کو خاکِ مست مجنوںِ ریشی بخشے اگر بودے بجائے دانہ دہقان کو کُشتہ کی  
 مشہور ہے کہ ایک بار بلی کی قصہ ہوئی تھی اور قیس کی رگِ بازو سے خون جاری ہو گیا تھا۔  
 فرماتے ہیں۔ دشتِ مجنوں کی خاکِ رگِ بلی کو زخمی کر دے۔ اگر دہقان غلہ کی جگہ کوکِ  
 کُشتہ ہو دے مطلب یہ ہے کہ اگر دشتِ مجنوں میں دانہ کی جگہ کوکِ کُشتہ ہو تو زمین سے  
 بجائے کوئل کے رگِ بلی پیدا ہو۔ یعنی جذبہ عشق نے عاشق و معشوق اور رگِ دشت  
 میں اس قدر اتحاد یا ہمی پیدا کر دیا ہے۔

پر پر روانہ شاید بادبانِ کشتی سے تھا! ہوئی مجلس کی گرمی سے روانی دُور ساغر کی  
 فرماتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے پر روانہ کا پرے کی کشتی کا بادبان تھا۔ اس لئے کہ جب  
 مجلس خوب گرم ہو گئی تو دُور ساغر چلنے لگا۔ مطلب یہ ہے کہ جہاں بزمِ آرائی ہوتی ہے  
 وہاں شمعِ روشن کی جاتی ہے اور جہاں شمع روشن ہوتی ہے وہاں پروانوں کا لشکر  
 آدھنکا ہے اور گرمی مجلسِ روانی دُور ساغر کا سبب قرار پاتی ہے تو شاید کشتی سے کا  
 بادبان پر پروانہ ہوتا ہے۔

کروں بیدار ذوقِ پریشانی عرض کیا قدرت کہ طاقت اڑ گئی اڑنے سے میرے شہر کی  
 فرماتے ہیں۔ میری کیا مجال ہے جو ذوقِ پریشانی کے ستم و جور کو عرض کر سکوں پھر گئے سے  
 پہلے شہر کی طاقت نے جواب دے دیا۔

کہا تک روؤں اس کے خیمہ کے نیچے قیامت مری قسمت میں یارب کیا نہ تھی دیوارِ شہر کی  
 فرماتے ہیں۔ خیمہ کے نیچے کہاں تک روؤں۔ قیامت ہے کہ یارب میری قسمت میں شہر کی دیوار



بھی نہ تھی۔ مطلب یہ ہے کہ نہ تو گزشتہ میں اتنا جوش ہے کہ کم سے کم فئاتِ غیرہ کو ہمارے اور یارِ کا دیدار نصیب ہو جائے۔ نہ رونے میں ایسا اثر ہے کہ وہ غیرہ سے گھبرا کر باہر نکل آئے یا ہم کو غیرہ کے اندر بلا لے اور قسمت سے بجائے فئاتِ غیرہ سنگین دیوار بھی نہیں ہے کہ نا اُمیدی اور یاموسی کی حالت میں دیوار سے سر ٹکرا کر مر جائیں۔

### غزل

بے اعتدالیوں سے ٹبک سب ہیں جوئے جتنے زیادہ ہو گئے اتنے ہی کم ہوئے  
 فرماتے ہیں جس قدر ہم نے اپنی حد سے تجاوز کیا اُسی قدر لوگوں کی نگاہوں میں ٹبک ہو گئے  
 پنہاں تھا دامِ سختِ قریبِ آشتیاں کے اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے  
 جو مطلب اس طریقہ سے ادا کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ ہم کو ہوشِ منبھانے سے پہلے ہی مصائب و شدائد نے گھیر لیا تھا۔ (از یادگارِ غائب)

ہستی ہماری اپنی فنا پر دلیل ہے یا ٹبک مٹے کہ آپ ہم اپنی قسم ہوئے  
 فرماتے ہیں۔ ہماری ہستی ہماری فنا پر دلیل ہے۔ ہم اس قدر مٹے ہیں کہ آپ اپنی قسم بن گئے  
 ہیں۔ کسی شے کے نہ ہونے کو محاذ سے میں یوں سمجھتے ہیں کہ فلاں شے ہمارے پاس  
 قسم کھانے کو بھی نہیں ہے اور اس قسم پر یہ بھی بولا جاتا ہے کہ نام کو بھی نہیں ہے  
 یعنی اگر وہ شے برائے نام بھی ہوتی تو ثبوتِ قسم کے لئے کافی سمجھی جاتی اور اس طرح  
 کی ہستی جو برائے نام ہو وہ ہستی فنا کی دلیل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم نے اپنی ہستی کو  
 اس قدر مٹا دیا ہے کہ قسم کھانے کے لائق بھی باقی نہیں رہی۔

سمجھتی کشانِ عشق کی پوچھ ہے کیا خبر وہ لوگ رفتہ رفتہ سراپا الم ہوئے  
 فرماتے ہیں۔ عشق کی سمجھناں پہنچنے والوں کی یعنی اپنے عشاقِ مصیبت زدہ کی خبر کیا  
 دریافت کرتے ہو۔ وہ لوگ ٹھکے ٹھکے یعنی فنا ہوئے ہوتے سراپا الم بن گئے۔ مطلب  
 یہ ہے کہ جس طرح رنج و الم ظاہر و محسوس شے نہیں ہے یہی حال ان بد نصیبوں کا ہو گیا

کہ گھٹتے گھٹتے نظر سے پوشیدہ ہو گئے۔

تیری وفا سے کیا بوتلائی کہ دہریہ میں تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے قسم ہوئے  
فرماتے ہیں۔ تیری وفا سے تیری ہی جفا کی تلافی ہو سکتی ہے۔ اور ہم ایسے قسم زدہ ہیں کہ  
تیرے علاوہ زمانے نے بھی ہزاروں قسم ہم پر رکھے ہیں۔ ان کی تلافی تیری وفا سے  
کیونکر ہو سکتی ہے مطلب یہ ہے کہ اگر رحم کھا کر اپنی جفا کی تلافی کرتا ہے تو پھر ایسا کر  
کہ عمر بھر کے لئے ہمیں کوئی شکایت ہی پیدا نہ ہو۔ یعنی دنیا کی تکلیفوں سے بھی  
تیری بدولت چھٹکارا ہو جائے۔ میرزا صاحب معشوق کو مہربان پا کر اور پاؤں  
پھیلاتے ہیں۔

لکھتے رہے جنوں کی حکایات خونچکاں ہر جنبہ اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے  
جنوں سے مراد یہاں عشق ہے۔ فرماتے ہیں۔ ہم عشق کی حکایات خونچکاں اپنے اشعار میں  
لکھتے رہے ہیں۔ باوجودیکہ معشوق نے ہمارے ہاتھ قلم بھی کئے تو بھی ہم تو بے ہوش  
معاملات نظم کرنے سے باز نہ آئے۔ ایک شارح صاحب نے میرزا کے اس مصرعہ ثانی  
پر اپنی جودت طبع دکھانے کے لئے سترہ مصرعے لگائے ہیں مگر اس بیچہ دل کی رائے  
میں میرزا کا مصرعہ ادنیٰ سب پر سبقت حاصل کئے ہوئے ہے۔

اللہ ری تیری تندگی خو جس کے بیم سے اجزائے نالہ دل میں مئے رزق ہم ہوئے  
فرماتے ہیں۔ تیری بد مزاجی کے خون سے نالہ کب تک نہ آسکا نالہ دل دل ہی میں تحلیل  
ہو گیا اور اس کا ایک جزو دوسرے جزو کو اسی طرح نوش جان فرما گیا جس طرح خون  
سے رگوں میں خونی خشک ہو جاتا ہے۔

اہل ہوس کی فتح ہے ترک نبرد عشق جو پاؤں اٹھ گئے وہی ان کے علم ہوئے  
فرماتے ہیں۔ ہوا موسوں کی جیت اسی میں ہے کہ میدان عشق کو چھوڑ کر بھاگ جائیں اور  
وہ لوگ اپنے دل میں یہ سمجھیں کہ میدان سے بھاگتے وقت جو پاؤں اٹھا وہ گویا علم فتح کا

بند ہوا۔ جان بچی لاکھوں پائے۔

نامے عدم میں چند ہمارے سپرد تھے جو وہاں پہنچ سکے سو وہ یاں کے دم ہوئے  
فرماتے ہیں ہم انہی پر نصیب ہیں۔ ازل میں بھی ناکہ کشی کا منصب ہم کو عطا ہوا تھا جو نامے  
وہاں پہنچنے سے باقی رہ گئے تھے وہ دُنیا میں آکر ہمارے لئے سانس ہی گئے۔ مطلب یہ  
ہے کہ ہم نہ عدم میں خوش تھے نہ وجود میں آکر خوش رہے۔ ہمارے لئے سانس بھی ناموں  
کا حکم رکھتے ہیں۔

چھوڑی آمد نہ ہم نے گدائی میں دل لگی سائل ہوئے تو عاشق اہل کرم ہوئے  
فرماتے ہیں۔ اے آسمان ہم نے گدائی میں بھی عاشق مزاجی ترک نہ کی۔ سائل ہونے کی حالت  
میں جس کسی نے ہمیں پیسہ ملکہ دیا ہم اُسی کے عاشق ہو گئے۔

### غزل

جو نہ نقدِ داغِ دل کی گمے شعلہ یاسانی تو فسر دگی نہاں ہے بہ کین بے زبانی  
فرماتے ہیں۔ اگر شعلہ عشق میرے داغِ دل کی حفاظت نہ کرے یعنی اسے ٹھنڈا ہونے  
سے نہ روکتا رہے تو فسر دگی کا قابو چل جائے جو بے زبانی کے پردہ میں جوہر کی طرح  
چھپی چھپی ہے اور قابو ڈھونڈ رہی ہے کہ ذرا غافل پاؤں تو اشرفی داغِ دل کو  
لے بھاگوں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر شعلہ عشق داغِ دل کی ہر وقت خبر داری نہ کرتا رہے  
تو داغِ دل ٹھنڈا ہو جائے۔

مجھے اس سے کیا توقع بہ زمانہ جوانی کبھی کو دکھ میں جس نے نہ سنی میری کہانی  
فرماتے ہیں۔ کم عمری میں کہانی سننے کا شوق بہت ہوا کرتا ہے۔ اس عمر میں تو اس مفرد  
نے کبھی میری کہانی سنی ہی نہیں۔ اب جوانی کے زمانے میں مجھے اس سے کب  
یہ توقع ہو سکتی ہے کہ میری مصیبت کی داستان سنے گا۔

یونہی دیکھ کسی کو دینا نہیں خوب نہ کہتا کہ مرے عدد کو یا رب طے میری زندگانی

فرماتے ہیں۔ بے وجہ کسی کو تکلیف دینی اچھی بات نہیں ہے ورنہ میں ضرور یہ دُعا مانگتا کہ انہی سیری مصیبتیں دشمن کو مل جائیں جو میرے رنج و غم کو دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔

### غزل

ظلمت کدہ میں میرے شبِ غم کا جوش ہے ایک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے  
میرزا صاحب نے عود ہندی میں خود اس مطلع کی شرح لکھی ہے۔ وہ فرماتے ہیں ایک شمع  
ہے دلیلِ سحر خموش ہے۔ یہ خبر ہے پہلے مصرعہ کی، مصرعہ: ظلمت کدہ میں میرے شبِ غم  
کا جوش ہے، یہ مبتدا ہے شبِ غم کا جوش یعنی اندھیرا ہے (اندھیرا۔ ظلمت غلیظ) سحر ناپیدا  
گویا خلق ہی نہیں ہوئی۔ ہاں ایک دلیلِ سحر کی بود بر ہے یعنی بھیجی ہوئی شمع (اس راہ سے  
کہ شمع و چراغ صبح کو بجھ جایا کرتے ہیں۔ لطف اس مضمون کا یہ ہے کہ جس شے کو دلیل  
صبح ٹھہرایا ہے وہ خود ایک سبب ہے منجملہ اسباب تاریکی کے۔ پس دیکھنا چاہئے جس  
گھر میں علامت صبح ہوئے ظلمت ہوگی وہ گھر کتنا تاریک ہوگا۔

نے مژدہ دھال نہ نظارہ جمال مدت ہوئی کہ آشتی چشم دگوش ہے  
فرماتے ہیں۔ نہ اب وصل کا مژدہ کانوں کو حاصل ہوتا ہے نہ جمال کا نظارہ آنکھوں  
کو میسر رہا ہے۔ مدت ہو گئی کہ چشم دگوش میں باہم اتحاد و اتفاق پیدا ہو گیا ہے۔ مطلب  
یہ ہے وہ زمانہ گزر گیا کہ جب آنکھوں کو اگر نظارہ جمال ہوتا تھا تو کانوں کو رشک  
پیدا ہو جایا کرتا تھا کہ ہم کو بھی وصل کا مژدہ ملے یا کبھی کانوں تک وصل کی خوشخبری  
پہنچ جاتی تھی تو آنکھوں کو حسد پیدا ہو جاتا تھا تو کانوں نے تو مژدہ وصل سن لیا اور  
ہم نظارہ جمال سے محروم ہیں۔

مے نے کیا ہے حسنِ خود آرا کو بے حجاب اسے شوقِ یار اجازتِ تسلیم ہوش ہے  
فرماتے ہیں۔ شراب نے حسنِ خود آرا کو بے حجاب کر دیا ہے۔ اسے شوقِ دل عاشق اب تجھ کو  
بھی اجازت ہے کہ تو بھی تھوڑی دیر کے لئے اپنے ہوش و حواس اسِ مہم بے حجاب کی

نذر کر دے۔

گوہر کو عقد گردنِ خروباں میں دیکھنا کیا اوج پر ستارہ گوہر فروش ہے  
نزلتے ہیں۔ موتیوں کا بار حینوں کی گردنوں میں دیکھنا خسیب ہو گیا ہے۔ گوہر فروش کا  
ستارہ کس قدر اوج پر ہے۔

دیدارِ بادۂ حوصلہ ساقی نگاہِ مست بزمِ خیالِ میگدہ نے خردش ہے  
فرماتے ہیں۔ دیدار تو شراب ہے اور حوصلہ ساقی ہے اور نگاہِ میخوار ہے۔ خیالی مجلس  
ایک ایسا میگدہ ہے جس میں کسی قسم کا غل و شور ہی نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بزم  
خیالی عجب سرور و افزائش نظر ہے۔ مصرعہ اولیٰ میں اضافت کہیں نہیں ہے۔

قطعہ

اے تازہ دارِ دانِ بساطِ ہوائے دل دہنار اگر تھیں ہوسِ نئے و نوش ہے  
فرماتے ہیں۔ اے نوجوانو! تم نصائی خواہشوں میں تازہ گرفتار ہوئے ہو۔ خبردار اگر تم کو  
نے کا سنا اور شراب کا پینا منظور ہے تو:-

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرتِ نگاہ ہو میری سُنو جو گوشِ نصیحتِ نبوش ہے  
مجھ کو دیکھو اور میرا حال دیکھ کر عبرت حاصل کرو اور نے کے مقابلہ میں میری نصیحت گوش  
دل سے سُنو وہ نصیحت یہ ہے کہ:-

ساقی۔ جلوہ دشمنِ ایمان آگئی! مطرب یہ نغمہ رہزنِ تکلیں ٹہوش ہے  
ساقی اس جلوہ گری کے ساتھ ایمان و آگئی کا دشمن واقع ہوا ہے اور مطرب اس  
خوش گھڑائی کے ساتھ تکلیں و ہوش کا کوٹ لے جلنے والا ہے۔

یاشب کے دیکھنے تھے کہ ہر گوشہ بساطِ دامنِ باغبان و گنِ گل فروش ہے  
یا تو رات کو نظر کے سامنے وہ تماشے ہو رہے تھے کہ فرش کا ایک ایک کونہ پھولوں کی آراستگی  
سے باغبان کا دامن اور گل فروش کا ہاتھ بنا ہوا تھا یعنی عجب دبستگی اور دلچسپی کے سامان

جمع ہو گئے تھے اور ان کی تفصیل یہ ہے۔

لطفِ خرام ساقی و ذوقِ صلائے چنگ یہ جنتِ نگاہ وہ فردوسِ گوش ہے  
ساقی کی ستانہ چال پامل کے دیتی تھی اور چنگ درباب کی آواز کھینچے لیتی تھی ایک طرف  
تو نگاہ کے لئے جنتِ بکا سماں رو برد تھا اور دوسری طرف کانوں کے واسطے فردوس  
کی نغمہ سرائی کے لطف حاصل ہو رہے تھے۔ یہ گو یا حوریں تھیں اور وہ طیور خوشنما۔

یا صبحدم جو دیکھئے آکر وہ بزم میں نے وہ سرور و سوز نہ جوشِ خروش ہے  
صبح کے وقت جو آکر دیکھا تو بزم میں غیبِ اُواسی اور بے رونقی پائی جاتی تھی نہ تو وہ  
باجوں کی آوازیں تھیں نہ وہ اہل بزم کا سوز و گداز تھا نہ وہ تھفل کا جوش و خروش تھا۔  
دراغِ فراق صحبتِ شب کی جلی ہوئی اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خاموش ہے  
ان سب کیفیتوں اور سامانِ انبساط کے بدلے یہ نظر آ کر صحبتِ شب کی جلی ہوئی اور  
دراغِ فراق سے افسردہ خاطر ایک شمع باقی ہے اور وہ بھی کجنتِ دل عاشق کی طرح  
بجھی ہوئی ہے۔

آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں غالب صریحِ خامہ نوائے سروش ہے  
حق تو یہ ہے ایسی زبردست غزل لکھ کر میرزا صاحب کا یہ مقطع لکھنا ہرگز تعلق میں افضل  
نہیں ہے بلکہ حقیقتِ حال ہے۔ فرماتے ہیں۔ میرے خیال میں ایسے مضامین بلند  
غیب سے وار رہتے ہیں۔ اسے غالب میرے خامہ کی آواز فرشتہ کی صدا سمجھنی چاہئے۔

### غزل

آگہ میری جان کو قرار نہیں ہے طاقتِ بیدادِ انتظار نہیں ہے  
فرماتے ہیں آگہ میری جان زار کو صبر و قرار باقی نہیں رہا ہے۔ اب مجھ میں  
بیدادِ انتظار سننے کی طاقت باقی نہیں ہے۔

دیتے ہیں جنتِ حیاتِ دہر کے بدلے نشہِ باندازہٴ خسار نہیں ہے

فرماتے ہیں۔ حیاتِ دُنیا کے بدلے جنت عطا فرمائی جائے گی، لیکن دُنیاوی تکلیفوں کی تلافی جنت سے نہ ہو سکے گی اور اس بیان کی مثال یہ پیش کرتے ہیں کہ جس نے نشہ کی آٹار کی مصیبت بے انتہا جھیلی ہو اور اس کے بعد اس کو تھوڑی مقدار میں شراب دی جائے تو وہ کیا نشہ کر سکتی ہے۔

گر یہ نکالے ہے تیری بزم سے مجھ کو ہائے کہ رونے پہ اختیار نہیں ہے فرماتے ہیں۔ میرا رونا تیری بزم سے مجھ کو نکال رہا ہے یعنی آنسو تو رکتے نہیں اور میں شرمِ بدنامی سے بزم میں ٹھہر نہیں سکتا۔ افسوس اس بات کا ہے کہ مجھ کو اپنے پر بھی دل کی طرح سے اختیار نہیں ہے۔ آنسوؤں کا روکنا میرے اختیار سے باہر ہے۔

ہم سے عبث ہے گمانِ رنجشِ خاطر خاک میں عشاق کی غبار نہیں ہے فرماتے ہیں۔ ہم تو گویں سے رنجشِ خاطر کا گمان ہے فائدہ ہے۔ عشاق تو ایک مُشتِ خاک سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتے جو زندگی میں خاک ہو گئے ہیں ان میں غبارِ خاطر کو دخل نہیں ہے۔

دل سے اٹھا لطفِ جلوہ ہائے معافی غیرِ گلِ آئینہ بہار نہیں ہے فرماتے ہیں۔ جلوہ معافی آئینہ دل میں اسی طرح سے نظر آیا کرتا ہے جس طرح آئینہ گل میں بہار کا سُسن و جمال دکھائی دیا کرتا ہے۔

قتل کا میرے کیا ہے عہد تو بارے وائے اگر عہد استوار نہیں ہے فرماتے ہیں۔ اس نے خدا خدا کر کے میرے قتل کرنے کا عہد تو کر لیا ہے مگر یہ تو کہہ دیا ہے کہ تجھے ہم ضرور قتل کر دیں گے۔ ہائے اگر یہ عہد مضبوط نہیں ہے تو بڑا

ستم جو لگا۔  
تو نے قسم یکیشی کی کھائی ہے غالب تیری قسم کا کچھ اعتبار نہیں ہے

فرماتے ہیں۔ اے غائب تو نے میکشی کی قسم کھائی ہے۔ تیری قسم سے یہ ثابت نہیں ہے کہ ترک میکشی کی قسم کھائی ہے یا میکشی کرنے کی اور جب تیری قسم سے یہ دونوں پہلو جھلک رہے ہیں تو ہمیں تیری قسم کا ہرگز اعتبار نہیں ہے۔

### غزل

ہجوم غم سے یاں تک سرنگونی مجھ کو حاصل ہے کہ تارِ دامن و تارِ نظر میں فرق شکل ہے  
فرماتے ہیں۔ میرے حصہ میں اتنا غم آگیا ہے کہ اس کے بوجھ سے میرا سر میرے دامن  
قبا سے اس طرح جا ملا ہے کہ نظر کے تار اور قبا کے تاروں میں فرق محسوس نہیں ہوتا۔  
رفیع زخم سے مطلب لذت زخم سوزن کی سمجھ بیست کہ پاس درد سے دیوانہ غافل ہے  
فرماتے ہیں۔ زخم میں غم لگنے لگانے سے مجھ کو لذت زخم سوزن مطلوب ہے اور اس لذت  
کو حاصل کر کے جو میں بے خود و مدہوش ہو جاتا ہوں اور پھر ہوش میں آکر لطف  
سے تڑپ جاتا ہوں تو اس کو یہ نہ سمجھنا کہ درد زخم کی وجہ سے دیوانہ غافل ہو گیا ہے۔  
وہ گل جس گلستاں میں جلوہ فرمائی گئے غائب چمکنا غنچہ و گل کا صدائے خندہ دل ہے  
فرماتے ہیں۔ وہ گل اندام جس باغ میں اے غائب سیر کے واسطے جاتا ہے اُس کے  
حُسن و کِش کے اثر سے گلآب کی کلیاں جو چمکتی ہیں ان میں سے خندہ دل کی آواز  
نکلتی ہے مطلب یہ ہے کہ اس کو دیکھ کر باغ کا دل بھی باغ باغ ہو جاتا ہے۔

### قطعہ

بہر دامن ہو رہا ہوں بسکہ میں صحرا نور خارِ پایاں جو ہر آئینہ زانو مجھے  
فرماتے ہیں۔ میں صحرا نور دی کا عادی تھا۔ بہر مجبوری پایا بہر دامن ہو کر یعنی پاؤں نورِ ذکر  
گھر میں بیٹھ رہا ہوں۔ صحرا نور دی کے زمانے میں جو کانٹے طیسرے پاؤں میں چبھے  
تھے وہ اب آئینہ زانو کا جو سر بن گئے ہیں۔ زانو کو آئینہ سے تشبیہ دی جاتی ہے  
اور آئینہ فولاد دی کے جوہر کانٹوں سے مشابہت رکھتے ہیں۔



دیکھنا حالت مے دل کی ہم آغوشی کے وقت ہے نگاہ آشنا تیرا سر سر ہو مجھے  
 فرماتے ہیں۔ ہم آغوشی کے وقت میرے دل کی حالت دیکھنے کے قابل ہو گی، یعنی یہ  
 وہی دل ہے جو برسوں تیری زلفوں میں اسیر رہ چکا ہے۔ اس لئے یہ تیرے ایک  
 بال کو نگاہ آشنا سمجھتا ہے اور کسی دوست کے دل کا حال دوست کو خوب  
 معلوم ہوتا ہے۔

ہوں سراپا ساز آہنگ شکایت کچھ نہ چھوٹے ہے یہی بہتر کہ لوگوں میں نہ چھوٹے تو مجھے  
 فرماتے ہیں۔ میں وہ باجا ہوں جس میں تیری شکایت کا راگ بھرا ہوا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ  
 کہ تو غموں کے سلسلے مجھے نہ چھوٹے۔ اگر تو مجھ کو چھوٹے گا تو تیری شکایت کا راگ  
 میرے دل سے نکلنا شروع ہو جائے گا۔

### غزل

جس بزم میں تو ناز سے گفتار میں آئے جاں کا لہجہ صورت دیوار میں آئے  
 فرماتے ہیں۔ ناز و ادا کے ساتھ جس بزم میں تو باتیں کرنا ہے اس مکان کی دیواروں  
 پر جو تصویریں لگی ہوتی ہیں ان میں جان پڑ جاتی ہے۔

سایہ کی طرح ساتھ پھر میں سرو صنوبر تو اس قدم دکش سے جو گلزار میں آئے  
 فرماتے ہیں۔ سرو صنوبر سایہ کی طرح تیرے ساتھ ساتھ پھرتے رہیں۔ پھر گلستاں کے پابند  
 نہ رہیں۔ مگر تو اس قدم دکش سے ایک بار بھی باغ میں چلا آئے (سے) کے معنی یہاں  
 ساتھ یا ہمراہ کے ہیں۔ اکثر اہل زبان محاورے میں اس کو اسی طرح استعمال کرتے ہیں۔  
 میرزا کا یہ شعر بیت الغزل ہے۔

تب ناز گرا نہماں گلی اشک بجا ہے جب بخت جگر دیدہ خونبار میں آئے  
 فرماتے ہیں۔ ہم اس وقت اپنے آنسوؤں کو انمول موتی سمجھیں گے جب جگر کے  
 ٹکڑوں کے ساتھ انھوں میں مل کر دیدہ خونبار میں آجائیں گے۔

دے مجھ کو شکایت کی اجازت کہ شکر کچھ تجھ کو مزا بھی مرے آزار میں آئے  
یہ دوسرا شعر بھی محال زمین ہے ایسے محلاں قدرِ شکر ایسی سُست زمینوں میں کب کسی کو  
نصیب ہوا کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔ اگر تجھ کو اپنی سمجھاری کا لطف اٹھانا ہے تو مجھ کو شکایت  
کی اجازت دیدے۔ اگر صبر و خاموشی کے ساتھ جس نے تیرے ظلم و ستم اٹھائے تو تجھ کو  
کیا معلوم ہو گا کہ کون سا تیر جفا تیرا زیادہ کارگر ہوا اور کون سا ناک وک بیداد تیرا  
اور جھارِ خم ڈالتا ہوا بھل گیا۔

اس چشمِ فسوں گر کا اگر یائے اشارہ طوطی کی طرح آئینہِ گفتار میں آئے  
فرماتے ہیں۔ اس کی چشمِ فسوں گر کا اشارہ پا جائے تو آئینہ بھی طوطی کی طرح باتیں  
کرنے لگے۔

کانٹوں کی زباں سوکھ گئی پیاس یارب اک آبلہ یادِ دی پر خار میں آئے  
فرماتے ہیں۔ کانٹوں کی خشک زبانی پیاس کی وجہ سے ہے آبلوں کا پانی مل جائے تو ان کی  
خشکی رفع ہو۔

مر جاؤں کیوں رشک جب وہ تن نازک آغوشِ خمِ حلقہ زنتار میں آئے  
فرماتے ہیں۔ میرا مشتوق زنتار بندہ ہو ہے۔ اس کے دوش پر زنتار دیکھ کر مجھ کو رشک  
آتا ہے کہ وہ نازک جسم میرے آغوش میں نہ ہو اور حلقہ زنتار میں ہو۔ مرنے کی جگہ ہے۔  
غارِ تنگِ ناموس نہ ہو گر ہوسِ نذر کیوں شاہدِ گلِ بارغ سے بازار میں آئے  
فرماتے ہیں۔ گل کو ہوسِ زربے۔ یعنی گلاب میں جو زیرہ ہوتا ہے اُس کو زربل کہتے ہیں  
اب گل کو یہ ہوس ہے کہ اس زرب کو زیادہ ہونا چاہے۔ اس لئے ہوسِ زرب سے اس کو  
بازار میں بکنے کے واسطے آنا پڑا۔ اور اس صورت میں بربادیِ ناموس ظاہر ہے۔  
یعنی شاہدِ بازاری ہو گیا۔

تب چاکِ گریباں کا مزا دلِ نالوں جب اک نفس اُلجھا ہوا ہر تار میں آئے

فرماتے ہیں اے دل نالاں گریباں چاک کرنے کا مزا یہ ہے کہ تارِ گریباں کے ساتھ  
سانس ہی کھینچ آئے اور تارِ نفس ٹوٹ کر دم نکل جائے۔

آتشِ کدہ ہے سینہ مرا رازِ نہاں سے اے دے اگر معرضِ اظہار میں آئے  
فرماتے ہیں میرا سینہ رازِ نہاں کی گرمی سے آتشِ کدہ بن گیا ہے۔ اگر وہ راز ظاہر ہو گیا تو  
معلوم نہیں کہاں کہاں تک جگ لگ جائے گی۔

گنجینہٴ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے جو لفظ کہ غائب مرے اشعار میں آئے  
فرماتے ہیں اے غائب کیرے اشعار کا ایک ایک لفظ گنجینہٴ معنی اور طلسم معنی سمجھنا چاہئے  
یعنی میرے ایک لفظ میں کئی کئی معنی ہوتے ہیں اس لئے اس کو گنجینہٴ سمجھنا چاہئے اور  
طلسم اس درجہ سے اس کو کہا جاتا ہے کہ ایک ایک معنی میں کئی کئی پہلو نکلتے ہیں اور  
طلسم کی تعریف یہ ہے کہ مشکل سے نکلتے اور نہایت حیرت انگیز ہو اس لئے اس کو  
طلسم کہا جاتا ہے مطلب یہ ہے کہ میرا کلام بہت دشواری سے سمجھ میں آتا ہے اور  
سمجھ جانے کے بعد اس کے معنی سے ایک حیرت پیدا ہوتی ہے۔

### غزل

حُسنِ مہِ گرجہ بہنگا مہِ مالِ اچھا ہے اس سے میرا مہِ خورشیدِ جمالِ اچھا ہے  
دوسرے مصرعے میں دعویٰ متضمنِ دلیل ہے۔ معشوق کو مہِ خورشیدِ جمالِ اس لئے کہا ہے  
تاکہ اس کو مادہٴ کامل پر ترجیح دینے کی وجہ پیدا ہو جائے (از یادگارِ غالب)  
بوسہ دیتے نہیں اور دل پہ ہر لحظہ نگاہِ حسی میں کتے ہیں کہ مفت آئے تو مالِ اچھا ہے  
میرزا نے اس شعر میں حرص و آرزو معشوقانہ کی تصویر کھینچ دی ہے۔ فرماتے ہیں۔ ہر لحظہ  
یعنی بار بار دل پر نگاہ ڈالتے ہیں جس سے دل کا سوال پیدا ہوتا ہے اور بوسہ دینے  
سے صاف انکار ہے۔ چہرہ کے تغیرات دلی خیالات کے ترجمان ہیں۔ دل تو یہ کہہ رہا ہے  
کہ مالِ اچھا ہے چھوڑنا نہ چاہئے مگر نازِ معشوقانہ جو حرص کا پہلو ہے بوسے ہے وہ

یہ تعلیم دے، ہا ہے کہ اگر مفت میں مل جائے تو اس صورت میں اچھا مال ہے پھر کسی کو قے پر دوسرے کو جان کی قیمت میں لگائیں گے۔

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا جام جم سے یہ ہر جام سفال اچھا ہے شاعر کے ذہن میں پہلے سے اپنی اپنی جگہ یہ باتیں ترتیب وار موجود تھیں کہ مٹی کا کوزہ ایک ضایع کم قیمت اور ارزاں چیز ہے جو بازار میں ہر وقت مل سکتی ہے اور جام جم بیشہ ایک ایسی چیز تھی جس کا بدل دُنیا میں موجود نہ تھا۔ اس کو یہ بھی معلوم تھا کہ تمام عالم کے نزدیک جام سفال میں کوئی خوبی ایسی نہیں ہے جس کی وجہ سے وہ جام جم جیسی چیز سے ناپکی اور افضل سمجھا جائے۔ نیز یہ بھی معلوم تھا کہ جام جم میں خراب پنی جاتی تھی اور مٹی کے کوزے میں بھی خراب پنی جاسکتی ہے۔ اب قوت تمخید نے ان تمام معلومات کو ایک نئے ڈھنگ سے ترتیب دے کر ایسی صورت میں جلوہ گر کر دیا کہ جام سفال کے آگے جام جم کی کچھ حقیقت نہ رہی اور پھر اس صورت موجودہ فی الذہن کو بریائی کا ایک دلقریب پیرایہ دے کر اس قابل کر دیا کہ زبان اس کو پڑھ کر زبان سلفہ اور کان اس کو سُن کر محفوظ اور دل اس کو سمجھ کر متاثر ہو سکے، اس مثال میں وہ قوت جس نے شاعر کی معلومات سابقہ کو دوبارہ ترتیب دے کر ایک نئی صورت بخشی ہے وہ تخیل یا ایمجینشن ہے اور اس نئی صورت موجودہ فی الذہن نے جب الفاظ کا لباس پہن کر عالم محسوسات میں قدم رکھا ہے۔ اس کا نام شعر ہے۔ نیز اس مثال میں ایمجینشن کا عمل خیالات اور الفاظ دونوں کے لحاظ سے بحر تہ فائیت اعلیٰ درجہ میں واقع ہوا ہے کہ باوجود کمال سادگی اور بے ساختگی کے نہایت بلند اور نہایت تعجب انگیز ہے (از سولانا حالی ترجمہ اللہ علیہ السلام) بے طلب میں تو مرزا اس میں سوا ملتا ہے وہ گدا جس کو نہ ہو خوئے سوال اچھا ہے فرماتے ہیں۔ سوال کی تلمی عطا کی شیرینی کو بہ مزا کر دیتی ہے جو چیز بے طلب عنایت فرمائی جائے، اس کے لطف کا کیا کہنا ہے۔ وہ گدا جس کو عادت سوال کی نہ ہو، اچھا ہے

اس شعر میں ردیف کی نشست ایسی زبردست واقع ہوئی ہے کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔ ان کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے شاعر کو پہلے سے یہ بات معلوم تھی کہ دوست کے ملنے سے خوشی ہوتی ہے اور بھگڑی ہوئی طبیعت بحال ہو جاتی ہے۔ نیز یہ بھی معلوم تھا کہ دوست کو جب تک عاشق اپنی حالتِ نار اور اس کی جُدائی کا صدمہ نہ جتائے دوست عاشق کی محبت اور عشق کا پورا پورا یقین نہیں کر سکتا۔ یہ بھی معلوم تھا کہ بعضی خوشی سے دفعۃً ایسی بےاشت ہوتی ہے کہ رنج و غم اور تکلیف کا مطلق اثر چہرے پر باقی نہ رہے اور اب ایجنشن نے اس تمام معلومات میں اپنا تصرف کر کے ایک نئی ترتیب پیدا کر دی یعنی یہ کہ عاشق کسی طرح سے اپنی جُدائی کے زمانہ کی تکلیفیں معشوق پر ظاہر نہیں کر سکتا کیونکہ جب تکلیف کا وقت ہوتا ہے اس وقت معشوق نہیں ہوتا اور جب معشوق ہوتا ہے اس وقت تکلیف نہیں رہتی۔ اس مثال میں بھی ایجنشن کا عمل سنا اور لفظاً دونوں طرح بدرجہ غایت لطیف اور حیرت انگیز واقع ہوا ہے جیسا کہ ہر صاحبِ فہم پر ظاہر ہے (از مولانا حالی رحمۃ اللہ علیہ)

دیکھئے پاتے میں عشاق تہوں کا کیا فیض اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے گویا معشوق کی تنہا میں ایسا مستغرق ہے کہ دنیا و مافیہا کی کچھ خبر نہیں رہاں تک کہ پینڈت نے سو سال اچھا بتایا ہے تو اس کے اچھا ہونے کے ہی معنی سمجھا ہے کہ شاید اس سال معشوق عاشقوں پر مہربان ہو جائیں نہ یہ کہ اس سال قحط نہیں پڑے گا۔ وہ انہیں آسے گی، رطائیاں نہ ہوں گی وغیرہ وغیرہ (از یادگار غالب)

ہم سخنِ عیشہ نے فریاد کو شیریں سے کیا جس طرح کا کہ کسی میں ہو کمال اچھا ہے فرماتے ہیں۔ فریاد ایک مزدور پیشہ جوان تھا اور شیریں اس کی معشوقہ ایک بڑے دولت مند خاندان کی عورت اور نہایت باعصمت تھی مگر سنگ تراشی کے کمال نے

فریاد کو شیریں تک پہنچا کر اس سے ہکلام کر دیا۔ دُنیا میں کمال عجیب خے ہے۔ اہل کمال کی احتیاج بادشاہوں کو بھی ہوتی ہے۔

قطرہ دریا میں مل جائے تو دریا ہو جائے کام اچھا ہے وہ جس کا مال اچھا ہے فرماتے ہیں۔ فرع کا اپنی اصل کی طرف رجوع کرنا زمانے کے سارے کاموں سے اچھا۔ خضر سلطان کو رکھے خالق اکبر سرسبز شاہ کے بلغ میں یہ تازہ نہال اچھا ہے شاہزادہ خضر سلطان بہادر شاہ ظفر کے ایک داماد شاہزادہ تھے یہ شعران کی مرثیہ میں ہے۔

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن دل کے ہلال نے کو غالب یہ خیال چھاپے فرماتے ہیں۔ اے غالب ہم کو جنت کی حقیقت معلوم ہے لیکن دل کے ہلال نے رکھنے کو یہ خیال اچھا ہے۔ میرزا صاحب نے اس قطع میں قیامت کی شوخی برتی ہے۔

### غزل

نہ ہوئی گرمی مرنے سے تسلی نہ سہی! استحاں اور بھی باقی ہو تو بہ کبھی نہ سہی  
اس مقطع کی نسبت مولانا طباطبائی لکھنوی تحریر فرماتے ہیں۔ اس شعر پر اگر غالب خدا سے سخن ہونے کا دعویٰ کریں تو خدا گواہ ہے کہ نہ جابا ہے۔ بیچ یہ ہے کہ یہ مطلع بھی ویسا ہی بے مثل ہے جیسا مرزا صاحب کا کلام ہے۔ فرماتے ہیں۔ میں نے وفا کا امتحان ایسی کامیابی سے دیا کہ انجام کار اپنی زبان و دہن۔ اس پر بھی اگر آپ کی تسلی نہیں ہوئی اور آپ نے مجھے کمالی وفادار نہیں سمجھا تو اب جو آپ کے خیال میں امتحان ہو وہ بھی میری نفس پر پورا کر لیا جائے یعنی میں نے آپ کے آپ کے عشق میں جان دے دی۔ اب میری نفس بھی اگر آپ چاہیں تو قیامت تک آپ کے کوبہ میں رہ سکتی ہے۔

خارِ خارِ المِ حسرتِ دیدار تو ہے شوقِ گلچیں گلستانِ تسلی نہ سہی

فرماتے ہیں۔ اگر شوق گلستانِ تسلی کا گلچیں نہ بن سکا نہ سہی اس کے واسطے حسرت دیدار کے کاٹنے ہی کافی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر شوق کو تسلی حاصل نہ ہوئی تو حسرت دیدار نے بھی اس کا ساتھ نہ چھوڑا۔ تسلی کے لئے حسرت دیدار کیا کم ہے۔

مے پرستانِ خم مے سُنھے لگائے ہی نہ ایک دن گزرنے ہوا بزم میں ساقی نہ سہی فرماتے ہیں۔ اے مے پرستو، انتظارِ ساقی کے بعد بھی تو خم مے کو سُنھ لگا کر شراب پینی ہی پڑی، اگر ایک دن بزم مے میں ساقی موجود نہ ہوا تو نہ سہی یعنی اگر ساقی ہوتا تو وہ خم مے شیشے اور صراحیاں بھرتا اور صراحی یا شیشے سے شراب گلاس میں نکال کر پیش کرتا ہوتا اس کی غیر موجودگی میں اگر شیشے سے سُنھ لگا کر پی لی تو اس میں کیا فائدہ ہوئی۔ نفسِ قیس کہ بے چشم و چراغ صحرا گز نہیں سمع سیہ خانہ، یلیٰ نہ سہی فرماتے ہیں۔ قیس کا دم صحرائے واسطے چشم و چراغ کا حکم رکھتا ہے یعنی اس سے جنگل آباد ہو کر روشن ہو گیا ہے۔ اگر قیس کو یلیٰ کے سیہ خانہ میں باریابی حاصل ہوئی (اور وہاں سے دستکار دیا گیا) نہ سہی یلیٰ کے گھر کو سیہ خانہ تین غرض سے کہا گیا ہے۔ ایک یہ کہ بچوں کو وہاں بار نہ لی، نفرت سے اس کو سیہ خانہ کہا۔ دوسری بات یہ ہے کہ یلیٰ کا رنگ کالا بیان کیا جاتا ہے اس اعتبار سے بھی اس کا گھر سیہ خانہ ہونا چاہیے تیسری رعایت یہ ہے کہ سلی ہمیشہ سیاہ خیمہ میں رہا کرتی تھی۔

ایک جنگامہ یہ موقوف گھر کی رونقِ فوضہ غم ہی سہی نفیرِ شادی نہ سہی فرماتے ہیں۔ دنیا کی شادی و غم دونوں بے اصل ہیں۔ علاوہ ازیں نکاح عادت میں نہ شادی کی کوئی وقعت نہ غم کی کوئی حقیقت۔ گھر کی رونق کے لئے البتہ انجمنِ آرائی کی ضرورت ہے۔ محفلِ نشاط ہو یا بزمِ ماتم۔ لوگ دونوں صورتوں میں جمع ہو جاتے ہیں۔ نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا۔ اگر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی میرزا صاحب اس شعر میں ان لوگوں کو خطاب کر کے کہتے ہیں جو میرزا کے کلام کو مصل

یاد شوار کستے تھے مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی ناقدہ دان کچھ صلہ یا انعام دینا چاہتا تھا تو نہ دے یا کوئی سخن ناشناس نہیں و آفریں کرتا تھا تو نہ کرے۔  
 عشرت صحبتِ خوباں ہی غنیمت سمجھو نہ ہوئی غالب اگر عمر طبعی نہ سہی  
 فرماتے ہیں جیسنوں کی صحبت میں جو ایک دم بھر کے واسطے ناپائدار خوشی حاصل ہو جاتی  
 ہے۔ اے غالب اسی کو غنیمت سمجھو۔ اگر اس کو قیام نہیں ہے نہ سہی۔

### غزل

عجب نشاط سے جلاؤ کے چلے ہیں ہم آگے کہ اپنے سایہ سے سر پاؤں سے دو قدم آگے  
 فرماتے ہیں۔ اس خوشی کے ساتھ قتل ہونے کے لئے ہم جلاؤ کے آگے آگے قتل کی طرف  
 دوڑے ہوئے چلے جاتے ہیں کہ ہمارے پاؤں جو شوقِ قتل میں جلد جلد بڑھ رہے ہیں  
 ہمارے سر کا سایہ ابھی سے بھی دو قدم آگے آگے بھاگا جا رہا ہے۔ انتخابِ بخت کی  
 جانب واقع ہو تو سایہ آگے کی طرف پڑتا ہے۔

قصا نے تھا مجھے چاہا خراب بادۃُ لطف فقط خراب لکھا بس نہ چل سکا قلم آگے  
 فرماتے ہیں۔ مجھ کو خراب بادۃُ لطف لکھنا چاہا تھا مگر قلم مست و مدہوش ہو کر قلم گیا اور  
 بادۃُ لطف نہ لکھ سکا یعنی خراب بادۃُ لطف کا جملہ اتھام رہ گیا اور اسی وجہ سے میں بڑا  
 خراب ہی رہ گیا یہاں اس جملہ کی ناٹھامی نے غیبِ لطف پیدا کر دیا اور اکثر کسی حالت  
 کی ناٹھامی کا بیان زیادہ لطف خیز ہوتا ہے بہ نسبت اس حالت کے تمام ہو جانے کے۔  
 غم زمانہ نے جھاڑی نشاطِ عشق کی سستی و گرنہ ہم بھی اٹھاتے تھے لذتِ الم آگے  
 فرماتے ہیں۔ دُنیا کے الم و غم نے سارے نشے بہن کر دیئے ورنہ ہم بھی غمِ عشق کی لذتوں کے  
 لطف اٹھایا کرتے تھے۔

خدا کے واسطے داؤ اس جنونِ شوق کی دینا کہ اس کے در پہ پہنچتے ہیں نامہ برس ہم آگے  
 فرماتے ہیں خط لکھ کر اس کے جواب کا دل میں ایسا شوق پیدا ہو جاتا ہے کہ ہم نامہ برس



بھی پہلے مشق کے دروازے پر پہنچ جاتے ہیں۔

یہ عمر بھر جو پریشانیاں اٹھائی ہیں تمہارے آئو اے طرہ ہائے خم بہ خم آگے تیرے آگے آگے ایک قسم کا کوسا ہے۔ غور میں اس محل پر تیرے دیکھ گھسٹنوں کے آگے آئے بولتی ہیں۔ میرزا فرماتے ہیں۔ اس طرہ ہائے خم مشق یہ عمر بھر جو ہم نے تمہاری وجہ سے پریشانیاں اٹھائی ہیں یہ تمہارے آگے آئے یعنی خُدا تم کو ہمارے تکلیف دینے کا بدلہ دے۔

دل جگر میں پُر افشاں جو ایک جہ فوں ہے ہم اپنے زعم میں سمجھے تھے اسکو دم آگے فرماتے ہیں۔ ہم میں کوسا جس سمجھ رہے تھے وہ ایک صحت فوں کی پُر افشاں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ غم نے دل و جگر کو فوں کر دیا ہے۔

قسم جنائے پہ آئینگی میرے کھاتے ہیں غائب ہمیشہ کھاتے تھے جو میری جان کی قسم آگے فرماتے ہیں۔ یا تو اس قدر محبت اور ایسا انجاد تھا کہ میری جان کی قسم کھایا کرتے تھے یا اب ایسی نفرت پیدا ہو گئی ہے کہ جنازہ پر آنے سے بھی صحت انکار کیا جاتا ہے۔

### غزل

شکوہ کے نام سے بے مہر خفا ہوتا ہے یہ بھی مت کہہ کہ جو کئے تو گھا ہوتا ہے  
فرماتے ہیں شکوہ کے نام سے اس کو ایسی نفرت ہو گئی ہے کہ اگر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس کو (شکوہ سے نفرت ہو گئی ہے) تو اس بیان کو بھی گھلا سمجھتا ہے یعنی یہ بیان بھی داخل شکوہ سمجھا جاتا ہے۔

پُر ہوں میں شکوہ سے یوں ارگ سے جیسے بابا اک ذرا چھیرے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے  
فرماتے ہیں میں شکایت سے ایسا بھرا ہوا ہوں کہ یہ ارگ سے بابا بھرا ہوا ہوتا ہے اور اک ذرا چھیرہ کر دیکھئے کیا ہوتا ہے یعنی میں کس قدر شکایت کرتا ہوں اور کیسے کیسے بگے میری زبان پر آ جاتے ہیں۔ چھیرا محاورہ میں آغاز گفتگو کو بھی کہتے ہیں اور بابا

شروع کرنے کو بھی کہتے ہیں۔ اور ایسے مذاق کو بھی کہتے ہیں جس سے دوسرا آدمی بُرا مانے۔  
گو سمجھتا نہیں پر حُسنِ تلافی دیکھو! شکوہ جو سے سرگرم بٹھا ہوتا ہے  
فرماتے ہیں جس وقت مشوق سے ہم اس کے جوہر کی شکایت کرتے ہیں، باوجودِ کہ وہ  
اپنی کسی کی وجہ سے ہماری بات کا پہلو سمجھ نہیں سکتا۔ مگر تاہم یہ حُسنِ تلافی قابلِ دید  
بلکہ لائقِ داد ہے کہ وہ جفا پر اور زیادہ مستعد ہو جاتا ہے۔

عشق کی راہ میں چرخِ بکوب کی وہ چال سست و جیسے کوئی آبلہ یا ہوتا ہے  
فرماتے ہیں۔ عشق کی راہ میں آسمان ستارہ دار اس طرح چلتا ہے جیسے کوئی آبلہ یا بہت  
تکلیف سے آہستہ آہستہ چلتا ہے۔ آسمان کو چرخِ بکوب کہہ کر اس کا آبلہ یا ہونا ثابت کیا ہے۔  
خوب تھا پہلے سے ہوتے جو ہم اپنے بد خواہ کہ بھلا چاہتے ہیں اور بُرا ہوتا ہے  
فرماتے ہیں۔ زمانے کو ہم سے ایسی ضد پیدا ہو گئی ہے کہ ہمارا ہر کام برخلاف مدعا ہوا  
کرتا ہے۔ اگر ہم پر پہلے ہی سے یہ بات ظاہر ہو جاتی تو ہم اپنے بد خواہ بن جاتے اور  
ہماری بد خواہی ہماری مدعا برآری کی صورت پیدا کر دیتی۔ یعنی ہمارا ہر کام برعکس مدعا  
ہوتا ہے جب ہم اپنی بربادی کی خواہش کرتے تو نتیجہ اس کا کارِ برآری ہوتا۔ میرزا کی  
شوخی طبعیت کا یہ شعر ثبوت دے رہا ہے۔

کیوں نہ نکھر میں بدتِ ناوکِ بید کہ تم آپ اٹھالاتے ہیں گرتیرِ خطا ہوتا ہے  
فرماتے ہیں۔ ہم تیرے اُس طرح کے ایسے شائق ہیں کہ اگر کوئی تیرِ خطا ہوتا ہے تو ہم دوڑ کر اس تیر  
کو اٹھالاتے ہیں اور ناوکِ اُٹلن کی نذر کر دیتے ہیں کہ بچے پھر اس کو دوبارہ لگائیے  
اور ہم کو بدتِ تیرِ ستم کے بغیر نہ چھوڑیے۔

نالہ جاتا تھا یرے عرش سے میرا اور اب لب تک آتا ہے جو ایسا ہی رسا ہوتا ہے  
فرماتے ہیں۔ یا تو وہ کیفیت تھی کہ میرا نالہ سات آسمانوں سے گزر کر بابِ اجابت پر  
پہنچتا تھا۔ یا اب ضعف و نقاہت سے یہ حالت ہے کہ جو نالہ بہت ہی رسا ہوتا ہے وہ

لب تک آجاتا ہے ورنہ ایسا دیرسا نالہ تو سینہ ہی میں گم ہو کر رہ جاتا ہے۔

قطعہ

خامہ سیرا کہ وہ ہے بار بدر بزم سخن! شاہ کی مدح میں یوں نغمہ سرا ہوتا ہے  
بار بد ایک مشہور گوئیے کا نام ہے۔ فرماتے ہیں۔ میرا قلم وہ کہ بزم سخن کا ایک بار بد ہے  
بادشاہ کی مدح میں اس طرح نغمہ سرا ہوتا ہے یعنی یہ۔

اے شہنشاہ کو آب سپہ و سہر علم تیرے اکرام کا حق کس سے ادا ہوتا ہے  
اے شہنشاہ گویا تیرے تیری سپاہ ہیں اور میرا علم ہے۔ تو ایسا بڑا بادشاہ ہے تیری  
مہرانیوں کا حق کس شخص سے ادا ہو سکتا ہے۔

سات اقلیم کا حاصل جو فراہم کیجئے تو وہ لشکر کا ترے نعل بہا ہوتا ہے  
فرماتے ہیں۔ اگر ساتوں اقلیموں کا حاصل جمع کر لیا جائے تو وہ تیرے لشکر کا گویا نعل بہا ہے  
ہر مہینہ میں جو یہ بدر سے ہوتا ہے ہلال آستان پر ترے مہ ناصیہ سا ہوتا ہے  
فرماتے ہیں۔ چاند ہر مہینہ جو بدر میں جلنے کے بعد کا ہیدہ ہوتے ہوئے ہلال کی صورت  
پکڑتا ہے۔ یہ تیرے در پر ناصیہ سائی کی وجہ سے ہوتا ہے۔

میں جو گستاخ ہوں آئین غزنو خانی میں یہ بھی تیرا ہی کرم ذوق فزا ہوتا ہے  
فرماتے ہیں۔ میں جو آئین غزنو خانی کو توڑ کر تیرا مدح سرا ہو جاتا ہوں یہ تیرے کرم کی  
وجہ سے ہے یعنی تیرا کرم ذوق مدح سرائی بڑھاتا رہتا ہے۔

رکھو غالب مجھے اس تلخ نوائی سے معاف آج کچھ دردِ مرے دل میں سوا ہوتا ہے  
فرماتے ہیں۔ اے غالب میری نواہائے تلخ کو تیرے مہر اور بے لطف نہ ہو یہ عذر کے  
سبب سے ہے یعنی آج میرے دل میں درد کسی قدر زیادہ ہو گیا ہے اس لئے میری زبان  
سے بے درد و شہر نکل رہے ہیں۔

## غزل

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے تمہیں کہو کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے  
 فرماتے ہیں۔ میری ہر بات کو سن کر آپ یہ ارشاد فرماتے ہیں کہ تیری کیا حقیقت ہے  
 یعنی مجھ کو آپ بہت ہی حقیر و ذلیل سمجھتے ہیں۔ میں آپ ہی سے دریافت کرتا ہوں،  
 آپ یہ تو بتائیے کہ یہ گفتگو کا طریقہ کیا ہے۔

نہ شعلہ میں یہ کرشمہ نہ برقی میں یہ ادا کوئی بتاؤ کہ وہ شوخ تند خو کیا ہے  
 فرماتے ہیں۔ اگر اس کی تند خوئی کی وجہ سے اس کو شعلہ کھوں تو شعلہ میں یہ کرشمہ ناز  
 کہاں ہے اور اگر شوخی کے سبب سے اس کو بجلی قرار دوں تو بجلی میں یہ انداز و ادا  
 کہاں ہے، مجھ میں نہیں آتا کہ وہ شوخ تند خو درحقیقت ہے کیا۔ کوئی اگر بتا سکتا ہے  
 تو مجھے بتائے کہ وہ کیا ہے۔

یہ رشک ہے کہ وہ ہوتا ہے ہم سخنِ حم سے وگر نہ خوفِ بد آموزیِ عدو کیا ہے  
 فرماتے ہیں میں تو اس رشک کی وجہ سے پریشان اور فکر مند رہتا ہوں کہ وہ تم سے ہلکا  
 ہوتا ہے وگر نہ مجھے بد آموزیِ عدو کی کچھ پروا نہیں ہے۔ وہ میری طرف سے تم کو خواہ  
 کتنا ہی بھڑکائے میں اس بات سے نہیں ڈرتا۔

چپک رہا ہے بدن پر لہو سے پیرا ہن ہماری جیب کو اب حاجتِ رفو کیا ہے  
 فرماتے ہیں۔ ہمارے سینے پر لہو کی وجہ سے گریباں چاک ہونے کے بعد چپک کر مل گیا  
 ہے۔ اب اس کو رفو کی ضرورت باقی نہ رہی۔ اس شعر میں یہ خوبی پیدا ہو گئی ہے کہ  
 سو نکلنے کا سبب دیوانگی کی وجہ سے خود میرزا صاحب کو معلوم نہیں ہے اس لئے  
 اس کو بیان نہیں کر سکتے۔ خبر نہیں گریباں چاک کرنے وقت ناخوشی سے سینے پر خواش  
 آئی ہے یا لہو کوں کا کوئی پتھر خواش کا باعث ہو ہے اب خیالی میں خارِ منقلاں  
 جا پڑے ہیں یا خون کے آنسوؤں سے روئے ہیں۔ یہ سب احتمالِ قیعی نہ کرنے سے

زیادہ لطف دے رہے ہیں۔

جلائے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہوگا کریدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے  
 فرماتے ہیں جہاں جسم جلائے وہاں دل بھی جل گیا ہوگا۔ اب جو بیٹھے ہوئے راکھ کُڑی  
 رہے ہو تو تمہیں کیا جستجو ہے۔ کس بات کی تلاش کر رہے ہو۔  
 رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل جب آنکھ ہی سے نہ پکے تو پھر لسو کیا ہے  
 فرماتے ہیں ہم اس کو نہیں سمجھتے جو انسان کی رگوں میں دوڑتا پھرے اور باعثِ  
 حیات سمجھا جائے ہم تو اس کو لسو جانتے ہیں جو کسی پر عاشق ہونے کے بعد آنکھوں  
 سے بہتا ہے وہ لہو ہے۔

وہ چیز جس کے لئے ہم کو ہر بہشت عزیزِ موائے بادہٴ گلخام مُشک بو کیا ہے  
 فرماتے ہیں بہشت میں سب سے بڑی نعمت شراب ہے۔ اور شراب ہی کے لئے ہم بہشت  
 کو عزیز رکھتے ہیں۔

پیوں شراب اگر خم بھی دیکھ لوں چار یہ شیشہٴ قدح و کوزہ و سبو کیا ہے  
 فرماتے ہیں۔ شراب پینے میں اس قدر عالی ظرف واقع ہوا ہوں کہ شیشہٴ قدح و  
 کوزہ اور سبو سے تو نچھ کو سرور ہونا ناممکن ہے۔ ہاں اگر دو چار خُم موجود ہوں تو میں  
 شراب پیوں۔

رہی نہ طاقتِ گفتار اور اگر ہو بھی تو کس اُمید پہ کہے کہ آرزو کیا ہے  
 فرماتے ہیں۔ میں اس ضبط کا انسان تھا کہ آرزو ہی آرزو میں جان دے دی اور کبھی  
 حرفِ آرزو کو لب پر نہ لایا۔ اب تو طاقتِ گفتار ہی باقی نہ رہی۔ مگر جب قوتِ گویائی  
 پر قبضہٴ محال تھا اس وقت بھی نا اُمیدی کے حرفِ شوق کو کبھی زبان تک نہ آنے دیا۔  
 ہوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتر آؤ اگر نہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے  
 فرماتے ہیں۔ بادشاہ کی مصاحبت نے غالب کو چار چاند لگا دیئے ہیں اب اتر آ پھرنا

ہے ورنہ اس سے پہلے شعر میں اس کو کون جانتا تھا۔ کیا خوب مقطع کہا ہے اور کسی موضع غزل لکھی ہے۔

### غزل

میں انھیں چھیڑوں اور کچھ نہ کہیں چل نکلتے جو مئے مئے ہوتے  
فرماتے ہیں۔ میں ان کو چھیڑوں اور وہ اس کے جواب میں تجھ کو بُرا بھلا نہ کہیں یہ  
جڑے تعجب کی بات ہے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس وقت شراب پئے ہوئے نہ تھے  
میں نے سمجھ لیا کہ ان کو چھیڑ رہا ہوں۔

تہر ہو یا لا ہو جو کچھ ہو کاش کہ تم مرے لئے ہوتے  
فرماتے ہیں۔ میں تو تہر و بلا کے لئے مخصوص ہو گیا ہوں اور تم بھی سراپا غنیمت اور سراپا  
شوخی ہو۔ کاش میری قسمت میں تم کو نکھدیا جاتا اور خصوصیت کے ساتھ تم میرے  
ہر جلتے معشوق کی شوخی اور بد مزاجی کی تصویر اپنے شوق و حسرت کے خاکے کے ساتھ  
اس قرن سے کیپٹی ہو کر تعریف نہیں ہو سکتی۔

میری قسمت میں غم گر اتنا تھا دل بھی یارب کئی دیئے ہوتے  
فرماتے ہیں۔ اس کثرت کے اگر میری قسمت میں رنج و غم نکھائی تھا تو یارب دل بھی  
ایک کے برے دس میں غطا فرمادیئے ہوتے۔ ایک دل میں اتنا غم سما نہیں سکتا۔ نہرت  
بیان قابلِ داد ہے۔

ابھی جاتا وہ راہ پر غالب کوئی دن اور بھی جئے ہوتے  
فرماتے ہیں۔ اے غالب وہ رفتہ رفتہ ہمارا کتنا مانیتا، تم جلدی کر کے مر گئے تھیں  
اور کچھ دن زندہ رہ کر اس کی التجا کرتی تھی۔

### غزل

غیر لیں محفل میں بوسے جام کے ہم رہیں یوں تشنہ لب پیغام کے

فرماتے ہیں۔ روزِ محفل منعقد ہوتی ہے۔ روزِ غیروں کے ساتھ چھپرے اٹلائے جاتے ہیں۔ اپنے ہاتھ سے بھر بھر کے جامِ غیروں کو دیئے جلتے ہیں۔ ہم یہ پیامِ طلب سے تشنہ لب یعنی محروم رہتے ہیں، کبھی ہم کو بھول کر بھی بزمِ ناز میں نہیں بلایا جاتا، الفاظ سے مرتجبتی ہے۔ خستگی کا تم سے کیا شکوہ کہ یہ ہتھکنڈے ہیں چرخِ نیلیِ فام کے فرماتے ہیں۔ اپنی تباہی اور بربادی کا گلہ ہم کو تم سے نہیں ہے۔ یہ تو اس منحوس آسمان کے قسم و جور کے دھنک ہیں۔ یہ ظالم رات دن نئے نئے چیلے بدلنے کا شکار ہے۔ خط لکھیں گے گرجہِ مطلب کچھ نہ ہو ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے فرماتے ہیں۔ اگر خط لکھنے کے لئے کوئی نیا مضمون ہاتھ نہ آئے نہ سہی۔ ہم تمہارے نام کے عاشق ہیں۔ تمہارا نام عنوانِ خط پر لکھتے ہیں اور مطلب اگر نہیں ہے تو نہ ہو۔ راتِ پنی زمر زمزم پئے اور صبحِ دم دھوکے دھپتے جامہٴ احرام کے فرماتے ہیں۔ رات کو چاہہ زمرم پر بیٹھ کر شراب پی اور وہ بھی احرام باندھنے کی حالت میں پی کر جب تمام معاصی کا ترک کر دینا لازمی اور ضروری سمجھا جاتا ہے پھر صبح کے وقت جامہٴ احرام کے دھپتے جو شراب کے گرنے سے پڑ گئے تھے دھو کر پاک و صاف ہو گئے۔ اس شعر میں رندی اور شوخی کی تصویر کشی دی ہے۔

دل کو آنکھوں نے پھنسیا کیا مگر یہ بھی حلقے ہیں تمہارے دلم کے فرماتے ہیں۔ ہماری آنکھوں نے کیا ہمارے دل کو پھنسیا مگر ایسا ثابت ہوتا ہے کہ ہماری آنکھیں بھی تمہارے دام کے حلقے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ عشاق کی آنکھیں عشاق کو بٹولائے حُسنِ مشوق کرتی ہیں۔ اس لئے ثابت ہوتا ہے کہ آنکھیں عشاق کی حلقہٴ دامِ مشوق ہیں۔ شاہ کی ہے غسلِ صحت کی خبر دیکھئے کب دن پھریں حمام کے فرماتے ہیں۔ بادشاہ کے غسلِ صحت کی خبر گرم ہو رہی ہے۔ دیکھئے کب حمام کی قسمت جاگتی ہے۔

عشق نے غالب نکما کر دیا ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے  
صاف اور سیدھا شعر ہے اور پھر لطف سے خالی نہیں۔

### غزل

پھر اس انداز سے بہار آئی کہ ہوئے مہر و مہ تماشا ئی  
فرماتے ہیں۔ پھر دوبارہ موکم بہار اس خوش ادائی کے ساتھ آیا ہے کہ مہر و مہ اس کے  
تماشا ئی بن گئے ہیں۔

### قطب

دیکھ اے ساکنان خطہ خاک اس کو کہتے ہیں عالم آرائی  
فرماتے ہیں۔ اس خطہ خاک کے رہنے والو یہ تماشا دیکھو، تمام عالم کا آراستہ کر دینا اس کو  
کہتے ہیں۔

کہ زمیں ہو گئی ہے سرتاسر روکش سطح چرخ مینائی  
یعنی زمین پر اس کثرت سے سبزہ دگل پیدا ہو گئے ہیں کہ زمین سطح چرخ مینا رنگ کی  
و مقابل بن گئی ہے۔

سبزہ کو جب کہیں جگہ نہ ملی بن گیا روئے آب پر کائی  
فرماتے ہیں۔ سبزہ نے کثرت سے پیدا ہو کر جب ساری زمین کو گھیر لیا اور اب کیس کی  
روئیدگی کے لئے زمین پر جگہ باقی نہ رہی تو نمبوری سے پانی کے اوپر کائی کی شکل میں  
ظاہر ہونا شروع ہو گیا۔

سبزہ دگل کو دیکھنے کے لئے چشم زگس کو دی ہے مینائی  
فرماتے ہیں۔ چشم زگس کو رکھی جاتی تھی گر اب اس کو باغبانِ عالم نے جینائی عطا فرمائی  
ہے تاکہ وہ سبزہ دگل کی کثرت کا تماشا دیکھے۔

ہے ہوا میں شراب کی تاثیر بادہ نوشی ہے بادِ پیائی



یہ ضرور۔ ار کی تعریف میں ہے اس میں بادہ پیمائی کے لفظ نے دو معنی پیدا کر دیئے ہیں۔ بادہ پیمائی عبت کام کرنے کو کہتے ہیں۔ پس ایک معنی تو اس کے یہ ہیں کہ فصل بہار کی کی ہوا ایسی نشاط انگیز ہے گویا اس میں شراب کی تاثیر پیدا ہوئی ہے۔ اور جب کہ یہ حال ہے تو بادہ نوشی محض باد پیمائی یعنی حصول کام ہے۔ اس صورت میں بادہ نوشی مبتدا ہو چکا اور باد پیمائی کو مبتدا اور بادہ نوشی کو خبر قرار دیا جائے اور جس طرح بادہ پیمائی کے معنی بادہ خوار کے ہیں اسی طرح بادہ پیمائی کے معنی ہوا کھانے کے لئے جائیں۔ اس صورت میں یہ مطلب نکلے گا کہ آج کل ہوا کھاتی بھی شراب پیتی ہے (از یادگار غالب)

کیوں نہ دُنیا کو ہو خوشی غالب شاہ دیندار نے شفا پائی  
فرماتے ہیں۔ اے غالب دنیا یعنی سارے زمانے کو خوشی کیونکر حاصل نہ ہو، دیندار بادشاہ نے مرض سے شفا پائی ہے۔

### عزل

تفائل دو ہوں میرا دل غمِ عجزِ عالی ہے اگر پہلوتھی کیجئے تو جا میری بھی خالی ہے  
فرماتے ہیں۔ میں تفائل پسند آدمی ہوں میری ہیئت میں عجز و انکسار کا مادہ اس قدر زیادہ پیدا کیا گیا ہے کہ اپنے حق میں بے التفاتی اور بے رحمی کو بہ نسبت التفات و توجہ کے زیادہ پسند کرتا ہوں مجھ سے پہلوتھی کرنا گویا میرے واسطے ہلو میں جگہ خالی کرنی ہے میں اغماض کو اکرام سمجھتا ہوں۔

رہا آبادِ عالم اہلِ ہمت کے نہ ہونے سے بھڑے ہیں جس قلمِ مجام و سیو سیخانہ خالی ہے  
برخیال شاید کسی اور کے دل میں بھی گزرا ہو مگر تمثیل نے اس کو بالکل ایک اچھوتا مضمون بنا دیا ہے اور شعر کو نہایت بلند کر دیا ہے۔ کہتے ہیں کہ دُنیا میں اگر اہلِ ہمت کا وجود ہوتا جو دُنیا کو محض ناچیز سمجھ کر اس کی طرف التفات نہ کرتے تو دُنیا ویران ہو جاتی پس یہ جاننا چاہئے کہ عالم اسی سبب سے آباد نظر آتا ہے کہ اہلِ ہمت مفقود ہیں یعنی جس طرح میخانہ میں

جام و سبک کا شراب سے بھرا رہنا اس بات کی دلیل ہے کہ سینا انہیں کوئی سنجوار نہیں ہے اسی طرح عالم کا آباد و مہمور ہونا دلالت کرتا ہے کہ اس میں اہل ہمت محدود ہیں (اور زیادہ کا غالب)

### غزل

کب وہ سُنتا ہے کہانی میری اور پھر وہ بھی زبانی میری

فرماتے ہیں۔ پہلی دشواری اور مصیبت تو یہی ہے کہ وہ میری کہانی یعنی میری مصیبت کا حال سُنتا ہی نہیں اور پھر اس کے ساتھ دشواری پر دشواری اور مصیبت پر مصیبت یہ ہے کہ میری زبانی کب سُنتا ہے الفاظ کی نشست بندش کی بُستی۔ بیان کی خوش سلوکی خیال کی بلندی یہ ساری باتیں اس مطلع میں با حسن الوجہ واقع ہوئی ہیں تعریف سے مستثنیٰ ہے۔

غلش غمزہ خیزِ زہ نہ پوچھے دیکھ خوننا بہ نشانی میری

فرماتے ہیں۔ غمزہ خیزِ زہ کی کادشوں کا حال مجھ سے کیا پوچھتا ہے۔ میں کب اس کی غلشوں کو بیان کر سکتا ہوں۔ دل میں زخم کھبہ میں ناسور ڈال دیئے ہیں۔ یہ دیکھ لے سو کے آنسوؤں سے رو رہا ہوں۔

کیا بیاں کر کے مرا روئیں گے یار مگر آشفۃ بیانی میری

فرماتے ہیں۔ مجھ میں کیا وصف ہے کہ جس کو بیان کر کے میرے دوست میرے مرجانے کے بعد روئیں گے مگر میری آشفۃ بیانی ہے۔ شاید اسی کو یاد کر کے روئیں آشفۃ بیانی انکسار کی وجہ سے یہاں کہی گئی ہے۔ حق یہ ہے کہ میرزا صاحب کے بیان کی شوخیاں ایسی اچھوتی اور نرالی ہوتی ہیں کہ کسی شاعر کا بیان ان کے بیان کی خصوصیت کو نہیں پہنچ سکتا۔

ہوں زخود رفتہ بیدارے خیال بھول جانا ہے نشانی میری

بیدا۔ بالفتح بمعنی بیا بیاں و دشت فرماتے ہیں۔ صحرا کے خیال کا ازخود رفتہ ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ دوستوں کے خیال سے نکل جاتا ہوں اور احباب کا مجھے بھول جانا ہی میری نشانی ہے۔

مقابل سے مقابل میرا رُک گیا دیکھ روانی میری

میرزا صاحب نے اس شوقی شرح عود ہندی میں تحریر کی ہے۔ فرماتے ہیں تقابل و  
تضاد کہ کون نہ جانے لگے۔ نور و ظلمت۔ شادی و غم۔ راحت و رنج، وجود و عدم مفقود متقابل  
اس مصرعہ میں بمعنی مرجع ہیں جیسے حریف بمعنی دوست بھی مستعمل ہے۔ مفہوم ختم ہے  
کہ ہم اور دوست از روئے غوغا عادات ضد ہمدگر ہیں وہ میری روانی دیکھ کر رگ گیا۔

قدر سنگ سر رہ رکھتا ہوں سخت ارزاں ہے گرانی میری  
گرانی کے معنی بھاری پن کے بھی ہیں اور بیش قیمت ہونے کے بھی۔ کہتا ہے کہ میری قدر  
اس پتھر کی سی ہے جو راہ کے سرے پر پڑا ہو اور ہر شخص آتے جاتے اس پر پاؤں رکھ کر  
گزرے یعنی ہوں تو گراں قدر مگر اس پتھر کی طرح بے قدر ہوں پس میری گرانی کس قدر  
ارزاں ہے (از یادگار غائب)

گرد بادِ رہ بیتابی ہوں صرصر شوق ہے بانی میری  
فرماتے ہیں۔ میں بگولے کی طرح سے بیقرار ہوں اور رہ گئے بیتابی کا گرد باد ہوں میری  
بیتابیوں کی بانی مبانی صرصر شوق ہے۔

دہن اُس کا جو نہ معلوم ہوا کھل گئی بچپن دانی میری  
فرماتے ہیں اس کا دہن بچ ہے اس لئے مجھ پر ظاہر نہ ہوا اور میں اس کو نہیں جانتا اور  
جو شخص اس کے دہن کو نہ جانے وہ بچہ ہاں ہے۔ پس میری بچہ دانی سب پر ظاہر ہو گئی۔  
کر دیا ضعف نے عاجز غائب تنگ پیری ہے جوانی میری  
فرماتے ہیں۔ اسے غائب میں جوانی میں اس درجہ جو ضعیف و ناتواں ہو گیا ہوں کہ بڑے  
بھی اتنے کمزور اور نحیف نہیں ہوتے۔ میری جوانی تنگ پیری ہے۔

### غزل

نقشِ نازِ بتِ طناز بہ آغوشِ رقیب اے طاؤس پے مخامر مافی مانگے  
فرماتے ہیں۔ آغوشِ رقیب میں اُس بتِ طناز کی تصویر اس قدر بننا اور بے جوڑ معلوم ہوتی

ہے کہ اس کے کھینچنے کے لئے بجائے مرقلم پائے گاؤس دست مانی میں چاہئے۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح طاؤس کے پروبال اور اعضائے جسم حسین و خوبصورت مایہ نغز و ناز واقع ہوئے ہیں اسی طرح اس کے پاؤں بد رنگ اور بد صورت اُس کے حُسن و جمال کے لئے موجب تنگ و عار پیدا ہوئے ہیں اسی طرح رقیب سے ہم آغوشی کی حالت میں اس کی ناز کرنے والی تصویر کی کیفیت ہے۔

تو وہ بد خو کہ تحیر کو تماشا جانے غم وہ افسانہ کہ آشفہ بیانی مانگے  
 فرماتے ہیں۔ تحیر میں خاموشی کا ہونا لازمی اور ضروری ہے اور تو ایسا بد خو ہے کہ میری حیرت اور میری خاموشی کو تماشا سمجھتا ہے اور غم وہ افسانہ ہے کہ اس کے لئے آشفہ بیانی اور پریشان گوئی درکار ہے۔ اگر میں حیرت و خاموشی کو دور کر کے فہم دل زبانی پر لاتا ہوں تو تو بے لطف دیے مزہ ہوتا ہے۔

وہ تپ عشق تمنا ہے کہ بھر صورت شمع شعلہ تانض جگر ریشہ دوانی مانگے  
 فرماتے ہیں۔ مجھ کو ایسی تپ عشق کی تمنا اور آرزو ہے کہ جس کا شعلہ ضمع کی طبع جگر تک دوڑ جائے والا ہو۔

قطع  
 لگاشن کو تری صحبت از بسکہ خوش آئی ہے ہر غنچہ کا گل ہونا آغوش کشائی ہے  
 فرماتے ہیں۔ باغ کو تیری صحبت سے سرور و فیضیاب ہونا اس قدر پسند آیا ہے کہ ہر غنچہ گل کا کھلنا تیرے شوق میں آغوش کشائی ہے یعنی تجھ سے ہلگیر ہونے کا تمنا ہے۔

واں کنگرہ استغنا ہر دم ہے بلندی پر یاں نالہ کو اور اُٹھا دعویٰ رسائی ہے  
 فرماتے ہیں۔ اسی کنگرہ استغنا دل دونا رات چو گنا بختہ ہوتا چلا جاتا ہے اور ہمارا نالہ دل بربست ہوتا جاتا ہے یعنی اب وہ دل سے چل کر بک بھی نہیں آتا۔ سینہ ہی میں بہت بار کر رہ جاتا ہے۔

از بسکہ سکھا تا ہے غم ضبط کے انداز جو داغ نظر آیا اک چشم نمائی ہے  
 فراتے ہیں۔ غم عشق مجھ کو ضبط کی تعلیم کر رہا ہے۔ دل میں جو نیا داغ چھنک رہا ہے وہ اس  
 استاد یعنی غم عشق کی چشم نمائی کا کام دیتا ہے۔

### عَنْزَل

جس زخم کی ہو سکتی ہو تدبیر رفو کی لکھ دیکھو یارب اسے قسمت میں عدو کی  
 فرماتے ہیں کہ ایسا زخم جس میں ٹپکے دیئے جاسکیں اور جس کے مند مل ہونے کی امید کی  
 جاسکے وہ مجھ کو درد کار نہیں ہے۔ دشمن کی قسمت میں اس زخم کو لکھ دینا میں تو ایسے زخم  
 کا خواہش مند ہوں کہ جسے دیکھ کر چارہ گر بھی علاج سے دست بردار ہو جائے۔

اتجھا ہے سر انگشت حنائی کا تصور دل میں نظر آتی تو ہے اک بوند لہو کی  
 لفظ تو نے جو دوسرے مصرع میں ہے یہ معنی پیدا کر دیئے ہیں کہ آنکھ سے لہو روتے روتے  
 دل میں خون کا ایک قطرہ باقی نہیں، اس لئے دوست کے سر انگشت حنائی کے تصور کو  
 غنیمت سمجھتا ہے کہ اس کی وجہ سے دل میں لہو کی ایک بوند تو نظر آتی ہے (از یادگار غائب)  
 کیوں ڈرتے ہو عشاق کی بے حوصلگی سے یاں تو کوئی سُستا نہیں فریاد کسو کی  
 بے حوصلگی یعنی کم ظرفی۔ یاں سے مراد دینا۔ معشوق سے کتاب ہے کہ تو اس بات سے کیوں  
 ڈرتا ہے کہ ہم عاشق لوگ تیرے ظلم و جور سے تنگ آکر حاکم سے یا خدا سے تیری فریاد  
 کریں گے کس لئے کہ اگر ہم ایسا کریں گے تو کوئی کسی کی فریاد ہی نہیں سُستا (از یادگار غائب)  
 دشت نے کبھی مُنہ نہ لگایا ہو جگر کو خنجر نے کبھی بات نہ پوچھی ہو گلو کی  
 فراتے ہیں۔ پتھری نے کبھی جگر کو مُنہ نہ لگایا ہو یعنی اس پر التفات نہ کیا ہو اور خنجر نے  
 کبھی گلو کی بات بھی نہ پوچھی ہو یعنی توجہ نہ کی ہو۔ دشت و خنجر سے ناز و انداز و ظلم و  
 بیداد معشوق مراد ہے۔

صد حیف وہ ناکام کہ اک عمر سے غائب حسرت میں ہے ایک بُتِ عربہ جو کی

فرماتے ہیں۔ اے غائب اس ناکام تمنا کی حالت قابلِ افسوس ہے کہ جو برسوں سے ایک بُتِ عربہ جو کی تمنا میں زندگی بسر کر رہا ہو۔

قطع

سیما ب پشت گرمی آئینہ دے کہ ہم حیراں کئے ہوئے ہیں دلِ بیقرار کے پشت گرمی۔ بمعنی پشتیبی و اعانت۔ فرماتے ہیں۔ جس طرح سیما یعنی پارے کی قطعی سے آئینہ روشن ہو کر صورت حیرت پیدا کر لیتا ہے اسی طرح ہم کو دلِ بیتاب نے سوپا حیرت بنا رکھا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح آئینہ پارے کی قطعی سے عکس پذیر ہونے کی قابلیت پیدا کر لیتا ہے اسی طرح عشاق دلِ بیتاب کے ذریعہ سے معشوق کے جلوہ سے فیضیاب ہونے کی قدرت حاصل کر لیتے ہیں۔

آغوشِ گلِ کشودہ برائے و داغ ہے اے عندلیبِ چل کہ چلے دنِ بہار کے فرماتے ہیں۔ پھول کا کھلنا گلے ملنے کے لئے ہاتھ کو پھیلانا ہے۔ اے بلبلِ جلد اگر معانقہ کریں بہار کے دلی صبحِ شام ہی میں جانے والے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ عیش و راحت کا زمانہ دنیا میں بہت ہی قلیل ہے جس طرح بہار اُدھر آتی ہے اُدھر رخصت ہو جاتی ہے۔

قطع

ہے وصلِ ہجرِ عالمِ تمکین و ضبط میں معشوقِ شوخ و عاشقِ دیوانہ چاہئے فرماتے ہیں۔ اگر معشوق کے مزاج میں خود داری اور تمکنت ہے اور عاشق کی طبیعت میں صبر و ضبط کا مادہ ہے تو عینِ وصل میں بھی فراق کی طرح بے لطفی نصیب ہوگی۔ مزاج میں یہ ہے کہ معشوقِ شوخ و میباک اور عاشقِ دیوانہ و گستاخ کو وصل میں کایا ہی کے ساتھ لطفِ زندگی حاصل کر سکے۔

اس لبِ تل ہی جائیگا بوسہ بھی تو ہاں شوقِ فضول و جراتِ زندانہ چاہئے فرماتے ہیں۔ کبھی تو اس کے ہون کا بوسہ مل ہی جائے گا۔ ہاں اس کے واسطے شوقِ حد

سے بڑھا ہوا اور جرأتِ زندانہ دکا رہے۔

### غزل

چاہئے اچھوں کو جتنا چاہئے یہ اگر چاہیں تو پھر کیا چاہئے  
فرماتے ہیں۔ اگر دنیا میں کسی سے محبت ہو تو وہ مہینوں سے ہو۔ اور اگر یہ لوگ خود بھی  
کسی کو چاہیں تو پھر کسی اور نعمت کی ضرورت ہی باقی نہیں ہے۔

صحبتِ زنداں سے واجبِ حذر جائے نئے اپنے کو کھینچنا چاہئے  
فرماتے ہیں۔ زندوں کی صحبت سے حذر واجب اور لازم ہے بجائے خراب کھینچنے کے  
شراب سے اپنے کو کھینچنا چاہئے یعنی زندوں کی صحبت سے پرہیز کرنا چاہئے اور  
سے پینے سے احتراز لازم ہے۔

چاہئے کو تیرے کیا سمجھا تھا دل بائے اب اس کے بھی سمجھا چاہئے  
فرماتے ہیں۔ تیرے چاہئے کو دل نے کیا سمجھا تھا، یعنی کھیل سمجھا تھا۔ سل سمجھا تھا۔ کیا  
سمجھا تھا۔ اب اس نابکار دل سے ذرا حجب کو اس چاہست کا بدلہ لینا چاہئے۔ مطلب یہ  
ہے کہ ضبطِ عشق اور صدمہٴ فراق کی تاب و طاقت نہ تھی تو کیا سمجھ کر عشق کیا تھا۔

چاکِ مت کہ جیب بے ایام گل کچھ اُدھر کا بھی اشارہ چاہئے  
پھول کے کھلنے کو چاکِ گریباں سے عموماً تشبیہ دی جاتی ہے۔ کہتا ہے کہ ہر ایک کام  
بہتر کی ہدایت سے کرنا چاہئے۔ پس جب تک پھول اپنا گریباں چاک نہ کرے تو بھی  
گریباں چاکِ مت کر۔ اس میں لطف یہ ہے کہ مجنوں کو ہمیشہ ہمارے جوشِ جنوں  
زیادہ ہوتا ہے۔ (از یادگار غالب)

دوستی کا پردہ ہے بیگانگی مُنہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہئے  
فرماتے ہیں۔ تم جو ہم سے بیگانہ وار پردہ کرتے ہو اور مُنہ چھپالیتے ہو اس پردہ  
میں نگاہِ جھلک دکھاتی ہے اور دیکھنے والوں کو خشمِ پیدا ہوتا ہے۔ لہذا ہم سے

منہ چھپانا چھوڑ دینا چاہئے۔ میرزا صاحب اس چال سے اپنا مطلب چھل کرنا چاہتے ہیں۔ دشمنی نے میری کھویا غیر کو کس قدر دشمن سے دیکھا چاہئے فرماتے ہیں۔ میری دشمنی میں غیر نے اپنے کو مٹا دیا۔ یہ بات دیکھنے کے قابل ہے مگر وہ میرا کس درجہ دشمن ہے۔

اپنی رسوائی میں کیا چلتی ہے سہی یا رہی ہنگامہ آرا چاہئے فرماتے ہیں۔ ہم اپنی سہی کو شش سے اپنے کو رسوا بھی نہیں کر سکتے ہماری بدنامی بھی اسی کی ہنگامہ آرائی پر منحصر ہے یعنی وہ جس کو چاہے ذرا سی اپنی جھلک دکھا کر مضطرب و متباب بنا دے اور یہ اضطراب و متبابی و بدنامی و رسوائی کا باعث بن جائے۔ منحصر مرنے یہ ہو جس کی اُمید نا اُمیدی اُسکی دیکھا چاہئے فرماتے ہیں۔ جس شخص کی اُمید کا حصر مرنے پر ہو اس کو دیکھنا چاہئے کہ وہ کس درجہ کس حد تک نا اُمید ہو چکا ہے۔ وہ بالکل نیا اور اچھوتا مضمون ہے اور اس خوبی کے ساتھ نظم کیا ہے کہ توصیف سے مستغنی ہے۔

غافل ان مدہ طلبتوں کی واسطے چاہنے والا بھی اچھا چاہئے فرماتے ہیں۔ اے غافل ان مدہ جبینوں کے لئے چاہنے والا بھی خوبصورت اور وضدار ہونا چاہئے۔

چاہتے ہیں خور و یوں کو اسد آپ کی صورت تو دیکھا چاہئے فرماتے ہیں۔ اور تماشہ دیکھے۔ حضرت اسد بھی حسینوں کی چاہت کا دعویٰ کرتے ہیں ذرا آپ کی صورت تو ملاحظہ فرمائیے یعنی ایسی بھونڈی صورت پر کوئی خوشرو مشوق کب انتہا کرتا ہے۔

### غزل

ہر قدم دور کی منزل ہونامیاں مجھ سے میری رفتار سے بھلے ہی سیاہاں مجھ سے



فرماتے ہیں میں جس قدر دکھ بڑھا جاتا ہوں اتنی ہی منزل مجھ سے دور ہوتی جاتی ہے معلوم ہوتا ہے جس چال سے بیاہاں طے کر رہا ہوں اسی چال سے بیاہاں بھی میرے آگے بھاگا جاتا ہے۔

دیں عنوان حماشا بتغافل خوش تر ہے نگہ رشتہ شیرازہ خراگاہ مجھ سے فرماتے ہیں۔ دُنیا کے تماشے سے عبرت کا سبق حاصل کرنا بھی تغافل کے ساتھ بہتر ہے۔ یعنی اچلتی ہوئی نگاہ سے آفتاز تماشہ کو دیکھ لینا نتیجہ نکال لینے کے لئے کافی ہے اس لئے میری نگاہ شیرازہ خراگاہ کا رشتہ بن گئی ہے۔ مطلب یہ ہے میں ایسا تغافل پسند ہوں کہ میری نگاہ بھی آنکھ کے پردہ سے باہر نہیں نکلتی اور دُنیا کی زیر نگینوں سے سبق حاصل نہیں کرتی۔ وحشتِ آتشِ دل سے شبِ تنہائی میں صورتِ دو درہا سایہ گریزاں مجھ سے فرماتے ہیں فراق کی راتوں میں میرا سایہ میری آتشِ دل سے دم کر کے اس طرح بھاگ جاتا تھا جس طرح آگ سے دھواں بھاگتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ شبِ تنہائی میں میرا سایہ بھی میرا ساتھ نہ دیتا تھا وہ بھی مجھ کو تنہا چھوڑ جاتا تھا۔

علمِ عشاق نہ ہو سادگی آموزِ بستان کس قدر خانہ آئینہ ہے ویراں مجھ سے فرماتے ہیں خدا ایسا نہ کرے کہ عاشقوں کا غمِ خوہر و مشوقوں کو سادگی کی تعلیم دے اور یہ لوگ ان کے سوگ میں زینت و آرائش ترک کر دیں۔ ایک میرے ہی مرجانے سے کس قدر خانہ آئینہ ویراں ہو گیا ہے اب اس میں عکس کا جلوہ نظری نہیں آتا۔ یعنی میرے ماتم میں مشوقوں نے آئینہ دیکھنا اور بناؤ سنگھار کرنا بالکل ترک کر دیا ہے۔

اثرِ آبلہ سے جادہ صحرائے کمنوں صورتِ رشتہ گوہر ہے چراغاں مجھ سے فرماتے ہیں صحرانوردی میں میرے پاؤں کے چھلے پھوٹ گئے ہیں۔ خونِ ان سے جادہ صحرائے کمنوں پر ٹپکا ہے۔ وہ جادہ رشتہ گوہر کی طرح چراغاں بن گیا ہے۔

نیچوڑی بسترِ تمہید فراغت ہو جو پُر ہے سایہ کی طرح برا بھلاں مجھ سے

فرماتے ہیں۔ خدا ایسا کرے کہ میری بخود ہی بستر تمید فراغت ہو جائے۔ سایہ کی طرح میرا  
خشتاں مجھ سے بھرا ہوا ہے۔ مطلب اس شعر کا یہ ہے کہ بخود ہی کے عالم میں راحت و  
آرام سے میں اپنے گھر میں اپنے بستر پر پڑا رہوں کہیں خدا ایسا کرے۔

شوق دیدار میں گر تو مجھے گردن مارے ہو نگہ مثل گل شمع پریشاں مجھ سے  
فرماتے ہیں۔ تو اگر شوق دیدار کی حالت میں میرا سر کاٹ بھی ڈالے تو میری نگاہیں اس طرح  
نکل کر چاروں طرف تیری جستجو میں پھیل جائیں گی جس طرح شمع کا گل کتر دینے کے بعد اس کا  
شعلہ زیادہ روشن ہو کر روشنی کو بڑھا دیتا ہے۔

بیکسی ہائے شب بھر کی وحشت ہے سایہ خورشید قیامت میں ہر پنہاں مجھ سے  
فرماتے ہیں شب غم کی آواسی اور بیکسی سے میرا سایہ مجھ سے وحشت کر کے ایسا بھاگا اور  
اس قدر ڈر کر آفتاب قیامت میں جا کر چھپ گیا۔ باوجودیکہ آفتاب سے سایہ بھاگ جاتا  
ہے لیکن میرا سایہ مجھ سے ایسا گریزاں ہوا کہ آفتاب حشر میں جا کر پنہاں ہو گیا۔

گردش ساغر صہ جلوہ رنگیں تجھے سے آئینہ داری یک دیدہ حیراں تجھ سے  
فرماتے ہیں۔ تیرا جلوہ رنگیں اس بزم میں ساغر شراب کی گردش کا کام دے رہا ہے یعنی  
وہ بھی شراب شہد کی طرح ہوش رُبا ثابت ہوا ہے اور میرا دیدہ حیران آئینہ داری کا  
نمونہ دکھا رہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تیرے حسن سے لوگ مدہوش ہو رہے ہیں اور میرے عشق  
کو دیکھ کر انسان حیرت میں مبتلا ہے۔

نگہ گرم سے اک آگ نیکستی ہے آسہ ہے چراغاں خس خاشاک گلستاں مجھ سے  
فرماتے ہیں۔ اسے آسہ میں جو فراق یا ر میں باغ کی سیر کو لگایا ہوں تو میرے جسم میں آگ لگ گئی  
ہے اور پھولوں کو دیکھ کر میری آنکھوں سے ایسے شعلے نکلے ہیں کہ جن سے جل کر خس خاشاک  
گلستاں چراغاں بن گئے۔

## غزل

نکتہ چیں، غم دل اس کو سُنائے نہ بنے کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے  
 فرماتے ہیں وہ شمع نکتہ چیں ہے۔ بن نہیں پڑتی کہ غم دل اس کو سُنایا جائے یعنی وہ  
 ایک ایک لفظ کی گرفت کرے گا اور پھر اعتراض جڑے گا۔ بات کیا بنے جہاں بات بنائے نہ بنے۔  
 بات بنانی جھوٹ بولنا۔ مطلب یہ ہے کہ اس کی نکتہ چینی کی وجہ سے ہمارا جھوٹ اس پر  
 ظاہر ہو جائے گا، اور بات بگڑ جائے گی۔

میں بلاتا تو ہوں اس کو گمراہ جذبہ دل اُس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے  
 فرماتے ہیں۔ میں اس کو بلاتا تو ہوں لیکن یہ اُمید نہیں ہے کہ میرے بلانے سے چلا آئے گا  
 اسے جذبہ دل تو اگر کچھ مرد کے اور ایسی کشش اس پر ڈالے کہ بغیر آئے اس کو بن نہ  
 پڑے تو وہ آسکتا ہے۔

کھیل سجھا ہو کہیں چھوڑ نہ دے بھول نہ جائے کاش یوں بھی ہو کہ بن میرے ستائے نہ بنے۔  
 فرماتے ہیں۔ وہ ستم و جور کو بھی کھیل سمجھ کر برتا ہے۔ اس سے مجھ کو یہ خوف ہے کہ وہ ظلم کو  
 چھوڑ نہ دے بھول نہ جائے کاش ایسا ہی ہو کہ بغیر میرے ستائے اس کو چھین نہ آئے اور  
 ہر روز پابندی کے ساتھ ستاتا رہے۔

غیر پھرتا ہے لئے یوں ترے خط کو کہ اگر کوئی پوچھے کہ یہ کیلے تو چھپائے نہ بنے  
 فرماتے ہیں۔ میرا رقیب اس طرح میرے خط کو ہر جگہ لئے پھرتا ہے کہ اگر کوئی اس سے پوچھے  
 کہ یہ کیا چیز تیرے ہاتھ میں ہے تو وہ اس کو چھپا بھی نہیں سکتا۔ مطلب یہ ہے کہ رقیب  
 ایک نہ ایک دلی تجھ کو رُوا کر کے رہے گا۔

اس نزاکت کا بُرا ہو وہ بھلے ہیں تو کیا بات آئیں تو انھیں بات لگائے نہ بنے  
 فرماتے ہیں۔ ان کو کمال نازکی نے اس قابل نہیں رکھا کہ اگر وہ کسی مشتاق کے ہتھے  
 پڑھ جائیں تو کوئی مشتاق وصل کا سیلابی طغیانی نہ کرے۔

کہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے پردہ چھوڑا دہ اس نے کہ اٹھائے نہ بنے  
 فرماتے ہیں۔ یہ کون بنا سکتا ہے کہ یہ کس کی جلوہ گری ہے۔ عالم امکان کو اس نے پیدا کر کے  
 ایسا پردہ ڈال دیا ہے کہ یہ پردہ کسی کے اٹھانے سے اٹھ ہی نہیں سکتا۔  
 موت کی راہ نہ دیکھوں کہ بن آئے نہ رہے تم کو چاہوں کہ نہ آؤ تو بلائے نہ بنے  
 فرماتے ہیں۔ موت کی یہ کون راہ دیکھوں اس کا آنا تو لازمی ہے۔ وہ غیر انتظار کے بھی  
 اپنے وقت میں پر آ کر رہے گی۔ تم کو چاہوں کہ اگر تم نہ آؤ تو تمہارا بلانا بھی ممکن نہیں ہے۔  
 مطلب یہ ہے کہ تمہارا بلانا موت کے آنے سے دشوار تر ہے۔

بوجہ وہ سر سے گرا ہے کہ اٹھائے نہ اٹھے کام وہ آئی پڑا ہے کہ بنائے نہ بنے  
 دونوں مصرعوں میں اپنی مشکلات کا بیان کیا ہے۔ خصوصاً اور سیدھا ہے اور نہایت تلخ۔  
 عشق بربزور نہیں ہے یہ وہ آتش غائب کہ ٹکائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے  
 فرماتے ہیں۔ عشق پر کسی کا قابو نہیں چل سکتا۔ اسے غائب یہ وہ آگ ہے کہ نہ ارادہ کے ساتھ  
 لگائی جاسکتی ہے۔ مگر ہم یہ چاہیں کہ معشوق کے دل میں بھی اس عشق کی آگ کو بھڑکا دیں  
 تو یہ بھی ممکن نہیں۔ اور اگر یہ چاہیں کہ اپنی لگی کو بجھا دیں تو یہ بھی بن نہیں پڑتا۔

### غزل

چاک کی خواہش اگر وحشتِ ایرانی کسے صبح کی مانند زخمِ دل گریہاتی کرے  
 فرماتے ہیں۔ اگر وحشتِ دلِ ایرانی کی حالت میں گریہاں چاک کرنے کی خواہش کرے تو یقین  
 کامل ہے کہ صبح کی طرح میرا زخمِ دل بھی گریہاں بن کر چاک ہو جائے۔  
 جلوہ کا تیرے وہ عالم ہے کہ گریجے خیال دیدہ دل کو زیارت گاہ حیرانی کرے  
 فرماتے ہیں۔ تیرے جلوہ کا وہ عالم ہے کہ اس کا خیال بھی آجائے تو دیدہ دل کو حیرانی پیدا  
 ہو جائے۔ اسی مقام کی بابت حضرت شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں کہ  
 پہ شہانِ شہم دریں سیر گم کہ حیرت گرفت آستینم کہ تم

ہے شکست سے بھی دل نوید یارب کب تک آگینہ کوہ پر عرض گراں جانی کرے  
 فرماتے ہیں۔ ہم کب تک بیٹھے ہوئے اس آرزو میں خیالی پاؤں پکایا کریں کہ ہمارا مشوق سنگدل  
 ایک نہ ایک دن ضرور ہمارے شیشہ دل کو سنگ جفا سے توڑے گا۔ ہمیں اس سے  
 بھی ناامیدی ہے کہ وہ ہماری دل شکنی پر متوجہ ہوگا۔

میکدہ گر چشم مست ناز سے پائے شکست مودے شیشہ دیدہ ساغر کی شرکائی کرے  
 فرماتے ہیں۔ اگر میکدہ کو اس کی چشم مست ناز توڑ بھی ڈالے تو شیشہ شراب میں جو بال پڑ  
 جائیں وہ دیدہ ساغر کے واسطے پلکیں بن جائیں اور ساغر شراب اس آنکھ سے اس  
 چشم مست شراب ناز کو دیکھ کر حیران ہو جائے۔

خطِ عارض سے کھنچا زلف کو الفتِ محمد یک قلم منظور ہے جو کچھ پریشانی کرے  
 فرماتے ہیں خطِ عارض جو اس کے بخساروں پر ظاہر ہوا ہے یہ دراصل خطِ عارض نہیں ہے  
 ہے بلکہ میری محبت نے اس کی زلفوں کو یہ عہد نامہ لکھ دیا ہے کہ جو کچھ میرے بارے میں  
 پریشانی کو کرنا ہو کرے۔ سرتاسر مجھے منتظر ہے۔

### غزل

وہ آکے خواب میں تسکین اضطراب تو دے دے مجھے تپشِ دل بجال خواب تو دے  
 فرماتے ہیں۔ یہ تو ممکن ہے کہ وہ خواب میں اگر تسکین اضطراب دے جائے لیکن یہ ممکن  
 نہیں ہے کہ میری تپشِ دل مجھ کو سونے کی اجازت دیدے۔ یہ ظالم یعنی میری تپشِ دل  
 اس شکر سے زیادہ ظلم ڈھانے والی ہے۔

کرے بے قتل لگاؤ میں تیرا رو دینا تیری طرح کوئی تیغ نگہ کو آب تو دے  
 فرماتے ہیں۔ لگاؤ سے تیرا رو دینا قتل کر دیتا ہے۔ تیری آنکھوں کے آنسو شمشیرِ نظر ہیں  
 وہ آبداری پیدا کر دیتے ہیں کہ میں تو ان کو دیکھتے ہی قتل ہو جاتا ہوں (لفظِ تو) سنے ہاں یہ  
 سنی پیدا کر دیئے ہیں کہ تیری طرح دوسرے مشوقانِ شکر تیغِ نگاہ کو اس طرح کی آبداری دینی

جانتے ہی نہیں۔

دیکھو اسے جنبش لب ہی تمام کر ہم کو نہ دے جو بوسہ تو منہ سے کہیں جواب دے  
فرماتے ہیں۔ جنبش لب ہی سے تلوار کا کام لے اور ہم کو قتل کر دے۔ ہم طالب بوسہ ہیں۔ اگر  
بوسہ دینا منظور نہیں ہے تو صاف جواب دیدے یعنی بوسہ دینے سے انکار کر دے ہم قتل  
ہو جائیں گے۔

پلا دے اوکے ساتی جو ہم سے نفرت ہے پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے  
فرماتے ہیں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ ہم سماں میں اگر تجھ کو یہ خیال ہے کہ میرا پیالہ کس ہو جائیگا  
تو نہ دے۔ ہم شراب کے طالب ہیں۔ ہم کو اوک سے پلا دے۔ شراب نہ دے مگر کیا  
خوب کہا ہے۔

اسد خوشی سے میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے کہا جب اس نے ذرا میرے پاؤں ٹال تو دے  
فرماتے ہیں۔ اے اسد فطر خوشی سے میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے جب میں نے اس کی زبانی  
سے یہ سنا کہ ذرا میرے پاؤں دبا دے۔ مطلب یہ ہے کہ اس کے قدموں تک میرے  
ہاتھوں کا پہنچنا اس بات کی دلیل ہے کہ خوش نصیبی سے تنہا پوری ہونے کا زمانہ  
قرب آگیا۔

### غزل

پیش سے میری وقف کشمکش ہزارا بستر ہے مرا سر نہج بالیں ہے مرا تن بار بستر ہے  
فرماتے ہیں۔ میرے ترپنے سے بچھونے کا ایک ایک تار تکلیف میں مبتلا ہو گیا ہے میرا  
سر تکیہ کے واسطے ایک عذاب بن گیا ہے اور میرا جسم بستر کے لئے آتش ہو گیا ہے۔  
سر شک سر بچھا دادہ نور العین دامن ہے دل ہے دست پائا افتادہ بر خور دامن ہے  
فرماتے ہیں۔ میرا ہر آنسو دامن کی آنکھ سے رابہ اور یہ پردہ بیمار بستر مرض کا فرزند دہند  
ہے۔ مطلب یہ ہے کہ غریب کی وجہ سے دامن کو آنسو سے انس پیدا ہو گیا ہے اور بستر

رنجوری کو میرے دل بیمار سے دل بستگی پیدا ہو گئی ہے۔

خوشا اقبال رنجوری عیادت کو تم آئے ہو فروغ شمع بالیں طالع بیدار بستر ہے  
فرماتے ہیں۔ میرا مرض بڑا اقبال مند ہے کہ تم ساری پیکر اور مفرد میری عیادت کے لئے آیا  
ہے تمہارے قدم رنجور کرنے سے شمع بالیں کی روشنی طالع بیدار بستر بن گئی ہے۔ مطلب یہ  
ہے کہ میری بیماری ذریعہ خوشی نصیبی ہے کہ تم میری عیادت کے لئے آئے ہو۔

یہ طوفانِ گاہ جوش اضطرابِ شامِ تنہائی شعلہ آفتاب صبحِ معشر تارِ بستر ہے  
فرماتے ہیں۔ شبِ فراق میں اس قدر اضطراب اور اس درجہ تاریکی ہے کہ ہر ایک تارِ بستر  
آفتاب صبحِ معشر کی کرن بن گیا ہے یعنی ہر ایک سفید تار اس اندھیری رات میں اس طرح  
چمک رہا ہے جس طرح سورج کی کرنیں چمکتی ہیں۔ مگر یہ شعلہ آفتابِ معشر کی شعلہ ہے  
اس لئے کہ جوش اضطراب واقع ہے۔

ابھی آتی ہو بوبالش کی زلفِ مشکیں کی ہماری دید کو خوابِ زینجا عارِ بستر ہے  
فرماتے ہیں۔ ابھی تک تکیہ سے اس کی زلفِ مشکیں کی بو آ رہی ہے یعنی رات ہی کا تو واقعہ ہے  
کہ اس سے وصل نصیب ہوا تھا۔ زینجا کی طرح حضرت دوست کا دیدار خواب میں ہونا ہمارا  
لئے باعثِ تنگ اور ہمارے بستر کے واسطے موجبِ عار ہے۔

کہوں دل کی کیا حالت بھر پار میں غائب کہ بیتابی سے ہر اک تارِ بستر خارِ بستر ہے  
فرماتے ہیں۔ غائب میں کیا بیانی کروں کہ بھر پار میں میرے دل کی کیا حالت ہے۔ مختصر  
پر ہے کہ تڑپتے تڑپتے میرے بستر میں اس قدر سلوٹیں پڑ گئی ہیں کہ ایک ایک تارِ بستر پر  
چبہ جانے کے لئے خارِ بستر بن گیا ہے۔

قطع

خطر ہے رشتہ کالفت رگ گردن نہ ہو جا غرورِ دوستی آفتِ خود دشمن نہ ہو جائے  
رگ گردن۔ کبر و غرور اور غیظ و غضب کی حالت میں بھول جایا کرتی ہے۔ فرماتے ہیں۔

کو میری دوستی پر اس قدر غرور ہے کہ مجھ کو اب یہ خوت پیدا ہو گیا ہے کہیں خدا انخواستہ شے  
 محبت رنگ گردن نہ ہو جائے یعنی محبت دشمنی سے بدل جائے۔  
 سمجھ اس فصل میں کہ تاہی نشو و نما غالب اگر گل سرو کے قامت پر پیرا ہن نہ ہو جائے  
 فرماتے ہیں۔ اے ناکب فصل بہار میں نشو و نما کی کوتاہی سمجھنی چاہیے۔ اگر حجاب کی بلیں بڑھ کر  
 اور پھیل کر سرو کے قامت پر پھولوں کا پیرا ہن نہ بنادیں۔ نہ رت خیال اور بندش الفاظ  
 قابلِ داد ہے۔

### عَنْدَل

فریاد کی کوئی شے نہیں ہے نالہ پاسبند شے نہیں ہے  
 فرماتے ہیں۔ فریاد کے لئے کسی شے کی احتیاج نہیں ہے۔ یعنی بے ساختگی میں نصنع کا دخل  
 نہیں ہے۔ نالہ دل نے کا پاسبند نہیں ہے مطلب یہ ہے کہ آہ دل میں جو اثر ہوتا ہے وہ  
 بناوٹ کی فریاد و زاری میں نہیں ہوتا۔

کیوں بوتے ہیں باغبان تو بے گر باغ گدائے شے نہیں ہے  
 فرماتے ہیں۔ باغبان تو نبوں کی بلیں کس لئے باغ میں بوتے ہیں۔ اگر ان سے کھول گدائی  
 بنانا مقصود نہیں ہوتا۔ اس کوشش سے ثابت ہے کہ باغ بھی گدائے خراب ہے مطلب  
 یہ ہے کہ سبزہ دگل کی سیر کا لطف خراب پنی کر خوب حاصل ہوتا ہے۔

ہر چند ہر ایک شے میں تو ہے پر تجھ سی کوئی شے نہیں ہے  
 فرماتے ہیں۔ باوجودیکہ ہر شے میں تیرا ظہور نہ رت جلوہ نما ہے مگر تیری مانند کوئی چیز دنیا  
 میں پیدا نہیں ہوئی۔ یعنی تو جسمانی تشبیہ سے منزہ ہے بشرتصوت کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے  
 اور بہت خوب ہے۔

ہاں کھائیو مت فریب ہستی! ہر چند کہیں کہ ہے" نہیں ہے  
 فرماتے ہیں۔ ہاں خبردار کہیں ہستی کا دھوکا نہ کھانا۔ ہر چند لوگ کہیں سچی ہے مگر تو یہی



سمجھنا کہ نہیں ہے۔

شادی سے گزر کہ غم نہ ہوئے اُردی جو نہ ہو تو دے نہیں ہے  
فرماتے ہیں۔ خوشی سے دست کش ہو جا پھر تجھے غم نہ ہوگا۔ یعنی اگر تو بہار کے موسم  
سے لطف نشاط حاصل نہ کرے گا تو غم خزاں سے کیوں ملوے اور بخند ہوگا اُردی بہار  
کا مہینہ ہے اور دے خزاں کا۔

کیوں ردِ قدح کرے ہے زاہد مے ہے یہ گس کی قے نہیں ہے  
گس کی قے یعنی شہدِ مذاہر جو شہدِ پئے کو موجبِ ثواب جانتا ہے اور شراب سے نفرت  
کرتا ہے اس کو شراب کی ترغیب دیتا ہے اور یہ جتنا ہے کہ نفرت کی چیز شراب نہیں ہے  
بلکہ وہ چیز ہے جو گس کی قے کرنے سے حاصل ہوتی ہے (از یادگار غائب) شعرِ زندان ہے  
اور خوب ہے۔

ہستی ہے نہ کچھ عدم سے غائب آخر تو کیا ہے اے نہیں ہے  
فرماتے ہیں۔ اے غائب تو جو یہ کتاب ہے نہ کچھ ہستی ہے نہ کچھ عدم ہے۔ یہ تو ہمیں  
بتا آخر تو کیا (اے نہیں ہے) مطلب یہ ہے کہ لفظ (نہیں ہے) کہ اتم قرار دے یا ہے۔ کہتے  
ہیں اے حضرت نہیں ہے۔ نہ تو آپ ہستی محض میں واجب الوجود کی مانند نہ آپ عدم ہی  
میں ممکن کی طرح اس صورت میں لازم ہے کہ جناب کا اتم گرامی نہیں ہے، رکھ دینا چاہیے۔

### غزل

نہ پرچہ نسخہ مریم جراحِ دل کا کہ اس میں ریزۃ الماس جزوِ اعظم ہے  
فرماتے ہیں۔ زخمِ دل کے لئے جو مریم کا نسخہ تجویز کیا گیا ہے۔ وہ نہ پرچہ ہو۔ اس لئے کہ  
اس نسخہ میں دواؤں کا جزوِ اعظم بیرے کی گنتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ زخمِ دل کے واسطے  
اس مریم کا استعمال لازم ہے جس نے زخمِ دل و نارات چو گنا بڑھتا چلا جائے۔  
بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پید کی وہ اک نگہ کہ بظاہر نگاہ سے کم ہے

فرماتے ہیں۔ بہت دنوں کے بعد تیرے تغافل نے ایک نگاہ پیدا کی ہے جو دیکھنے میں نگاہ سے کم ہے۔ مطلب یہ ہے کہ پہلے تو صرف تغافل یعنی ارادۂ چشم پوشی کرتے تھے مگر اب اس ادا کو چھوڑ کر ادائے اتفاقات برتنی شروع کی ہے یعنی پہلے تو میری طرف دیکھتے ہی نہ تھے اب دیکھ لیتے ہیں مگر ایک اچھلتی ہوئی نظر سے۔

قطبہ  
ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے مرتے ہیں مگر اُن کی تمنا نہیں کرتے  
فرماتے ہیں ہم کو اُن کے عشق میں ذات سے بھی رشک پیدا ہو گیا ہے اس لئے  
جان دینی قبول کر لی ہے مگر ان کی تمنا سے دست بردار ہو گئے ہیں۔ یعنی شکار میں گئے  
تو وہ آئیں گے یا ہم کو وہاں بلائیں گے اور ان دونوں صورتوں میں آنکھیں ان کو دیکھیں گی  
ہم کو رشک آئے گا ہاتھ اُن کے ہاتھ سے ملے گا ہم جلیں گے۔ قدم ان کے کوچے کی زین  
پر پڑیں گے ہم کو حسد پیدا ہو جائے گا اس لئے ہم نے ان کی تمنا ہی کو چھوڑ دیا۔

دیر پردہ انھیں غیر سے ہے ربط نہائی ظاہر کا یہ پردہ ہے کہ پردا نہیں کرتے  
فرماتے ہیں۔ انھیں تو غیر سے پردہ میں محبت دلی ہے یہ خراج انھوں نے اس سے پردہ کی  
رسم موقوف کر دی ہے یہ اس دلی محبت کے چھپانے کی غرض سے ہے یعنی اگر وہ پردہ  
کرنے کی حالت میں چھپ چھپ کر اس سے ملے تو رسوا اور بدنام ہو جاتے اب اس کے  
سامنے ہوتے ہیں دلی محبت پر پردہ ڈالنے کی غرض سے۔

یہ باعثِ نو آسید می آربابِ ہوس ہے غالب کو بُرا کہتے ہو اچھا نہیں کرتے  
فرماتے ہیں۔ غالب تمھارا عاشق صادق تھا جب تم اس کو بُرا کہتے ہو تو رقیب ہوا ہوس  
ان باتوں سے شکستہ دل ہو کر نا اُسید ہو جائے گا۔

غزل

کہے ہو بادہ تم سے کسبِ رنگِ فروغ خطِ پیالہ سراسر نگاہِ گلچیں ہے

فرماتے ہیں۔ شراب تیرے سُرخ ہونٹوں سے خوشی رنگ مائل کرنی چاہتی ہے جام پر جو خط  
پڑا ہوا ہے یہ گویا گلچیں کا تار نظر ہے جو تیرے بھول سے ہوں کو چُن رہا ہے۔

کبھی تو اس سرشوریدہ کی بھی داد ملے کہ ایک عمر سے حسرت پرست بالیں ہے  
قاعدہ ہے سودا اور جنوں کی حالت میں نیند کئی سوتوت ہو جاتی ہے۔ فرماتے ہیں کبھی تو یہ  
میرشوریدہ کا بھی انصاف ہو جائے مگر یہ برسوں سے عکبہ کی حسرت میں مبتلا ہے بطلب یہ  
ہے کہ دھل میں سوداے عشق میں کمی ہو کر سرکبہ سے آشنا ہو جائے گا اور نیند بھی آجائے گی۔  
بجائے مگر نہ سُنے نالہ ہائے بلبل زار کہ گوش گل خم شبنم سے پُنبیا گئیں ہے  
فرماتے ہیں۔ اگر بھول بلبل زار کے نالے نہیں سُن سکتا تو معذہ ہے اس لئے کہ گوش گل شبنم کے  
قطروں سے بند ہو گیا ہے گویا اس نے کان میں ردئی قنوس لی ہے اب کیا خاک نالہ بلبل سُن  
سکتا ہے۔

اسد ہے نزع میں چل بے وقار بے خدا مقام ترک حجاب و دواع تمکین ہے  
فرماتے ہیں۔ اسد نزع کی تکلیف میں مبتلا ہے اے بے وقار خدا کے واسطے اس کے پاس چل  
یہ ایسا ہی وقت ہے کہ جب شرم و حجاب کو ترک کر دینا اور تمکین و وقار کو رخصت کر دینا چاہیے۔

### غزل

کیوں نہ جو چشم بُجاں محو تغافل کیوں نہ ہو یعنی اس بیمار کو نظارہ سے پرہیز ہے  
فرماتے ہیں۔ مسینوں کی آنکھ محو تغافل کیوں نہ ہو۔ ضرور محو تغافل ہونی چاہئے اس بیمار  
یعنی مسینوں کی آنکھ نظارہ سے پرہیز ہے۔ چشم بیمار چشم معشوق کی صفت ہے۔

مرے متہ دیکھنے کی آرزو رہ جائیگی وائے ناکامی کہ اس کا قر کا خیر تیز ہے  
فرماتے ہیں۔ دم نکلتے نکلتے بھی حسرت دیدار پوری نہ ہو سکے گی۔ ہائے ناکامی کا رخ ایسا ہوتا کہ  
اس کا قر کا خیر کند ہوتا۔ دشواری سے رک رک کر گلگا کٹتا اور حسرت دیدار تمام و کمال  
پوری ہو جاتی۔

عارضہ گل دیکھ روئے یار یاد کیا آسہ جوشِ فصلِ بہاری اشتیاقِ انگیز  
 فرماتے ہیں بچھو لوں کو کھلا ہوا دیکھ کر اس آسہ ہم کو اپنے دوست کے عارضہ گل رنگ  
 یاد آئے فصل بہاراں جوشِ اشتیاق پیدا کرنے والی ہے۔

### غزل

دیا ہے دل اگر اس کو بشر ہے کیا کئے ہوا رقیب تو ہونا نہ بر ہے کیا کئے  
 فرماتے ہیں۔ اگر نامہ بر بھی اُس کے خُسنِ دلکش پر فریفتہ ہو گیا اور بوجہ بشریت کے اپنا  
 دل ہمارے معشوق کو دے بیٹھا تو اس میں وہ بے خطا ہے اس کو الزام نہ دینا چاہئے۔ ہمارے  
 معشوق کا خُسنِ دلکش ہی اس غضب کا ہے کہ جو شخص اس کو دیکھ لیتا ہمارا رقیب بن جاتا ہے۔  
 اس امر میں نامہ بر کی کوئی خطا نہیں، عجب دلکش مطلع لکھا ہے۔

یہ ضد کہ آج نہ آئے اور آئے ہیں نہ ہے قضا سے شکوہ ہمیں کس قدر ہے کیا کئے  
 فرماتے ہیں۔ موت کا آنا تو لازمی اور ضروری امر ہے کسی نہ کسی روز کھٹ بے بلال آدھکے گا  
 مگر اس کو ہم سے یہ ضد آپڑی ہے کہ آج شبِ فراق میں ہمارے بلانے سے نہیں آئی زندگی پھر  
 ہم کو اس سے یہ شکایت رہے گی۔

رہے جو یوں گے وہ گے گئے دوست کو اب اگر نہ کہے گئے دشمن کا گھر ہے کیا کئے  
 فرماتے ہیں۔ وقت بے وقت جب ہم نے رقیب کو دیکھا ہے کوچہ یار ہی میں پایا ہے اب  
 ہم کیونکر نہ کہیں کہ گئے دوست اس کا گھر بن گیا ہے اندھیرے اُجالے میں پڑا ہوا تھا ہے  
 نہ کہ کرشمہ کہ یوں نے رکھا ہے ہم کو فریب کہ بن کے ہی انھیں سب خبر ہے کیا کئے  
 فرماتے ہیں۔ اس کے ہر انداز ہر ایک اواز سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ہمارے دل کے حال سے  
 وہ خبر دار اور واقف ہے پھر اس سے حالِ دل کہنے کی کیا ضرورت باقی رہی۔

سمجھ کے کہتے ہیں بازار میں پریش حال کہ یہ کہے کہ سرِ رہ گزر رہے کیا کئے  
 فرماتے ہیں۔ رہا دانا شناس یہ بات سمجھ لیتا ہے کہ سرِ را صاحب اپنی وضع داری کے سبب سے

رہتے ہیں مجھ سے گفتگو کرتے ہوئے جمعیس ہیں گے اور جواب میں فرمائیں گے کہ یہاں بات چیت کرنے کا موقع نہیں ہے۔ سر بازار مجھ سے دریافت کرتا ہے فرمائیے آپ کا کیا حال ہے۔ تمہیں نہیں ہے سر رشتہ کوفا کا خیال۔ ہمارے ہاتھ میں کچھ ہے مگر بے کیا کئے فرماتے ہیں ہم کو رشتہ کوفا کا مطلق خیال نہیں ہے تم اس سے راز کو بالکل بھولے بیٹھے ہو۔ بھلا بتاؤ تو ہماری شہمی میں کیا چیز ہے اندر ت بیان اور طرحی خیال اس شعر میں یہ واقع ہوئی ہے کہ غیر محسوس کو محسوس قرار دیا ہے اور اس پر طرہ یہ ہے کہ پہلے اس کا نام بھی لے دیا ہے اور باوجود نام لے دینے کے پھر یہ کہتے ہیں ہمارے ہاتھ میں کچھ ہے مگر تم بتاؤ کیا ہے تم کو تو رشتہ کوفا کا کچھ خیال ہی نہیں ہے۔

انھیں سوال یہ زعم جنوں کیوں لڑیے۔ یہیں جواب سے قطع نظر ہے کیا کئے فرماتے ہیں وہ شوخ لہجہ پر اور میرے سوال پر نظر کو کے یہ سمجھا ہے کہ یہ شخص دیوانہ ہو گیا ہے جو مجھ سے ایسا دور از عقل سوال کرتا ہے اور مجھ کو جواب سے قطع اُسید ہے۔ میں سوال کے بعد ان سے یہ خواہش ہی نہیں رکھتا کہ مجھے میرے سوال کا جواب عنایت فرمائے یہ بند شیں اور ترکیب بیان اور بے ساختگی کے ساتھ دونوں مصرعوں کا دو نکتہ ہونا سرگ نصیب ہوتا ہے۔

حسد سزا کے کمال سخن ہے کیا کیجئے ستم بہائے متاع ہنر ہے کیا کئے یہ شعر بھی اسی قبیل کا ہے فرماتے ہیں۔ کمال سخن کے لئے حسد کا پیدا ہو جانا لازمی ہے۔ مجبور ہی ہے کیا کیا جائے اور متاع ہنر کی قیمت ستم روزگار ہے کیا شکایت کی جائے۔ دونوں شعر بیت الغزل ہیں۔

کہا ہے کس نے کہ غائب بُرا نہیں لیکن سوائے اس کے کہ آشفہ سر ہے کیا کئے کسی کا اشارہ معشوق کی طرف ہے۔ فرماتے ہیں۔ اس نے یہ ارشاد کیا ہے کہ غائب آدمی بُرا نہیں ہے مگر افسوس یہ ہے کہ دیوانہ ہے اور اس کی نسبت کیا کہا جاسکتا ہے۔

## غزل

دیکھ کر در پردہ گرم دامن افشانی مجھے کر گئی وابستہ تن میری عریانی مجھے  
یہ شعر تصوف میں ہے۔ فرماتے ہیں۔ میں مجروح تھا۔ مجھ کو جہانیت سے تعلق ہی نہ تھا۔ مگر سرگرم  
دامن افشانی دیکھ کر مجھ کو میرے تجرّد نے تید بہم میں پھنسا دیا اور خود رخصت ہو گیا۔ عریانی  
سے مراد یہاں بے تعلقی ہے۔

بن گیا تیغ نگاہ یار کا سنگِ فساں مر جیا میں کیا مبارک ہے گراں جانی مجھے  
فرماتے ہیں۔ میں ایسا سخت جان واقع ہوا ہوں کہ تیغِ نگاہِ یار کے زخم کھانا ہوں اور زندہ  
ہوں گویا سنگِ فساں ہوں کہ اس پر خواہ کتنا ہی تلوار کو آبدار کرنے کے لئے دھڑواؤ مگر وہ  
کٹتا نہیں۔ مسرہ ثانی میں طنز لگتے ہیں کہ میری سخت جانی میری جان کے لئے بہت مہانک  
ہو گئی ہے کہ اس نے مجھ کو تیغِ نگاہِ یار کا سنگِ فساں بنا دیا ہے۔

کیوں نہ ہو بے التفاتی اسکی خاطر جمع ہے جانتا ہے محو پر شمشائے پنهانی مجھے  
فرماتے ہیں۔ اس کی طرف سے بے التفاتی کا اظہار کیوں کرتے ہو۔ اس ظالم کی خاطر جمع ہے۔  
یعنی وہ مجھ کو یہ جانتا ہے کہ یہ شخص میرے قصور سے باتیں کیا کرتا ہے اور خیالی پر شمشائے  
نہانی سے سست ہو رہا ہے۔

میرے غمخانی کی قسمت جب رقم ہونے لگی لکھ دیا منجملہ اسباب ویرانی مجھے  
فرماتے ہیں۔ روزِ ازل میں کاتبِ تقدیر نے میرے غمخانی کی قسمت رقم کی تھی اس وقت  
مجھ کو اپنے گھر کی ویرانی کا سبب قرار دیا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ میرے گھر کی ویرانی میری ہی  
ذات سے علاقہ رکھتی ہے۔

بدگماں ہوتا ہے وہ کافر نہ ہوتا کاش کے اس قدر ذوقِ نوائے مرغِ بستانی مجھے  
فرماتے ہیں۔ مجھ کو خوشنویانِ چین کے زمزمے سننے کا شوق ہے اور وہ کافر میرے اس  
شوق سے بدگماں ہوتا ہے۔ اسے کاش مجھ کو یہ شوق نہ ہوتا۔

یائے واں بھی شورِ محشر نے نہ دم لینے دیا لے گیا تھا گوریں ذوقِ تن آسانی مجھے  
فرماتے ہیں۔ افسوس ہے قبریں بھی مجھ کو شورِ قیامت نے بگا دیں تو نیند بھر سونے کی غرض  
سے اور راحت حاصل کرنے کی غرض سے گوریں گیا تھا۔ بے مثل شکر کہے۔

وعدہ کنے کا دنیا کیجئے یہ کیا انداز ہے تم نے کیوں سوئی ہو میرے گھر کی رو بانی مجھے  
دنائے وعدہ کے انتظار میں گھر سے کہیں نہ جانے کو اس طرح یاقی کرنا کہ تم نے میرے گھر کی  
دربانی مجھے سونپ دی ہے بالکل نیا پیرا یہ بیان ہے ازراہِ غائب ہے تغیرِ شکر کہے۔  
ہاں نشاطِ آبِ فصل بہاری واہ واہ پھر ہوا ہے تازہ سودائے غزلخوانی مجھے  
فرماتے ہیں۔ ہاں لے نشاطِ فصل بہاری تیری کیا بات ہے۔ تیری آمد آمد دیکھ کر پھر مجھ کو  
سودائے غزلخوانی تازہ ہو گیا ہے یعنی تیری مدد سے سرگرم غزلخوانی ہو گیا ہوں۔

دی مرے بھائی کو حق نے از سر نو زندگی میرزا یوسف جو غائب یوسف ثانی مجھے  
میرزا یوسف میرزا صاحب کے بڑے بھائی تھے جو غفلوانِ شباب میں دیوانے ہو گئے تھے  
یہ مقطع اُن کی صحت یابی کی مبارک یاد میں لکھا ہے مطلب یہ ہے کہ زندگی دوبارہ پانے  
سے دوسرا یوسف مل گیا ہے۔

### غزل

یاد ہے شادی میں بھی ہنگامہ یارب مجھے سب سے زیادہ ہوا ہے خندہ زیر لب مجھے  
فارسی محاورہ میں یارب کے معنی خدا سے فریاد کرنے کے ہیں اور سب سے زیادہ سے ذکرِ خفی مراد  
ہے فرماتے ہیں مجھ کو شادی میں بھی شورِ یارب یاد ہے۔ میرا سکرانا بھی گویا زاہد کا ذکرِ خفی ہے۔  
مطلب یہ ہے میں کسی حال میں یادِ الہی سے غافل نہیں رہتا۔

ہے کشادہ خاطر و ابستہ در رہن سخن تھا ظلمِ قفل ابجد خانہ مکتب مجھے  
فرماتے ہیں جس طرح قفلِ ابجد حرفوں کے مل جانے سے داہو جاتا ہے یعنی جب تک پھر کہوں  
کو پھر اگر حرفوں سے وہ نعرہ نہ بن جائے جس کی ترتیب قائم ہونے سے قفلِ مکتب ہے قفل

گھل نہیں سکتا۔ اسی طرح سخن سے میری طبیعت کھل جاتی ہے۔ یہی شعر کہنے وقت یا اچھا شعر  
سُنے کے وقت پیرا غنچہ خاطر کھلتا ہے۔

یار اب اس آشفگی کی داد کس کو چاہئے رشک کسائش پہ جز زندانیوں کی اب مجھے  
فرماتے ہیں۔ یا رب میں اپنی بھرا نوروی کی داد کس سے چاہوں۔ جب میں قید خانہ میں تھا تو  
بیاباں گردی کا شوق مجھ کو پریشان رکھتا تھا اور اب بھرا میں اکوارہ گرد ہوں تو ابلی زنداں  
پر مجھ کو رشک آتا ہے۔

طبع ہر مشتاق لذتِ مائے حسرت کیا کروں آہِ زو سے بے شکستِ آرزو مطلب مجھے  
فرماتے ہیں میری طبیعت مسرت و حرام کی مشتاق ہے مگر مجھ کو حسرت و حرام میں لطیف زندگی  
حاصل ہوتا ہے۔ میں اُمید رکھی غرض سے کرتا ہوں کہ وہ ٹوٹ جائے اور مجھ کو لذتِ حرامِ صب  
دیکھوا حاصل ہو جائے۔

دل لگا کر آپ بھی غائب مجھی سے ہو گئے عشق سے آتے تھے مانعِ میرزا صاحب مجھے  
فرماتے ہیں۔ دل لگا کر غائب ہی بھی جیسے ناشق ہی گئے کوئی ان سے یہ تو پوچھے کہ میرزا صاحب  
آپ تو مجھے ترکِ عشق کی نصیحتیں کیا کرتے تھے آپ نے کیوں دامِ عشق کا پھندا اپنی گردن میں  
ڈال لیا۔ یہاں ایک کا لفظ قطاب کے لئے نہیں ہے۔

### غزل

حضورِ شاہِ ہلِ سخن کی آزمائش ہے چمن میں خوشنویاں چمن کی آزمائش ہے  
فرماتے ہیں۔ بادشاہ کے دربار میں شاعروں کا امتحان ہو رہا ہے اور یہ ایسی بات ہے گویا باغ  
میں خوشنویاں چمن کا امتحان ہے مطلب یہ ہے کہ دربار کے تمام و کمال خواہ مخواہ ہیں ان کا  
امتحان ایسا ہی امتحان ہے جیسا باغ میں خوش الحان جانوروں کا جس مشاعرہ میں میرزا صاحب  
نے یہ غزل پڑھی تھی بادشاہ رونقِ فردز تھے۔

قد دگیسو میں تو کہن کی آزمائش ہے جہاں ہم ہیں ہاں دار و سن کی آزمائش ہے



فرماتے ہیں بھنوں اور کوہن کے لئے جو مصیبتیں تھیں وہ صرف بلی و شیریں کے تہ و گیسو کی  
 ایک محد و تھیں۔ لیکن ہم کو ایسے ظالم سے پالا پڑا ہے جو عشق و تاس کی سڑا میں وار پر  
 کھینچتا ہے اور سودائے زلف کی سزا پھانسی تجویز کرتا ہے۔

کریں گے کوہن کے حوصلہ کا امتحان آخر ہنوز اس فستے کے یز و گتے کی آزمائش ہے  
 فرماتے ہیں ابھی تو اسرت کوہن کی طاقت دست و بازو کا امتحان لیا جا رہا ہے کہ اس کو  
 جوئے شیر نکالنے اور گوہ بے ستون کاٹنے کا حکم دیا گیا ہے۔ صبر و ضبط کی طاقت آزمائی کا  
 امتحان تو اس وقت ہوگا جب ایک پیرزنی مرگ شیریں کی دغراش خبرے کر اس عاشق نامراد  
 کے پاس پہنچے گی اور وہ کم حوصلہ میٹھے سے سر پھوڑ کر مر جائے گا۔ گویا کوہن پر طعن ہے کہ  
 وہ کم حوصلہ جان دے کر میدان عشق سے بھاگ نکلا۔

نیم مصر کو کیا پیر کھانا کی ہوا خواہی اُسے یوسف کے بوئے پیرہن کی آزمائش ہے  
 فرماتے ہیں نیم مصر کو پیر کھانا یعنی حضرت یعقوب کی کچھ ہوا خواہی نہیں ہے۔ اسے تو حضرت  
 یوسف کی خوشبوئے پیرہن کا امتحان منظور ہے۔ وہ مصر سے کھانا کی طرف اس خوشبو کو  
 دیکھنے چلی ہے کہ یہ خوشبو ہوا میں پھیل کر کتنی دور تک تاحم رہ سکتی ہے اور کیا اثر پیدا کرتی ہے۔  
 وہ آیا بزم میں کھینو نہ کیو پھر کہ غافل تھے شکیب صبر اہل انجمن کی آزمائش ہے  
 فرماتے ہیں صبر و شکیب لوٹ جانے والا مشوق وہ سامنے بزم کے اندر آگیا ہے دیکھو خبردار  
 ہو جاؤ پھر نہ یہ عذر کرنا کہ ہم غافل تھے غفلت کی حالت میں ہم پر اس کا وار چل گیا اور یہ بھی  
 ظاہر کئے دیتے ہیں کہ اسے صبر و قرار اہل بزم کا امتحان منظور ہے اس لئے اس نے یہاں قدم رنجہ  
 فرمایا ہے جس بیان اور بندہ غلظاظ تعریف سے مستغنی ہے۔

رہے دل ہی میں تیرا چچا جگر کے پار ہو بتر غرض شست بہت ناوک نلگن کی آزمائش ہے  
 فرماتے ہیں تیرا خواہ دل میں رہ جائے، خواہ دل و جگر کو توڑ کر مینہ سے پار ہو جائے دونوں  
 صورتوں میں غرض یہ ہے کہ بت ناوک نلگن کا نشانہ دیکھا جائے کہ وہ تاردار انداز ہے یا نہیں۔

ارادے کے ساتھ اس کا تیر نشانہ پر بیٹھا یا خطا کر کے آگلا۔ بیانی کی خوبی کا کیا پوچھنا ہے۔  
 نہیں کچھ سجدہ و زنا کے پھندے میں گہرائی وفا داری میں شیخ و برہمن کی آزمائش ہے  
 فرماتے ہیں۔ سجدہ و زنا کے پھندوں میں جو شیخ و برہمن گزرتے ہیں اس میں سجدہ و زنا کے پھندوں  
 کی مضبوطی نہ دیکھو بلکہ یہ امتحان کرو کہ میدان وفا داری میں ان دونوں میں سے کون سا شخص پورا  
 اترتا ہے۔ یعنی زندگی بھر پابندی کے ساتھ اس وضع کو کون نبھاتا ہے۔ شیخ یا برہمن۔  
 پڑا رہا ہے دل وابستہ بیتابی سے کیا اصل مگر پھر تاب زلف پر خشکن کی آزمائش ہے  
 فرماتے ہیں۔ اے دل اسی طرح بندھا ہوا پڑا رہ کر رہ نہیں۔ اگر تو ترپے پھر کے گا تو زلف کے  
 پھندے اور زیادہ کس جائیں گے۔ تو بیتابی سے زلف پر خشکن کے پھندوں کا کیا امتحان لیتا ہے  
 بھلا تیری بیتابی سے کہیں وہ کھٹنے والے ہیں۔

رنگ و پے میں جیل ترے نہ ہر غم تب دیکھیے کیا ہو ابھی تو تلخی کام و دہن کی آزمائش ہے  
 فرماتے ہیں۔ زہر خشک رنگ و پے میں وقت سرائیت کرے وہ انجام دیکھنے کے قابل ہو گا ابھی تو  
 آفتاز خشک ہے صرف اس کی تلخی سے منہ کا مڑا کر دوا ہو گیا ہے۔ کام و دہن کا امتحان ہو رہا ہے  
 انجام بہت سخت ہونے والا ہے۔

وہ آئیں گے مرے گھر وعدہ عیسا دیکھنا غائب نئے نقیوں میں ابچرخ کہن کی آزمائش ہے  
 فرماتے ہیں۔ وہ میرے گھر آئیں گے نہیں۔ قیامت تک نہ آئیں گے۔ اے غائب ان کو اپنے وعدہ  
 کا کب خیال ہے وہ تو اس کو بھول بھی گئے ہوں گے۔ اب ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ آسمان کس کس  
 نئی نئی مصیبت میں مبتلا کرتا ہے۔ یعنی ان کی وعدہ خلافی سے اور نہ آنے سے یہ دیکھنا ہے کہ  
 آسمان ہم پر ان کی بددلی میں کیا مصیبت توڑتا ہے۔

### غزل

کبھی نیکی بھی اس کے جی میں آجائے ہے مجھ سے جفا میں کر کے اپنی یاد شرم جائے ہے مجھ سے  
 یعنی اس خیال سے کہ تمام عمر اس پر ظلم کئے ہیں اب تھوڑی سی نیکی کرنے سے اس کی کیا لگائی

ہو سکتی ہے، نیکی نہیں کر سکتا۔ (انرا دگا بہ غائب)

خدا یا جذبہ دل کی مگر تاثیر الٹی ہے کہ جتنا کھینچتا ہوں، دھکھنچتا جائے ہے مجھ سے فرماتے ہیں۔ الٹی کیا میرے جذب دل میں اٹھا اثر پیدا کر دیا ہے کہ جس قدر میں اس کو اپنے جذب دل سے کھینچتا ہوں اسی قدر وہ مجھ سے آذر وہ خاطر اور برہم مزاج ہوتا جاتا ہے۔ وہ بدخوا اور میری داستانِ عشق طولانی عبادت مختصر قاصد بھی گھبرا جائے کہ مجھ سے فرماتے ہیں۔ مجھ کو وہ مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ ایک یہ کہ وہ شوق بہت بدخوا اور بد مزاج ہے دوسرے یہ کہ میری داستانِ عشق اس قدر طولانی ہے کہ کسی طرح ختم ہونے ہی نہیں آتی۔ قصہ مختصر یہ ہے کہ قاصد بھی میرے پیام سننے سننے گھبرا جاتا ہے تو پھر بھلا مشوق بدخوا تھی ایسی چوڑی داستان سننے کب گزارہ کرے گا۔

ادھر وہ بدگمانی ہے، ادھر یہ ناتوانی ہے نہ پوچھا جائے ہے اس کے نہ بولا جائے مجھ سے فرماتے ہیں۔ وہ تو میری جانب سے ایسا بدگمانی ہے کہ اس کو کسی طرح میری محبت کا یقین ہی نہیں آتا جب میں اس سے کہتا ہوں وہ کہتا ہے تو مجھو ما ہے اور میں اس قدر ناتوان ہو گیا ہوں کہ اپنے دعوے کے ثبوت میں دلیل بھی پیش نہیں کر سکتا۔ وہ بدگمانی کی حالت میں میرا حال مجھ سے کیوں پوچھے اور میں ناتوانی کی صورت میں اپنی مصیبتیں کیونکر اس سے مفصل بیان کر سکوں، اندر ت بیان کی تعریف نہیں ہو سکتی۔

سنہیلنے دے مجھے اے نا اُمیدی کیا قیامت کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہو مجھ سے فرماتے ہیں۔ اے نا اُمیدی کیوں مجھ کو گرا دیتی ہے، فوراً تو سنہیلنے دے دیکھ دامنِ خیالِ یار میرے ہاتھ سے اب چھوٹ جائے گا۔ مطلب یہ ہے نا اُمیدی کی وجہ سے اس کا خیال دل سے نکلا جاتا ہے۔

مکلف بر طرفِ نظر آرگی میں بھی سہی لیکن وہ دیکھا جائے کہ ظلم دیکھا جائے ہو مجھ سے فرماتے ہیں۔ میرے ناما کو اس کے دیکھنے والوں میں بھی شامل ہوں مگر یہ ظلم مجھ سے کبھی

دیکھا جائے گا کہ اس کو نوک دیکھیں۔ بھلا یہ رشک مجھ سے کیونکر گوارہ ہو سکتا ہے۔  
 ہوئے ہیں پاؤں ہی پہلے نبرد عشق میں تھی نہ بھگا جاوے مجھ کو نہ ٹھہرا جائے مجھ سے  
 اس میں وجدانی کیفیات کی تشکیل محسوسات کے ساتھ دی گئی ہے مطلب یہ ہے کہ وہ قوی  
 جن سے عشق کے ترک کرنے یا اس کے خدا پر تحمل کرنے کی قدرت تھی۔ ابتداءً عشق میں نہیں گزرتا  
 صد مہینچا۔ بس ناب عشق ترک ہو سکتا ہے نہ اس پر صبر و تحمل کیا جاسکتا ہے (ازیا دگار غالب)  
 قیامت ہے کہ ہوئے مدعی کا ہمسفر غالب وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونا چاہئے مجھ سے  
 فرماتے ہیں۔ قیامت کی بات ہے کہ اس کافر کو رخصت کرنے کے وقت میں یہ کہوں کہ جاؤ خدا  
 کو سونا خدا حافظ تم کو خدا کی حفظ و امان میں دیا۔ بھلا یہ رشک تو مجھ سے گوارہ ہی نہیں ہوتا۔  
 پھر یہ تم کو کہیں کہ وہ مدعی کا ہمسفر ہو۔

### غزل

ز بسکہ عشق تماشا، جنوں علامت ہے کشاد و بست مژہ سیلی ندامت ہے  
 فرماتے ہیں۔ اس دُنیا کی نیرنگیوں کا تماشا دیکھنا ایک دیوانگی کی علامت ہے۔ تماشا دیکھنے  
 کی حالت میں آنکھوں کا گھٹنا اور جھکنا گویا ندامت کے مانچے ہیں مطلب یہ ہے کہ یہ  
 دُنیا ناپائدار اس قابل نہیں ہے کہ کوئی اہل دل اس کا تماشا دیکھ کر اپنا وقت ضائع  
 کرے اور انجام کار نادام و خجیل ہو۔

نہ جانوں کیونکہ مظلوع طلعی بد عہدی تجھے کہ آئینہ بھی و رطلہ طامت ہے  
 فرماتے ہیں معلوم نہیں تیری بد عہدی کے وجہ سے کس پانی سے چھوٹیں گے۔ تیرے واسطے تو  
 اب آئینہ بھی و رطلہ طامت ہے یعنی تو دیکھ کر غیروں کے دکھائے کو بناؤ سنگھار کیا کرتا ہے جو  
 حقیقتاً بد عہدی میں داخل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہمارے ساتھ جو جھوٹے دندے کے  
 جاتے ہیں وہ بھی غیروں سے دغا ہوتے ہیں۔

یہ تیج و تاب ہوں سلک عافیت توڑ نگاہ عجز سر رشته سلامت ہے

فرماتے ہیں۔ ہوس کے بیچ و تاب میں پھنس کر سب عافیت کو نہ توڑ۔ اگر سب عافیت ٹوٹ جائے گی تو پھر عافیت کا کیس پتہ بھی نہ ملے گا۔ نگاہِ عجز یعنی ترک ہوا و ہوس ایک سرشت ہے، سلامتی کا مطلب یہ ہے کہ ہوس رانی سے دونوں جہان کی راحت و آسائش برباد ہو جاتی ہے۔

وفا مقابل و دعویٰ عشق بے بنیاد جنوں ساختہ و فصل گل قیامت ہے  
اس شعر میں رقیب ہوا ہوس پر طعن کی ہے۔ فرماتے ہیں۔ عشق و وفا دار تو وفا کرنے پر آمادہ ہوا و عشق کا دعویٰ جھوٹا کیا جائے اس کی مثال ایسی ہے جیسے بیج بچ موسم بھارا گیا ہوا و جنون بناوٹی ہو اس سے زیادہ خسارناک اور کیا بات ہو سکتی ہے۔

### عزل

لاغر اتنا ہوں کہ گر تو بزم میں جاؤں مجھے میرا ذمہ دیکھ کر گر کوئی بتلائے مجھے  
فرماتے ہیں۔ تو رقیب کے خون سے مجھ سے ملنا کیوں ترک کرتا ہے، میں تو اس قدر لاغر ہو گیا ہوں کہ اگر تو مجھے اپنی محفل میں بلائے اور اپنے پاس بٹھائے تو میں کسی کو نظر بھی نہ آؤں۔

کیا تعجب ہے کہ اس کو دیکھ کر آجائے رحم و ان تلک کوئی کسی جیلے سی پہنچائے مجھے  
فرماتے ہیں۔ میرا حال ایسا زار و نزار ہو گیا ہے کہ اگر ان کے کہہ نہ کوئی شخص سہارا دے کر مجھ کو پہنچا دے اور ان سے میرا سامنا ہو جائے تو عجب نہیں کہ آنکھ ملنے ہی ان کو بھی ٹھپے رحم آجائے۔

مجھ نہ دکھلائے نہ دکھلا پر بہ اندازِ حق کھول کر پردہ ذرا آنکھیں ہی دکھلائے  
فرماتے ہیں۔ مگر تو مجھ سے حجاب کرتا ہے۔ ملنے ہونے اور نہ دکھانے میں شرا ہے تو مجھ نہ دکھا لیکن غصہ کے انداز سے پردہ ہٹا کر آنکھیں تو مجھے دکھا دے (آنکھ دکھانا خفا ہونے کے موقع پر بولا جاتا ہے) میں دیکھوں تو سہی تیری آنکھوں میں کس قدر غصہ

ہے اور غصہ کی حالت میں تیری آنکھ کا کیا رنگ ہوتا ہے۔  
 اے تاک۔ میری گرفتاری کو وہ خوش ہو کر میں زلف گر بن جاؤں تو شلے میں کچھائی مجھے  
 فرمائے ہیں۔ اس قدر وہ میری گرفتاری سے خوش ہوتا ہے کہ اگر بالفرض محال میں اس کی  
 زلف بن جاؤں جو گرفتاری کا ایک اکہ ہے تو اس زلف کو بھی وہ شانہ میں الجھا دے اور  
 گرفتار کر دے۔

### غزل

بازیگر اطفال ہے دنیا مرے آگے ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے  
 فرماتے ہیں۔ دنیا میری نگاہ میں ایک بازیگر اطفال ہے۔ ان دنیا کے حادثوں کا مجھ پر کچھ  
 اثر نہیں مقاربات میں یہ واقعات دیکھتا ہوں اور ان کو ایک بھائی جی کا تماشا بانٹا ہوا۔  
 بے شل مطلع لکھا ہے۔

اک کھیل جو اورنگ سلیمان ہرے نزدیک اک بات ہے اعجازِ مسیحا مرے آگے  
 فرماتے ہیں میں بشرِ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کا دیکھنے والا ہوں تختِ سلیمان میرے نزدیک ایک  
 کھیل ہے یعنی ایک معمولی شے ہے اور اعجازِ مسیحا میری نگاہ میں ایک معمولی درجہ کی  
 بات ہے بات کے نقطہ نے اعجازِ مسیحا کے مقابلہ میں عجیب طعنے پیدا کر دیے۔ یہ شعر  
 بیتِ اغزل ہے۔

جز نام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور جز وہم نہیں ہستیِ اشیا مرے آگے  
 اس شعر میں فلسفہ اور تشویش کا ایک عجیب سلسلہ بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔ عالم کا نام ہی  
 نام ہے اس کی صورت نظر میں کچھ بھی نہیں ہے۔ ہستیِ اشیا میرے ردِ ہر دو سوائے وہم کے  
 اور کچھ نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ذاتِ باری تعالیٰ کے سوا میں کسی شے کو موجود نہیں سمجھتا۔  
 ہوتا ہے نہاں گرد میں صحرا مرے ہوتے گھستا ہے جیس فاکہ دریا مرے آگے  
 فرماتے ہیں۔ میں دیوانگی کے عالم میں اس قدر خاک اڑاتا ہوں کہ جنگل گرد میں پوشیدہ ہو جاتا۔

ہے اور آنکھوں سے اس قدر اشک بہا تا ہوں کہ دریا میرے آگے بہہ نکلتا ہے پانی کے زور کو جبین رگڑنے سے تیسر کیا ہے۔

مت پوچھ کہ کیا حال ہو میرا ترے پیچھے تو دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا مرے آگے فرماتے ہیں۔ مجھ سے یہ نہ پوچھ کر تیری جدائی میں میرا کیا حال ہوتا ہے۔ بلکہ تو یہ دیکھ کہ تیرا میرے روبرو کیا رنگ ہے۔ یعنی تو میرے سامنے آکر کس قدر مضطرب اور پریشان ہو جاتا ہے۔ جینہر ہی حال میرا تیرے بحر میں ہو جاتا ہے۔

سچ کہتے ہو خود بینی خود آرا ہوں کیوں نہیں بیٹھا ہے بُتِ آئینہ سہا مرے آگے فرماتے ہیں۔ یہ تو سچ کہتے ہو کہ میں خود بینی و خود آرا ہوں، لیکن جب تم سا آئینہ جبین میرے آگے بیٹھا ہو تو میں کیوں نہ خود بینی و خود آرائی کروں۔

پھر دیکھئے اندازِ گل افشائی گفتار رکھ دے کوئی ہیما نہ دھبہ ہا مرے آگے فرماتے ہیں۔ پھر دیکھئے میری زبان سے کیسے پھول جھڑتے ہیں۔ میرے آگے ایک گلاس اور شیشہ خراب کا بھر کہ کوئی رکھ دے۔ سنا گیا ہے کہ میرزا صاحب شام کے وقت پناہ کرتے تھے اور شب کو سرخوشی کے عالم میں عجب پُر لطف باتیں کیا کرتے تھے۔

نفرت کا گماں گزرے ہو میں رنج گزرا کیونکر کہوں لو نام نہ اُن کا مرے آگے فرماتے ہیں۔ اگر کوئی شخص مشفق کا نام میرے سامنے لیتا ہے تو میں روبرو رنج کے بے لطف ہو جاتا ہوں۔ لوگ اس کو نفرت پر معمول کہتے ہیں۔ اس سے بہتر ہے کہ میں رنج کرنا چھوڑ دوں۔ یہ تو کسی سے کہہ نہیں سکتا کہ اس کا نام میرے آگے نہ لو۔

ایساں مجھے روکے ہو تو کھینچنے ہو مجھے کفر کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے فرماتے ہیں۔ ایساں مجھ کو روکتا ہے یعنی کعبہ میری پشت کی جانب ہے جب آگے قدم بڑھاتا ہوں تو کعبہ کی طرف سے کشش پیدا ہوتی ہے اور کفر کچھ کہ کھینچتا ہے یعنی گرجا میرے منہ کے سامنے ہے اور وہ کھینچ رہا ہے کہ ادھر چلا آ۔

عاشق ہوں پہ معشوق فریبی ہے مرا کام مجنوں کو بُرا کہتی ہے لیلیٰ مرے آگے  
 فرماتے ہیں۔ ہوں تو میں عاشق مگر معشوق فریب عاشق ہوں یعنی ساری دُنیا کے معشوق  
 مجھ سے محبت رکھتے ہیں۔ لیلیٰ میرے مقابلہ میں مجنوں کو بُرا کہتی ہے اور میری تعریف کرتی ہے۔  
 خوش ہوتے ہیں پر فصل میں محسوس نہیں جاتے آئی شبِ بھراں کی تمنا مرے آگے  
 فرماتے ہیں۔ سب عاشقِ دل میں خوش ہوا کرتے ہیں مگر شاوکی مرگ نہیں بوجھانے معلوم  
 ایسا ہوتا ہے کہ شبِ فراق میں جو میں نے مرنے کی تمنا اور آمد کی تھی وہ دُمل میں میرے سامنے  
 آئی۔ یہ شعر مرزا کے نشتروں میں کا ایک نشتر ہے۔

ہے موجزنِ اک قلمِ خوں کاش یہی ہو آتا ہے ابھی دیکھئے کیا کیا مرے آگے  
 فرماتے ہیں۔ یہ جواک ایک خوبی کا دیا میری آنکھوں سے بہ رہا ہے۔ کاش ایسا ہو کہ اسی  
 مصیبت پر فاقہ ہو جائے، مگر نہیں دیکھئے ابھی کیا کیا آئیں اور مصیبتیں میرے آگے آتی ہیں۔  
 گواہ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے  
 یہ شعر بھی مرزا کے مشہور نشتروں میں کا ایک نشتر ہے۔ فرماتے ہیں۔ اگرچہ اب ہاتھ حرکت نہیں  
 کرنا اور جام اٹھا کر منہ سے لگانے کی طاقت باقی نہیں رہی ہے لیکن ابھی تک آنکھوں  
 میں جلن باقی ہے شیشہ و ساغر کو ابھی میرے آگے سے نہ اٹھاؤں دیکھ ہی کر مست ہو رہا ہوں۔  
 ہمیشہ وہمِ شرب و ہمِ ازہ ہے میرا غائب کو بُرا کیوں کہو اچھا مرے آگے  
 فرماتے ہیں۔ غائب میری طرح سے عاشق بھی ہے اور میرا ہم نہ بہت بھی ہے اور راز دار  
 بھی ہے تم اس کو بُرا کیوں کہتے ہو مطلب یہ ہے کہ معشوق ابھی حضرت غائب کو پہچانتا  
 نہیں ہے خود بدولت ہی اس سے باتیں کر رہے ہیں عجیب پر لطف مقطع لکھا ہے۔

### غزل

کہوں جو حال تو کہتے ہو مدعا کہئے تمہیں کہو کہ جو تم یوں کہو تو کیا کہئے  
 فرماتے ہیں۔ میں اگر اپنا حال بتا بی شوق کہتا ہوں تو تم کہدیتے ہو کہ مدعا کہئے۔ حالاً کہ تم



میرے مدعاے دل سے بخوبی واقف و آگاہ ہو اور پھر تجاہلِ عارفانہ کرتے ہو اب میں تم ہی سے پوچھتا ہوں کہ تمہارے اس پوچھنے کے جواب میں مجھے کیا کہنا چاہیے۔

نہ کیسے طعن سے پھر تم کہ ہم شکر ہیں مجھے تو خو ہے کہ جو کچھ کہو بجا کہئے فرماتے ہیں۔ تم میری عادت سے بخوبی آگاہ ہو کہ میری یہ عادت ہے کہ تمہاری ہر بات پر میں درست اور بجا کہہ دیا کرتا ہوں۔ پھر تم نے طعن سے کیوں کہا کہ ہم شکر ہیں۔ عادت کے موافق میری زبان سے نکل گیا کہ بجا درست اور شاہد ہر اس بات سے بے وجہ آذر وہ یوں ہوتے ہو، پھر کبھی نظر آئے کہ جو شکر نہ کہنا اور نہ میں تو پھر بھی بنی ہوئے مجھے بجا کہہ دوں گا۔ وہ نیشتر سی پر دل میں جب اتر جائے نگاہِ ناز کو پھر کیوں نہ آشنا کہئے فرماتے ہیں۔ یہ ہم نے ہی دیا کہ نگاہِ ناز بھی نیشتر ہے مگر جب دل میں اتر جائے یعنی نیشتر ہو جائے اور دل اس کو قبول کرے، پھر نگاہِ ناز کے آشنا کرنے میں کیا تردد ہے۔

نہیں ذریعہٴ راحت جراثیمِ بیکار وہ زخمِ تنغ ہے جس کو کہہ دیکشا کہئے فرماتے ہیں۔ زخمِ بیکار تیرا نیشترِ خاطر کا سبب نہیں ہو سکتا جس زخم کو دیکشا کہنا چاہا وہ تلوار کا زخم داس دار ہے اس سے دلِ بشاش ہو جاتا ہے۔

جو مدعی بنے اُس کے نہ مدعی بنئے جو ناسزا کہے اُس کو نہ ناسزا کہئے فرماتے ہیں۔ دشمنی کے مقابلہ میں دشمنی کرنی حسنِ انفاق سے بید اور اہلِ غفلت کا کام نہیں ہے اگر کوئی شخص تم کو بُرا کہے تو تم اس کے جواب میں اس کو بُرا نہ کہو۔ بُرائی کا بدلہ بھلائی سے بہتر ہے تم دشمنی کے مقابلہ میں احسان کرو۔

کہیں حقیقت جانکا بجی مرض لکھے کہیں مصیبتِ ناسازی دوا کہئے فرماتے ہیں۔ کہیں تو جانکا بجی مرضِ عشق کی حقیقت لکھے، یعنی فراق و ہجر میں دل پر جو کچھ صدمے گزرتے ہیں اس کی مفصل حالت اور کہیں ناسازی دوا کی سیبتِ ربانی کہئے یعنی دوسل بھی دردِ عشق کے لئے ناسوانق دوا ثابت ہوتی ہے یعنی معشوق سے گمراہ

شوق کی جہاںیاں سحر و سحر کا کھنکھار رہی۔ رزب کی تلاش یہ سب باتیں وصل میں پہنچے رکھنے والی ہیں۔

کبھی شکایت رنج گراں نشیں کیجئے کبھی حکایت صبر گریز پا کئے  
 فرماتے ہیں۔ ہماری عمر اسی غم و اکلام میں گزر رہی ہے۔ کبھی مصائب ہجر کا دکھ اڑا دئے  
 بیٹھ جاتے ہیں۔ کبھی صبر گریز پا کی شکایتیں زبان پر آتی ہیں، منہ دالے پریشان ہو جاتے  
 ہیں۔ دشمن ہنسنے ہیں۔ احباب طعن زنی کرتے ہیں۔ ایک محبت کے ساتھ ہزار انداز میں۔  
 رہے نہ جان تو قاتل کو خونہا دیجئے کئے زبان تو خنجر کو مرجھا کئے  
 فرماتے ہیں۔ محبت میں دست نہ رنگ آدہ بیان و فاکا معاملہ ہے۔ جان نکلتے وقت  
 قاتل کو خونہا صحت کر دینا چاہئے اور زبان کٹ جائے تو لہجہ کی رحمت سرائی کرنی چاہئے۔  
 نہیں نگار کو الفت نہ ہونگار تو ہے روائی و روشن و مستی ادا کئے  
 فرماتے ہیں۔ مشوق کی عیب جوئی کرنی نہ بہب عشق میں گناہ عظیم ہے اگر اس کو محبت  
 نہیں ہے نہ ہو لیکن مشوق تو ہے اس کی خوبیاں بیان کرنی چاہئیں۔ اس کے ناز و  
 انداز ادا و حسن کی تشریف بیان کرنی مناسب و آونی ہے۔

نہیں بہار کو فرصت نہ ہو بہار تو ہے طراوت چمن و خوبی و ہوا کئے  
 فرماتے ہیں۔ بہار کو فرصت قیام نہیں ہے نہ ہو۔ مگر پھر بھی موسم بہار تو ہے۔ یہ شکایت  
 چھوڑ کر طراوت چمن کی تعریف اور ٹھنڈی ہوا کی ستر و خوشگوار بیانی کرنی چاہئے  
 سفینہ جب کہ کنارے پہ آگیا غائب خدا سے کیا ستم و جور نا خدا کئے  
 فرماتے ہیں۔ اے غائب مصیبت اور تکلیف کا وقت گزر جانے کے بعد ان کو بھول جانا  
 چاہئے دل میں گرہ نہ ابھرنی چاہئے بلکہ پھر کسی سے شکایت بھی نہ کرنی چاہئے (نقدان نے  
 چار باتوں پر حکمت و اخلاق کا حصہ رکھا ہے ان میں سے دو باتیں یاد رکھنے کی ہیں اور دو  
 باتیں بھول جانے کی۔ موت کا آنا اور خدا کا حاضر و ناظر جانتا یہ دو باتیں یاد رکھنے کی ہیں

اور کسی شخص پر احسان کر کے اور کسی شخص کی بُرائی برداشت کر کے یہ دو باتیں بھول جانی چاہئیں۔

### غزل

رونے سے اور عشق میں مہیاں ہو گئے دھوئے گئے ہم اتنے کہ بس پاک ہو گئے  
 دھویا جانا بے شرم و مہیاں۔ پاک، آزاد یا شہداء۔ مطلب یہ ہے کہ جب تک آنکھ  
 سے آنسو نہیں نکلے تھے تو اس بات کا پاس و لحاظ تھا کہ عشق کا راز کسی پر ظاہر  
 نہ ہونے پائے مگر جب رونا ضبط نہ ہو سکا اور ہر وقت آنسو جاری رہنے لگے تو  
 اخفائے راز عشق کا خیال جاتا رہا اور ایسے بے شرم و بے حجاب ہو گئے کہ آزاد و دلدادہ  
 شہدوں کی طرح کھل کھیلے۔ اس مطلب کو ان لفظوں میں ادا کرنا کہ رونے سے ایسے  
 دھوئے گئے کہ بالکل پاک ہو گئے۔ بلاغت اور حسن بیان کی انتہا ہے (از یادگار عتاب)  
 صرت بہائے سے ہوئے آلات میکشی تھے یہ ہی دو حساب سویلوں پاک ہو گئے  
 فرماتے ہیں مفلوک سے کی ایک فرست بنا رکھی تھی۔ ہر روز پرتال کرتی پڑتی تھی۔ برتنوں  
 کا گنا سنہلانے جیستی سامان کا قفل میں بند کرنا۔ ان کی حفاظت کرنی۔ غرض یہ کہ  
 جان غصب میں آگئی تھی۔ اکثر گلاس چاندی سونے کے تھے۔ ان سب کو بچ کر ان کے  
 داسوں کی شراب نوش فرمائی نہ کمال کے قرضدار سب سے نہ برتنوں کی حفاظت اور  
 ان کے لکھنے پڑھنے کا جھگڑا باقی رہا۔

رسوائے دہر گو ہوئے آوارگی سے تم بارے طبیعتوں کے تو چالاک ہو گئے  
 فرماتے ہیں۔ اگرچہ آوارگی کے سبب سے تم زمانہ بھر میں بدنام و رسوا ہو گئے لیکن  
 پھر بھی اتنا فائدہ حاصل ہوا کہ شوخ طبیعت اور حاضر جواب بن گئے۔ طبیعتوں کا  
 چالاک ہونا محاورہ ہے جمع و مفرد دونوں طرح سے بولا جاتا ہے۔  
 کہتا کون نالہ بلیل کو بے اثر پردے میں گل کے لاکھ جگر چاک ہو گئے

فرماتے ہیں: نالہ بیل کو بے اثر کون کتا ہے، وہ کہنے والا ہمارے سامنے تو آئے، گل کے لباس میں لاکھوں جگر چاک ہو گئے۔ پھولوں کے کھلنے کو جگر چاک ہونے سے نہیں کیا ہے، غرض یہ ہے کہ عاشق کی فریاد میں اثر کا ہونا لازمی اور ضروری ہے۔

پوچھے ہے کیا وجود و عدم اہل شوق کا آپ اپنی آگ سے خس و خاشاک ہو گئے فرماتے ہیں۔ اہل شوق کا وجود و عدم یکساں ہے اپنی آتش شوق میں خود ہی گھاس بھوس کی طرح سے جل گئے اہل شوق سے یہاں عاشقان الہی مراد ہیں جو شب و روز کسب ثنائی اللہ میں مصروف رہ کر اپنی ہستی کو مٹا دیتے ہیں۔

کرنے گئے تھے اُس سے تغافل کا ہم گم کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے شاہِ حقیقی کا جو معاملہ عشاق کے ساتھ ہے اس کو تغافل کے ساتھ اور عشاق کے معاملہ کو نگاہ کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے جیسا کہ کتابی بھی کتاب ہے

اے زاہد و عاشق از تو در نالہ و آہ دور تو و بنزدیک ترا حال تباہ

کس نیست کہ جان از تو سلاست بہرہ آں را بہ تغافل کشی اس را بہ نگاہ

بس شعر کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے اس کے تغافل سے تنگ آ کر شکایت کی تھی اور اس کی توجہ کے خواستگار ہوئے تھے جب اس نے توجہ کی تو ایک ہی نگاہ میں ہم کو

فنا کر دیا۔ (از یادگار غائب)

اس رنگ سے اٹھائی گل اُس نے اس کی نعش دشمن بھی جس کو دیکھ کے غمناک ہو گئے

فرماتے ہیں۔ اس نے فلان موقع اس توقیر و عزت کے ساتھ میرزا اسد اللہ خاں صاحب غائب کی سیٹ اٹھائی کہ جس کو دیکھ کر دشمنوں کے گلچے میں رشک کی آگ بھڑک اٹھی۔

غزل

نشہ با شاداب رنگ ساز ہا مستِ طلب شیشہ سے سرو سبز جو بارِ نغمہ ہے

فرماتے ہیں۔ نشہ راگ رنگ سے شاداب ہو گئے ہیں اور سازِ نشہ طرب سے سرشار نظر آتے

ہیں یعنی شراب نے نغمہ میں اور نغمہ شراب میں اس درجہ سلیج کر لی ہے کہ مینائے شراب سر و جو بیکار نغمہ بن گیا ہے۔

ہنہشیں مت کہہ کر ہم کر نہ بزمِ عیش دوست      واں تو میرے نالہ کو بھی اعتبارِ نغمہ ہے  
فرماتے ہیں۔ اے ہنہشیں تو مجھے نالہ کرنے سے کیوں روکتا ہے۔ کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ اس کی صحبتِ عیش کو سیرِ نالہ در ہم بر ہم کر دے گا۔ نہیں ایسا نہیں ہے۔ میرا نالہ تو اس کی محفل میں پہنچ کر نغمہ کا کام دیتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ میرے نالہ کو سن کر اور خوش ہوتا ہے۔ میری فریاد سے اس کا عیش کیوں منقطع ہوگا۔

### غزل

عرضِ نازِ شوخیِ دنداں برائے خندہ ہے      دعویٰ جمعیتِ احباب جائے خندہ ہے  
فرماتے ہیں۔ دانتوں کو اپنی شوخی و خوبی پر جس قدر ناز ہے اس کا اظہار کرنا صرف ہنسی کے واسطے ہو کرتا ہے یعنی ہنسنے کے وقت دانت نظر آجاتے ہیں۔ احباب کی جمعیت و اتفاق کا دعویٰ کرنا اور اس پر بھروسہ کرنا ہنسی کے قابل بات ہے۔ یہاں یہ ہے کہ میں طرح بٹھلچھا دانت ایک دوسرے سے علیحدہ ہو جاتے ہیں اسی طرح دوستوں میں بھی بُدلتی پیدا ہو جایا کرتی ہے۔  
ہے عدم میں غنچہ محوِ عبرتِ انجامِ گل      یکجہاں زانو تا مل در قفائے خندہ ہے  
فرماتے ہیں غنچہ کھل جانے کے بعد صدمہ ہو گیا ہے یعنی گل بن گیا ہے اور گل بن کر اس پہنچ میں مبتلا ہو گیا کہ دیکھیے گل بن جانے کا انجام کیا ہوتا ہے لیکن اس فکر و تامل کی مقدمہ رملت زانو بدلے تک کی مدت ہے۔ یعنی فکر اور سوچ کے وقت انسانی سر پہ زانو ہو جاتا ہے اور تھوڑی دیر میں تھک جانے کے بعد زانو بدل لیتا ہے یا سر کو زانو پر سے اٹھا لیتا ہے۔ گویا اتنی ہی دیر میں معمول کو اپنا انجام نظر آ جاتا ہے اور وہ گٹلا جاتا ہے یا بٹھڑ جاتا ہے۔

گلفتِ افسردگی کو عیشِ مبتلا بی حرام      ورنہ دنداںِ دلِ افشردن بنائے خندہ ہے  
فرماتے ہیں۔ افسردگی دل کے وقت بیتاب و بے صبر ہو جانا حرام ہے ورنہ بیتاب ہو کر دل کو

دانتوں سے چبا ڈالنا۔ افسردگی اور انقباض کو فوراً مٹا سکتا ہے۔ یعنی جب دل کو زخمی کر دیا تو زخم خندہ اس سے حاصل ہوا۔ مطلب یہ ہے کہ افسردگی خاطر ایسی مصیبت ہے کہ جس کے مقابلہ میں میتابی و بے صبری گویا عیش کا حکم رکھتی ہے۔  
 سوزش باطن کے ہیں اجاب نگر ورنہ یوں دل محیط اگر یہ و لب آشنائے خندہ ہے  
 فرماتے ہیں۔ ہمارے اجاب ہماری سوزش یا طوہر یعنی خضوع و خشوع کے منکر ہیں ورنہ ہمارا  
 دل درد و سوز سے بھرا ہوا ہے اور ہمارے لب آشنائے خندہ ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ظاہر  
 میں نہانہ حالت رکھتے ہیں اور باطن میں صاحبِ وجد و حال ہیں۔

### غزل

حُسن بے پروا خریدار متاعِ جلوہ ہے آئینہ زانوئے فکرِ اختراعِ جلوہ ہے  
 فرماتے ہیں۔ باوجودیکہ حُسن بے نیاز اور بے پروا ہے لیکن پھر بھی اس کو ظاہری آرائش  
 اور جلوہ گری کی خواہش و آرزو رہتی ہے اور آئینہ اس کے واسطے زانوئے فکر کا کام دیتا  
 ہے یعنی آرائشِ حُسن میں نئے نئے ایجاد کرنے کی فکر آئینہ ہی دیکھ کر ہوا کرتی ہے۔ فکر کے وقت  
 سر زانو ہو جاتا عادت میں داخل ہو گیا ہے۔

تا کجا اے آئینی رنگِ تماشا بافتن چشمِ داغ ویدہ آغوش و دایعِ جلوہ ہے  
 فارسی میں رنگِ بافتن اور رنگِ شکستن رنگ بدلنے کے معنی پر استعمال ہوتا ہے اور  
 یہاں تماشا سے مراد تماشا کے عالم ہے۔ فرماتے ہیں۔ اے آگاہی تو کب تک رنگِ  
 تماشا کو بدلتی رہے گی اور کس وقت تک تماشا کے عالم کی موجودہ کیفیت میں مشغول  
 و محو رہے گی کھلی ہوئی آنکھ یعنی چشمِ تماشا کی جلوہ کے رخصت کرنے کے لئے گویا آغوش  
 و دایع ہے یعنی عالمِ بے ثبات پر چشمِ تماشا دا کرنا گویا اس کے رخصت کرنے کے لئے  
 آغوش کشائی ہے۔

## غزل

جب تک دہان زخم نہ پیداکرے کوئی مشکل کہ تجھ سے راہ سخن واکرے کوئی  
صوفیا کی اصطلاح میں محادثت اور مسافرت (یعنی عبد و مہبود کے درمیان گفتگو ہوتی،  
دو مرتبے ہیں جو کالمین اور عرفا کو حاصل ہوتے ہیں۔ کتاب کے شاہد حقیقی کے ساتھ اس  
معمولی لب و دہن سے بات چیت نہیں ہو سکتی، بلکہ اس کے لئے دہانی زخم پیدا کرنا چاہیے  
جب تک دل تیغ عشق سے مجروح نہ ہو، یہ مرتبہ حاصل نہیں ہو سکتا۔

عالم غبار وحشت مجنوں ہے سر بسر کب تک خیال طرہ لیلے کرے کوئی  
فرماتے ہیں۔ سہمی عالم ایک خاموش سراپ ہے کب تک دھوکہ میں پڑ کر اس کو موج دریا  
سمجھنے رہیں گے۔

افسردگی نہیں طلب افزائے التفات ہاں دردِ بن کے دل میں گر جا کرے کوئی  
فرماتے ہیں۔ افسردہ خاطر ایسی چیز نہیں ہے جس کو دیکھ کر معشوق اپنے عاشق پر نظر التفات  
ڈال کر خوشی پیدا کر دے۔ البتہ عاشق کے لئے یہ مناسب ہے کہ وہ سراپا دردِ بن جائے،  
اس وقت معشوق التفات ہو سکتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ عاشق کی افسردہ خاطر دیکھ کر  
معشوق یہ سمجھتا ہے کہ یہ شخص بالہوس ہے جو عشق کی سختی سے دل برداشتہ ہو گیا۔ اس  
خیال سے وہ بھی بے پرواہی اور کم توجہی ظاہر کرتا ہے۔ ہاں سراپا دردِ بن کہ معشوق کے  
سامنے اگر عاشق پیش ہو تو معشوق اس کو نظر التفات سے دیکھے۔

رونے سے اے ندیم ملامت نہ کر مجھے آخر کبھی تو عقدہ دل واکرے کوئی  
فرماتے ہیں۔ اے ندیم مجھ کو دل کھول کر رونے سے نہ روک اور بڑا بھلا نہ کہ انسان  
شرط ہے کبھی تو دل کی گرہ کھلنی چاہیے۔

چاک جگر سے جب رہ پریش نہ واہوئی کیا فائدہ کہ جیب کو رُسوا کرے کوئی  
فرماتے ہیں۔ عشق میں ہم نے اپنے جگر کو اس لئے چاک کیا تھا کہ وہ ہمارا حال دیکھ کر ہمارے

حال کی پُرسش فرماتے۔ یہ بات نہ ہوئی۔ اب گریباں پھاڑ کر اپنے کو رُسوا اور بدنام کرنے سے کیا فائدہ ہے۔

لخت جگر سے جو رگ ہر خار شاخ گُل تاجند باغبانی صحرَا کرے کوئی  
فرماتے ہیں صحرا فردی کے عالم میں میرے جگر کے ٹکڑے جو آئندہ دُور میں میری آنکھوں سے  
پھینکے اور ان سے جنگل کا ایک ایک کانٹا شاخ گُل بن گیا۔ اب صحرا کی بہاریں اور کون سی بات  
باقی رہی جو کوئی باغبان بن کر جنگل کی آوازیں بڑھانا ہے۔

ناکامی نگاہ ہے برق نظارہ سوز تو وہ نہیں کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی  
فرماتے ہیں۔ طور پر جس صاعقہ نے گر کر نگاہ میں خیرگی پیدا کر دی تھی۔ وہ تیرا جلوہ نہ  
تھا بلکہ ہماری ناکامی نگاہ برق بن کر طور پر گری تھی۔ تو اور تیرا جلوہ ایسا نہیں ہے کہ کسی  
مشاق جمال کے دیکھنے میں آسکے۔ مطلب یہ ہے کہ نہ ہوئی نے تیرا جلوہ دیکھا نہ اور کوئی تجھ کو  
دیکھ سکتا ہے۔

ہر سنگِ خشتِ بصدق گو ہر شکست نقصاں نہیں جنوں جو سودا کرے کوئی  
فرماتے ہیں۔ لڑکے جو ڈھیلے اور پتھر سر بر مارتے ہیں۔ وہ گویا ایک صدق ہے جس کا موتی  
زخم سر کھجا جاتا ہے اس نے جنوں کا سودا اپنے سر لینے میں کسی قسم کا نقصان واقع نہیں ہوتا۔  
سر بر ہوئی نہ وعدہ صبر آزمائے عمر فرصت کہاں کہ تیر کی تمنا کرے کوئی  
یعنی ساری عمر تو صبر کی آزمائش ہی میں گزر چکی پھر تیرے ملنے کی تمنا کس وقت کی جاتی  
(از یادگار غالب)

ہے وحشتِ طبیعت ایجادِ پاس خیز یہ درد وہ نہیں کہ نہ پیدا کرے کوئی  
فرماتے ہیں۔ معنی آنکھنی اور اخلاقی مضامین اور ایجادِ نہ دردِ بیان اور اختراعِ بندش  
الفاظ کچھ ایسا وحشی فحش ہے جس سے ہمیشہ پاس پیدا ہوتی ہے۔ بایں ہمہ سب لوگ اس  
مرض میں مبتلا ہیں۔ گویا یہ درد ایسا نہیں ہے کہ اس کو کوئی پیدا نہ کرے۔ مطلب یہ ہے کہ



شاعری ایک بہت دشوار کام ہے لیکن اس میں مزاج بھی ایسا ہے کہ ہر شخص اس کی طرف رغبت رکھتا ہے۔

بیکاری جنوں کو ہے سرپیٹنے کا شغل جب ہاتھ ٹوٹ جائیں تو پھر کیا کرے کوئی فرماتے ہیں۔ جنوں کے لئے ایک نہ ایک شغل لازمی اور ضروری ہے۔ جب تک جسم پر لباس رہا اگر بیاں چاک کرتے رہے۔ جب تار تار جدا ہو گئے سرپیٹنے کا شغل مل گیا بیکاری پیٹنے جیسے گھبراہٹ کی دامن و گریباں کی دھجیاں اڑ چکیں۔ شغل کے لئے سرپیٹنا شروع کر دیا۔ اب دیکھنے کی یہ بات ہے کہ اگر ہاتھ بھی ٹوٹ جائیں تو کوئی کیا کرے۔

حسن فروغ شمع سخن دور ہے آسہ پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی فرماتے ہیں۔ پہلے شمع کی طرح دلِ گداختہ کوئی پیدا کرے تو اس کے بعد فروغ شعلہ سخن کی تمنا اور آرزو کرے۔

### غزل

ابن مریم ہوا کرے کوئی میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

فرماتے ہیں۔ اگر کوئی اپنے زمانے کا سیما ہے تو میری بلا سے ہوا کرے۔ میں تو جب اس کا قاتل ہوں کہ میرے درد و محبت کی کوئی دوا کرے۔

شرع و آئین پر مدار سہی ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی

فرماتے ہیں۔ ہم نے یہ ماننا کہ آج کل زمانہ میں شرع کی پابندی بھی ہے اور قانون گوؤرنمنٹ بھی جاری ہے جس کے ذریعہ سے قاتل کو موت کی سزا دی جاتی ہے۔ مگر ایسے قاتل کا کوئی کیا کر سکتا ہے جو بغیر تلوار کے عشاق کو قتل کر دیتا ہے، یعنی تیغ نگاہ یا تبر نظر سے۔

چال جیسے کڑی کمان کا تیر دل میں ایسے کے جا کرے کوئی

فرماتے ہیں۔ ایسے معشوق کے دل میں جگہ پیدا نہیں کی جاسکتی جس کی بے اعتنائی کی

چال کڑی کمان آگے تیرے مشابہت رکھتی ہے۔ مصرعہ اولیٰ تمام کمال محاورہ ہے کمان میں تہہ رنخت ہوگی آتنا ہی تیر تیز پرواز ہوگا۔

بات پرواں زبان کھیتی ہے وہ کہیں اور سُنا کرے کوئی فرماتے ہیں۔ ان کے خلاف اگر کچھ کہا جاتا ہے تو اس جرم میں وہ زبان کاٹ لیتے ہیں اس لئے ان کی بات خواہ درست ہو یا نادرست خاموشی کے ساتھ سننی چڑتی ہے یہ کسی کی طلاق نہیں ہے کہ اُن سے یہ کہہ سکے کہ تم یہ بات غلط کہتے ہو۔ بے مثل شعر کہا ہے۔

جب رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی فرماتے ہیں۔ جو شخص کے عالم میں بڑے بڑے راز بیان کر رہا ہوں۔ خدا کرے میرے کہنے کو کوئی سمجھے نہیں۔ جس طرح مجھ کو باپنی بڑی بہت سی کام کی باتیں بیان کر جاتے ہیں اور عام لوگ ان باتوں سے کچھ مطالب نہیں نکال سکتے۔

نہ سنو گز بُرا کہے کوئی نہ کہو گز بُرا کہے کوئی فرماتے ہیں۔ اخلاق کی یہ خوبی ہے کہ اگر کوئی شخص تم کو بُرا بھلا کہے تو اُس کے کہنے پر توجہ نہ کرو اور اگر کوئی بُرا کام کرے تو تم اس کو معصومِ خلاق نہ کرو۔

روک لو گز غلط چلے کوئی بخش دو گز خطا کرے کوئی فرماتے ہیں۔ اگر کوئی شخص غلط راستے پر چل رہا ہو تو تم اُسے فوراً روک دو اور اس کی غلطی اس کے ذہن نشین کر دو اور اگر کوئی شخص تمہاری کچھ خطا کرے تو تم فوراً اسے بخش دو۔

کون ہے جو نہیں ہے حاجتمند کس کی حاجت روا کرے کوئی فرماتے ہیں۔ زمانے میں ہر شخص حاجتمند ہے۔ اگر دولت پر کوئی کسی کی مدد نہ کر سکے تو اس سے بگڑ مند نہ ہونا چاہیے بلکہ یہ سمجھنا چاہیے کہ دوسرا بھی ہماری طرح سے کوئی ضرورت رکھتا ہوگا۔

کیا کیا خضر نے سکندر سے اب کسے رہنا کرے کوئی

اس شعر میں خضر و سکندر کے مشہور قصہ کی طرف اشارہ ہے۔ حضرت خضر سکندر کو چشمہ آبِ حیاں پر لے گئے تھے۔ سکندر نے یہ دیکھ کر کہ چشمہ کے گرد بہت سے آدمی چلے پھرنے لگے، خضر نے اسے معذور و معذور گوشت کی طرح زمین پر پڑے ہوئے تھے۔ آبِ حیات نہ پیا فرماتے ہیں۔ حضرت خضر نے سکندر کی کیا مدد کی۔ باوجود رہنمائی کے سکندر آبِ حیا سے محروم واپس آگیا اور تھوڑے ہی عرصہ کے بعد دنیا سے چل بسا۔ اب کوئی کسی کو کیا رہنا بنائے۔

جب توقع ہی اٹھ گئی غالب کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی

فرماتے ہیں۔ توقع کی صورت میں گلہ شکوہ بھی اسے غالب زیبائے، یاوسی کی حالت میں کیوں کسی کا گلہ کیا جائے۔

غزل

بہت سہی غم گیتی شراب کم کیا ہے غلامِ ساقی کو تر ہوں مجھ کو غم کیا ہے  
فرماتے ہیں۔ یہ میں نے مانا کہ دنیا میں غم درج بہت ہیں مگر غم کے مقابلہ میں شراب بھی مقدار میں کم نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ غم دنیا بھلانے والی چیز شراب ہے اور میں چونکہ ساقی کو شرکا غلام ہوں اس لئے مجھ کو شراب کے حاصل کرنے کی فکر نہیں ہے، ابد اللہ باد کم برابر ملے جلے گی، یہاں بھی بیتار با اود وہاں بھی بیتار ہوں گا۔

رِقیب پر ہے اگر لطف تو ستم کیا ہے تمھاری طرز و روش جاننے میں ہم کیا ہے  
فرماتے ہیں۔ تمھاری عادت سے ہم خوب آگاہ ہیں کہ تم رخک کی آگ عاشق کے دل میں بھڑکا دیا کرتے ہو۔ رقیب پر تمھارا لطف کرنا ہمارے لئے ستم کا حکم رکھتا ہے۔ یعنی یہ لطف جو تم رقیب کے حق میں برتتے ہو وہ ہمارے واسطے ستم بن جاتا ہے۔

کے ٹو شب کہیں کاٹے تو سانپ کھلاؤ کوئی بتاؤ کہ وہ زلفِ خم بہ خم کیا ہے

فرماتے ہیں۔ تمہاری زلفت ختم بہ ختم کی یہ دونوں صفیں ہیں۔ یعنی درازی میں وہ خُشبِ فرقت کے برابر ہے اور اس کی محبت ایسی زہریلی ہے کہ اس میں سانپ کے کاٹنے کا اثر ہے۔ اب کون بنا سکتا ہے کہ وہ درحقیقت ہے کیا چیز۔

لکھا کہ کوئی احکام طالع مولود کسے خبر ہے کہ واں جنبش قلم کیا ہے فرماتے ہیں۔ یہ جو اہل تجیم بچہ کی پیدائش کے وقت اس کا زائچہ بنا کر احکام لکھتے ہیں یہ بے فائدہ ہیں کسی کو معلوم نہیں کہ کاتب قسمت نے اس کی تقدیر میں کیا لکھ دیا ہے۔ نہ حشر و نشر کا قائل نہ کیش و ملت کا خدا کے واسطے ایسے کی پھر قسم کیا ہے فرماتے ہیں۔ وہ کافر بکیش شرط اسلام کے موافق نہ قیامت کے آنے کا قائل ہے اور نہ کسی مذہب و ملت کا ماننے والا ہے۔ پھر خدا کے واسطے ایسے شخص کی قسم کا کیا اعتبار رکھتا ہے وہ داد و دید گر انما یہ شرط ہے ہمدَم و گر نہ مہر سلیمان جام و حشم کیا ہے فرماتے ہیں۔ اے ہمدَم اس کشش الہی اور اس تماشائے عالم کا دیکھنا عجائبات کی قدر و قیمت کا باعث ہو سکتا ہے۔ وگر نہ بے دیکھے ہم نہیں سمجھ سکتے کہ مہر سلیمان اور جام حشم کیا چیز ہیں۔

سخن میں خامہ غالب کی آتش افشانی یغین بزم کو بھی لیکن اباسمیں دم کیا ہے فرماتے ہیں یغین سخن میں خامہ غالب کی جادو نگاری کے ہم قائل تو ضرور ہیں لیکن اب اس میں بڑے ہو جانے کی وجہ سے کچھ دم نہیں رہا ہے۔

### غزل

بارغ پاکِ خفقانی یہ ڈراتا ہے مجھے سایہ شاخ گل افنی نظر آتا ہے مجھے فرماتے ہیں۔ بارغ نے جو مجھ کو خفقانی مزاج پایا ہے تو وہ اب مجھے ڈراتا ہے گویا سایہ شاخ گل افنی بن کر مجھ کو نظر آتا ہے۔ خفقانی آدمی اکثر اپنے دہم کی وجہ سے ڈر جائیگا کہ یہ مطلب یہ ہے کہ بارغ میں بچوں کی تروتازگی دل کشی کا اثر رکھتی ہے اور انجامِ محبت جاں گل

جو ہر تیغ پہ سر چستہ دیگر معلوم میں وہ سبزہ ہوں کہ زہر آب گاتا ہے مجھے  
 فرماتے ہیں۔ جو ہر شیریں جس طرح زہر آب کے چھڑکنے سے ابھرتا ہے اسی طرح میں وہ سبزہ ہوں  
 جس کی نشو و نما غم و غصہ سے ہوئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میری مرثیت میں غم و غصہ ہے۔  
 مدعا محو تماشا کے شکستِ دل ہے آئینہ خانے میں کوئی لے جاتا ہے مجھے  
 فرماتے ہیں۔ میرے مدعا کی دشواریوں اور سختیوں نے میرے دل کو توڑ دیا ہے اور میرا مدعا  
 میرے دل کے ٹوٹنے ہوئے ٹکڑوں کا تماشا بن گیا ہے۔ دل جب ثابت تھا تو آئینہ تھا۔  
 آئینہ ٹوٹ کر بہت سے آئینے پیدا ہو گئے ہیں اور اس وجہ سے میرا پہلا آئینہ خانہ بن گیا ہے۔  
 نالہ سرا یہ ایک عالم و عالم کھنکھاک آسماں بیضہ قمری نظر آتا ہے مجھے  
 فرماتے ہیں۔ سارے عالم کا سرا یہ صرف نالہ ہے اور خود عالم ایک مشت خاک ہے اور آسمان  
 بیضہ قمری یعنی چمک دینا نالہ کشی کے سوا کچھ نہیں ہے گویا دنیا دار محض ہے اور آسمان نالہ  
 کا پیدا کرنے والا جس قدر تکلیفیں اور مصیبتیں دنیا میں پیدا ہوتی رہتی ہیں ان سب کو  
 آسمان پیدا کرتا رہتا ہے۔

زندگی میں وہ محفل سے اٹھادیتے تھے دیکھوں اب مر گئے پر کون اٹھاتا ہے مجھے  
 فرماتے ہیں۔ زندگی میں تو وہ مجھ کو اپنی محفل سے اٹھا دیا کرتے تھے اب مردانے کے بعد  
 مجھ کو دیکھنا ہے کہ کون اٹھاتا ہے۔ یہاں اٹھانے کے لفظ نے دو معنی پیدا کر دیئے ہیں۔  
 ایک یہ کہ دیکھوں اب ان کی محفل سے کیونکر میں اٹھایا جاسکتا ہوں اور دوسرے یہ کہ  
 اب میرا جنازہ کون اٹھاتا ہے۔

قطعہ

روندی ہوئی ہے کوکبہ شہریار کی اترائے کیوں خاک سرِ رنگدار کی  
 کوکبہ خادمان شاہی جو اردلی میں رہتے ہیں۔ باقی شعر کے معنی صاف ہیں۔  
 جب اُس کے دیکھنے کے لئے آئیں بادشاہ لوگوں میں کیوں خود نہ ہوا لالہ زار کی

بہار کے موسم میں سیر لادزار کے واسطے اکثر بادشاہ تشریف لایا کرتے تھے۔  
 بھوکے نہیں ہیں سیر گلستان کے ہم دولے کیونکر نہ کھائے کہ ہوا ہے بہار کی  
 فرماتے ہیں۔ ہم کچھ سیر گلستان کے بھوکے نہیں ہیں، یعنی لذات دنیا کی خواہش نہیں  
 رکھتے لیکن بہار کا موسم بھی ایک نعمت اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی ہے، اس لئے اس کی سیر  
 ضرور کر لینی چاہئے۔

### غزل

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش چمکے بہت نکلی مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلی  
 خواہش پر دم نکلتا۔ اس کے پورے ہونے کے لئے جلدی کرنی چنانچہ کہتے ہیں کیوں دم  
 نکلا جاتا ہے یا کیوں مرے جلتے ہو یعنی کیوں جلدی کرتے ہو پہلے مصرع میں مفتضائے  
 مقام یہ الفاظ کہ دل میں باقی ہیں، مقدر ماننے چاہئیں۔ باقی شعر کے معنی صاف ہیں  
 (از یاد نگار غائب)

ڈرے کیوں میرا قاتل کیا رہ گیا اسکی گردن سے وہ خون جو چشم تر سے عمر بھر پوٹوں مبدم نکلی  
 فرماتے ہیں۔ میرا قاتل مجھے قتل کر کے ڈرتا کیوں ہے۔ میرا خون میرے جسم میں تو رہا ہی نہیں  
 آنسوؤں کے ساتھ آنکھوں سے ہمیشہ نکلتا رہا ہے۔ قاتل کی گردن پر کیا رہ سکتا ہے۔  
 نکلتا فکد سے آدم کا شنیٹے آئے میں لیکن بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلی  
 دوسرے مصرع میں بہت کے لفظ پر زور دینا چاہئے تاکہ آدم کی نسبت زیادہ بے آبروئی  
 کے ساتھ نکلتا ثابت ہو۔ بہت خوب شعر لکھا ہے۔

بہم کھل جائے ظالم تیرے قامت کی دلازی اگر اس طرف ریح و خم کا بیج و خم نکلی  
 فرماتے ہیں۔ اے ظالم لوگ تجھ کو سر دقت اسی وقت تک سمجھے ہوئے ہیں جب تک  
 تیری رخصتیں خم دار ہیں۔ اگر ان کے گھونگھر کھول دیئے جائیں گے تو میرا قد چھوٹا نظر  
 آنے لگے گا۔

مگر لکھوائے کوئی اس کو خط تو ہم دیکھو گئے ہوئی صبح اور عصرے کان پر کھڑے قلم نکلے  
 فرماتے ہیں۔ ہمارا مشوق عالم آشنا ہے۔ اکثر لوگوں سے اور اس سے خط و کتابت ہوتی ہے  
 مضامین خطوط معلوم کرنے کی تدبیر اس سے بہتر اور کوئی نہیں ہے کہ ہم نامہ نویسی کریں اور  
 ہر شخص کے دعائے دلی سے خبردار ہوتے رہیں۔

ہوئی اس دور میں غصہ مجھ سے بادہ آشیا پھر آیا وہ زمانہ جو جہاں میں جام جم نکلے  
 فرماتے ہیں۔ اگلے وقتوں میں شراب خوری کے واسطے جمشید اور اس کا جام مخصوص تھا  
 جو آج تک ضرب اشل چلا آتا ہے۔ اس زمانہ میں حریف جم میں ہوں۔ اب میرے جم سے  
 جام جم کی شہرت ہوگی۔

ہوئی بجن سے توقع خشکی کی داد دینے کی وہ ہم سے کبھی زیادہ کشتہ تیغ ستم نکلے  
 فرماتے ہیں۔ ہم جن لوگوں کو اپنی کار براری کا ذریعہ سمجھتے تھے جب ان کو ٹوٹل گر دیکھا تو  
 وہ لوگ ہم سے زیادہ ظلم فلک کے شاکی نظر آئے۔

محبت میں نہیں بے فرق جینے اور مرنے کا اسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کا فریہ دم نکلے  
 محبت میں مرنے جینے کا امتیاز باقی نہیں رہا ہے جس کو دیکھ کر روح نازہ ہوتی ہے اسی  
 کا فریہ ہمارا دم بھی نکلتا ہے۔ حال زمین شکر کھا ہے۔

کہاں میخانہ کا دروازہ غالباً کہاں واعظ پرانا جانتے ہیں کل دھجاتا تھا کہ ہم نکلے  
 یہ مقطع میرزا صاحب کے نشتروں میں کا ایک نشتر ہے۔ بیابانی میں ایک عجیب شوخی برتی ہے  
 فرماتے ہیں۔ اس بات سے تو ہم کو بھی تعجب ہے کہ میخانہ کے دروازہ سے اے غالب واعظ  
 کو کیا تعلق۔ مگر اتنی بات ضرور ہے، کل کے روز ہم میخانہ سے باہر نکلے تو ہم نے یہ دیکھا کہ  
 واعظ بھی ادھر سے گزر رہا ہے۔ لطف اس شعر میں یہ ہے کہ صاف صاف یہ نہیں  
 بتایا گیا کہ واعظ کہاں جاتا تھا۔ آیا میخانہ میں یا میخانہ کے سائے سے گزر کر کسی  
 اور طرف۔

### قطبہ

کوہ کے ہوں بارِ خاطر گر صدا ہو جائے بے تکلف اب شرابِ جستہ کیا ہو جائے  
 فراتے ہیں۔ اگر ہم آواز کی طرح سبک اور لطیف ہو کر ترپتے ہیں تو بھی کوہ کے بارِ خاطر  
 ہو جاتے ہیں۔ یعنی پہاڑ آواز کو رو کر دیتا ہے جس سے یہ بات پائی جاتی ہے کہ ہم پہاڑ  
 کے بارِ خاطر تھے اس نے ہم کو قبول نہ کیا اور واپس کر دیا۔ اسے شرابِ جستہ اگر ہم  
 تیری طرح خود رفتہ دبے تکلف ہو کر ترپتے تو خبر نہیں ہمارا کیا حشر ہوتا۔ مطلب  
 یہ ہے، جہاں تک ممکن ہو حالت اضطراری کو ضبط کرنا چاہیے۔ شرابِ جستہ سے نکلتا  
 ہے۔ اور صدا پہاڑ سے ٹکرا کر لیٹ آتی ہے۔

بیضہ آساننگ بال و پر ہے یہ کچھ نفس از سر نو زندگی ہو کر رہا ہو جائے  
 فراتے ہیں۔ جس طرح بیضہ سے پرنس پیدا ہو کر زندگی کا آغاز کرتا ہے، اسی طرح اس  
 کچھ نفس یعنی بیضہ ملک سے رہا ہو جانے کے بعد نئی زندگی شروع ہوگی۔ مطلب  
 یہ ہے کہ مرجانے کے بعد عالم ارواح میں از سر نو زندگی بسر کرنی پڑے گی۔

### عنزل

مستی بذوق غفلت ساقی ہلاک ہے موج شراب یک مژدہ خوابناک ہے  
 فراتے ہیں۔ ساقی کی غفلت شعاریوں کی ادائیں مستی کو بھی ہلاک کر رہی ہیں اور  
 موج شراب اس ذوق و شوق میں بخود مدہوش ہو کر ساغر کی مژدہ خواب آلود  
 بن گئی ہے۔

جز زخمِ تیغ ناز نہیں دل میں آرزو جیب خیال بھی تھے ہاتھوں چاک ہے  
 فراتے ہیں۔ آرزوئے دل نے زخمِ تیغ ناز کی صورت پیدا کر لی ہے جیب خیال یعنی  
 دل تیرے ہاتھوں سے چاک ہے۔ اور جب دل چاک ہو گیا تو اس میں آرزو کا  
 قیام نامکن ہے۔



جوش جنوں سے کچھ نظر آتا نہیں اسد صحرا ہماری آنکھ میں کیمشت خاک ہے  
 فرماتے ہیں۔ تماشائے صحرا سے اس قدر وزن میں جوش پیدا ہو گیا ہے کہ اب کچھ نظر نہیں  
 آتا گویا صحرا ہماری آنکھ کے واسطے ایک خاک کی چٹکی بن گیا ہے۔ یعنی جس آنکھ میں  
 خاک کے ذرے پڑ جائیں اس کو کیا دکھائی دے سکتا ہے۔

لب عیسیٰ کی جنبش کرتی ہو گوارہ جھپانی قیامت کشتہ لعل بتاں کا خواب سنگین ہے  
 لعل بتاں۔ لب لعل بتاں۔ فرماتے ہیں۔ کشتہ لب عیسیٰ کی نیند کس قیامت کی نیند ہے کہ حضرت  
 عیسیٰؑ کا اعجاز لب بھی اس کو زندہ نہیں کر سکتا۔ جب وہ تم کہتے ہیں تو اس کی نیند اڑ  
 گھری ہو جاتی ہے۔

آہ سیلاب طغیاں صدائے آب ہے نقش پا جو کان میں گھستا ہوا انگلی جادہ سے  
 فرماتے ہیں۔ دنیا میں ہر شے کو فنا کا گھٹکا لگا ہوا ہے۔ چنانچہ نقش پا بھی جادہ راہ کی  
 انگلیاں کانوں میں دے دئے ہوئے پڑا ہے۔ اس کو بھی یہ خوف پیدا ہو گیا ہے کہ ایسا نہ ہو  
 سیلاب آجائے آبشاروں کی آواز سُننی نہیں چاہتا۔ اس لئے اس نے کانوں میں انگلیاں  
 دے لی ہیں اور سمجھتا ہے کہ فصل گل میں نیند برس کر مجھ کو فنا کر دے گا۔

بزم سے وحشت کدہ ہو گس کی چشم مست کا شیشے میں نبض پری نہاں موج بادہ سے  
 فرماتے ہیں۔ بزم سے وحشت کدہ ہو گس کی چشم مست نے وحشت کدہ بنا دیا ہے کہ موج خراب  
 نبض پری بیکر شیشے میں پوشیدہ ہو گئی ہے۔ گویا پری انسان سے وحشت کر کے شیشے  
 میں بند ہو گئی ہے۔

ہوں میں بھی تماشائی نیزنگ تمنا مطلب نہیں کچھ اس کے مطلب بھی برائے

فرماتے ہیں۔ میں تو صرت نیزنگ تماشا کا تماشا ٹائی ہوں یعنی یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ تماشا کیا کیا رنگ بدلتی ہے اور دل کو کس قسم کی لذت بخشتی ہے۔ میری مراد یہ نہیں ہے کہ میری مراد ہی پوری ہو۔

سیاہی جیسے گرجادے دم تحریر کا انداز مری قسمت میں تو تصویر شہا بجران کی فرمانے ہیں جس طرح کھنے کے وقت سیاہی گر کر حرفوں کو چھپا لیتی ہے اسی طرح میرے نوشتہ قسمت میں شہائے بجران کی تصویر کھینچ دی گئی ہے مطلب یہ ہے کہ جذباتی کی رگوں نے میری نوشتہ قسمت کو ایسا اچھا پایا ہے کہ مجھے یہ معلوم ہی نہیں ہو سکتا کہ آئندہ میری قسمت میں کیا لکھا ہے۔

### غزل

بھوم نالہ حیرت عاجز عرض کیا افغانا ہے خموشی ریشہ صد فیستاں خس بد مذاں ہے فرمانے ہیں۔ باوجود بھوم نالہ کے حیرت نے عرض نفاں سے عاجز کر دیا ہے۔ گویا خموشی نے فیستاں کو جس میں سینکڑوں بانسریاں موجود ہیں خس بد مذاں کر رکھا ہے مطلب یہ ہے کہ باوجود قوت گوئی کے رازداری کے محاکات نے لب سی دیئے ہیں۔

مکلف بطریق جانستاں شلف بد خواباں نگاہ بے حجاب ناز تیغ تیز عریاں ہے فرمانے ہیں۔ مشوقوں کا لطف تسم سے بھی زیادہ جانستاں ہے۔ گویا نگاہ ناز ایک شمشیر آبدار ہے اور جب وہ بے حجاب ہو گئی تو تیغ عریاں بن گئی۔ اب اس کو قتل کرنے میں کیا حجاب باقی رہا۔

ہوئی یہ کثرت غم سے تلف کیفیت شادی کہ صبح عید مجھ کو بد تر از چاک گریباں ہے فرمانے ہیں۔ کثرت غم سے اس قدر کیفیت شادی مٹ گئی ہے کہ میری نگاہ میں صبح عید چاک گریباں سے بھی زیادہ بد تر ہے۔

دل وین نقد لاسا ساقی سو گرسودا کیا چاہے کہ اس بازار میں ساغر ستارِ دست گردان  
دست گردان اس چیز کو کہتے ہیں جو نقد قیمت پر کہتی ہو۔ فرماتے ہیں۔ اگر ساقی بیخانہ عشق سے شرب  
محبت کی خریداری منظور ہے تو دل و دین کو فوراً دے کر اس سے سودا چٹائے اس بازار میں مہنی  
بازار عشق میں ساغر محبت کی قیمت پہلے وصول کر لی جاتی ہے۔

غم آغوشِ بلا میں پرورش دیتا ہر عاشق کو چراغِ روشن اپنا قلم صرصر کا مرجان ہے  
فرماتے ہیں۔ غم عشق آغوشِ بلا میں عاشق کو پرورش کیا کرتا ہے۔ قاعدہ ہے ہوا سے چراغ گل ہو جایا  
کرتا ہے لیکن طوفانِ اب دریا میں مرجان کا چراغ نہیں بجھا کرتا ہے، اسی طرح عاشق کا چراغ بھی  
صرصر کے طوفان میں روشن رہا کرتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ عاشق کا تکلیف اور مصیبت سے  
کچھ نہیں بگڑتا۔

### قطعہ

خوشیوں میں تماشا ادا نکلتی ہے نگاہِ دل سے ترے سر پہ سا نکلتی ہے  
سر پہ کمانے سے کوڑا پیٹہ جایا کرتی ہے۔ فرماتے ہیں۔ تیری خاموشیوں میں بھی اک ادائے  
انگمار پائی جاتی ہے۔ گویا تیرے دل کے ارادے سے جو نگاہ نکلتی ہے وہ سر پہ سا نکلتی  
ہے۔ یعنی آواز بے صورت ہوتی ہے۔ عجب خوشی معنی دار دے کہ در گفتن نمی آید۔

فشارِ تنگیِ خلوت سے جنتی ہے شبنم صبا جو غنچہ کے پردہ میں جا نکلتی ہے  
فرماتے ہیں۔ اگر صبا غلظتِ غنچہ میں بھولی کھٹکی جاتی ہے تو غنچہ اس کو آغوش میں لے کر  
ایسا بھیجتا ہے کہ وہ شرم سے پانی پانی ہو کر شبنم بن جاتی ہے۔

نہ بوجھِ سینہٴ معاشق سے آبِ تیغِ نگاہ کہ زخمِ روزنِ در سے ہوا نکلتی ہے  
فرماتے ہیں۔ دل عاشق سے تیغِ نگاہ کی آبداری کا حال نہ پوچھو، یہ دیکھو کہ جس روزنِ در  
سے وہ جھانکتے ہیں اس روزن کو تیغِ نگاہ نے ایسا زخم بنا دیا ہے جس میں سے ہوا نکلنے لگی  
ہے۔ ہوا جس زخم میں سے نکلتی ہے وہ زخم بہت مہلک سمجھا جاتا ہے۔

## غزل

جس جانِ نسیم شانہ کش زلفِ یار ہے نافہ دماغ آہوئے دشتِ تار ہے  
فرماتے ہیں جس سرزمین پر نسیم زلفِ یار کی خوشبو پھیلا دیتی ہے وہاں آہوئے دشتِ تار کا  
دماغ بھی خشک نافہ بن جاتا ہے۔

کس کا سُرائِ غجلوہ ہے حیرت کا اے خدا آئینہ فرش شش جہت انتظار ہے  
فرماتے ہیں سائے خدا یہ تجھے معلوم ہونا چاہیے کہ غیرت کس کے جلوہ کا پتہ لگانا چاہتی ہے جو اس  
مشش جہت انتظار کو آئینہ بند کر دیا ہے اور یہ چاہتی ہے کہ کہیں تو اس کا عکس جلوہ  
نظر آجائے۔

ہے ذرہ ذرہ تنگی جا سے غبارِ شوق! گردِ دام یہ ہے وسعتِ صحرا شکار ہے  
فرماتے ہیں۔ جنگ کی تنگی کی وجہ سے غبارِ شوق ذرہ ذرہ ہو کر پھیل گیا ہے اور بہت سے ذرے  
پریشان ہو کر دام بن گئے ہیں، فضا، صحرا جن کا شکار ہو گئی ہے مطلب یہ ہے کہ غبارِ شوق  
صحرا پر جال کی طرح پھیل گیا ہے۔

دل مدعی و دیدہ بنا مدعا علیہ نظارہ کا مقدمہ پھر رو بکار ہے  
فرماتے ہیں۔ دل نے آنکھوں پر یہ دعویٰ دائر کر دیا ہے کہ ان کی نظارہ بازیوں کے فتور  
سے میں مبتلائے رنج و بلا ہو گیا ہوں۔ میری دادیسی پیشکاه سرکارِ عشق سے ہونی لازم و  
واجب ہے۔

چھڑکے ہے شبنم آئینہ برگ گل پہ آب اے عندلیب وقت و دواعِ بہار ہے  
اس شعر میں میرزا صاحب نے ایران کی رسم کو بیان کیا ہے۔ وہاں یہ قاعدہ ہے کہ جب کوئی  
شخص سفر کرتا ہے تو مسافر کی پشت پر آئینہ رکھ کر اس آئینہ پر پانی چھڑکتے ہیں مطلب یہ  
ہے کہ صحت و عافیت سے عزت و اکبر و کے ساتھ واپس آنا نصیب ہو۔ فرماتے ہیں شبنم آئینہ  
برگ گل پر پانی چھڑک رہی ہے اے بلبل و دواعِ بہار کا زمانہ قریب آگیا ہے۔

تج آپڑی ہے وعدہ دلدار کی مجھے وہ آئے یا نہ آئے یہاں انتظار ہے  
 فرماتے ہیں۔ ہم کو اپنی بات کا نباہنا منظور ہے۔ یعنی مشوق سے جو آئے کا وعدہ لیا ہے وہ  
 اس امر کا متقاضی ہے کہ وہ وعدہ فراموش اپنے اقربا پر نہ آئے مگر ہم کو اس کے انتظار  
 میں رات بھر جاگنے رہنا لازمی ہے۔ یہ شعر بیت الغزل ہے۔

بے پردہ سوئے وادیِ مجنوں گزرنے کہ ہر ذرہ کے نقاب میں دل بیقرار ہے  
 فرماتے ہیں۔ وادیِ مجنوں کا ذرہ ذرہ دل بیتاب کا حکم رکھتا ہے ایسے مقام پر مجھ کو  
 بے پردہ سفر کرنا نہ چاہئے۔

اے عندلیب یک گفن خس ہریشیاں طوفان آمد آمد فصل بہار ہے  
 فرماتے ہیں۔ اے بلبل اگر گل میں تجھ کو باغبان کی نظر سے چھپ کر لطف بہار اٹھا منظور  
 ہے تو ابھی سے دوچار تھکے لے کر اشیانہ بنا کہ در نہ فصل بہار کے جوش و خروش میں  
 سوکھے ہوئے تنکوں کو تر سے گی۔ بہار اگر سارے باغ کو سبزہ زار کر دے گی۔

دل مت گنوا خبر نہ سہی سیرہی سہی اے بے دماغ آئینہ تماشال دار ہے  
 فرماتے ہیں۔ دل کو برباد مت کر اگر وہ معرفتِ الہی سے باخبر نہ ہو نہ سہی۔ سیر کا لطف تو  
 حاصل ہو جائے گا۔ اے بے دماغ آئینہ دل میں جنوں کی تصویریں تو نظر آرہی ہیں۔ اگر  
 بُت خانہ ٹوٹ کر کعبہ نہ بن سکا نہ سہی بُت خانہ میں بھی ایک کیفیت تو موجود ہے۔

غفلت کفیل عمر و اسد ضامن نشاط اے مرگ ناگماں تجھے کیا انتظار ہے  
 فرماتے ہیں غفلت نے تو عمر اسد کی کفالت پر کر بانہ لی ہے اور اسد نے دائمی نشاط کی  
 ضمانت کر لی یعنی یہ سمجھ لیا ہے کہ ہمیشہ عیش و راحت میں زندگی بسر ہوگی اس صورت  
 میں کسی انجام کا خیال بھی نہیں کرنے پاتا۔ اے ناگماںی موت تو کیوں نہیں آجاتی تجھے کس  
 بات کا انتظار ہے۔ میرے خیال میں جو شخص غفلت میں عمر بسر کرے اور اپنی موت کو  
 بھولا رہے انجام کی دردناک برائی کے خیال کو اپنے پاس نہ پھینکنے دے اس کو ناگماںی موت

آجاتی چاہئے۔

## غزل

آئینہ کیوں دوں کہ تماشا کہیں جسے ایسا کہاں کے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے  
فرماتے ہیں۔ میں آئینہ کو تیرے روبرو کیوں نہ پیش کر دوں کہ اس کو دیکھ کر تو حیران  
ہو جائے اور لوگوں کو تیری حیرانی تماشا بن جائے۔ ایسا میں دوسرا کہاں سے پیدا  
کروں کہ جس کو دیکھ کر لوگ تجھ سا کہیں۔

حسرت نے لالہ رکھا تیری بزمِ خیال میں گلدستہ رنگاہ سویدا کہیں جسے  
فرماتے ہیں۔ حسرت نے میرے دل میں کہ وہ تیری بزمِ خیال ہے ایک گلدستہ رنگاہ لاکر  
رکھ دیا ہے جس کو سویدا کہتے ہیں (سویدا اس سیاہ دارغ کو کہتے ہیں جو دل کے اوپر ہے)  
مطلب یہ ہے گویا سویدا دل ایک گلدستہ ہے حسرت بھری نگاہوں کا۔

پھونکا ہے کس نے گوشِ محبت میں لے ڈالا افسون انتظار تمنا کہیں جسے  
فرماتے ہیں۔ اب ہٹا کس نے گوشِ محبت میں ایسا افسون انتظار پھونک دیا ہے کہ جس کو  
تمنا کہتے ہیں تعجب اس بات پر آتا ہے کہ محبت جو تیرے دیرینہ ہوتی تمنا بھی پیدا ہو گئی۔

سر پر بجومِ دردِ غریبی سے ڈالے وہ ایک مشت خاک کہ صحرَا کہیں جسے  
فرماتے ہیں۔ بے وطنی کی تکلیفوں نے مجھ کو ایسا دیوانہ کر دیا ہے کہ میرا جی چاہتا ہے  
دیوانوں کی طرح اپنے سر پر خاک ڈالوں گردہ خاک ایک مٹھی سے زیادہ نہ ہو گا ایسی  
ہو کہ جس کو صحرَا کہیں۔ یعنی لوگ یہ سمجھیں کہ اس نے سارے جگہ کی خاک اٹھا کر سر پر ڈال لی ہے۔

بے چشمِ تر میں حسرت دیدار سے نہاں شوقِ غماں گیسختہ دریا کہیں جسے  
فرماتے ہیں۔ میری چشمِ تر میں حسرت دیدار سے پوشیدہ ایسا آنسوؤں کا جوش بھرا ہوا  
ہے کہ جس کو بے سالفہ دریا کہہ سکتے ہیں۔

درکار ہے شگفتنِ نگہائے عیش کو صبح بہارِ پنبہ مینا کہیں جسے

فرماتے ہیں۔ معمولی صبح بہار سے تو بلوغ کے پھول کھلا کرتے ہیں۔ ہم ایسی صبح بہار کے طالب نہیں ہیں۔ ہم کو تو ایسی صبح بہار کی ضرورت ہے جس سے گلشنِ عیش و نشاط کے پھول کھل جائیں اور اس صبح بہار کو ہنسنے لگتے ہیں۔

غالب بُرا نہ مان جو واعظ بُرا کہے ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے فرماتے ہیں اسے غالب تجھ کو زندہ سمجھ کر اگر واعظ بُرا کہتا ہے تو تو کیوں بُرا مانتا ہے "ایسا آدمی تو دنیا بھر میں کوئی نہ ہوگا جس کو سارا زمانہ اچھا کہے۔ زمانہ کا دستور یہی ہے کہ وہ آدمی کسی کو اچھا کہتے ہیں تو ایک بُرا بھی کہتا ہے۔

### عزل

شبِ نیم بہ گلِ لالہ نہ خالی نہ ادا ہے داغِ دل بے دردِ نظر گاہِ حیا ہے فرماتے ہیں۔ گلِ لالہ پر جو اس کے قطرے نظر آرہے ہیں یہ بھی اندازِ واداسے خالی نہیں ہیں، وہ گویا اس بات کا اشارہ کر رہے ہیں کہ دل میں داغ تو ہے لیکن درد و سوز نہیں ہے اس لئے اس کی ہوندریں عرقِ انفعال کا کام دے رہی ہیں۔ گویا گلِ لالہ اس شرم سے پسینے پسینے ہو گیا ہے۔

دلِ خوں شدہ شمشکِ حسرتِ دیدار آئینہ بدستِ بُت بدستِ حنا ہے فرماتے ہیں۔ حسرتِ دیدار کی شمشک نے دل کو خوں کر دیا تھا اب گویا وہ آئینہ بن کر بُتِ بدستِ حنا کے چہ چہ گیا ہے مگر اس کے ہاتھوں میں بھی اس کے تغافل کا اظہار کر رہا ہے۔ بدستِ حنا سے مراد ایسا معشوق ہے جو ہندی رچالے کے شوق میں از خود دھند ہو گیا ہو۔

شعلہ سے نہ ہوتی ہو شعلہ نے جو کی جی کس قدر افسردگی دل پہ جلا ہے فرماتے ہیں۔ وہ بات شعلہ آتش سے بھی نہیں ہو سکتی جو ہو شعلہ نے دل کے ساتھ کی ہے یہاں شعلہ سے مراد شعلہٴ عشق ہے مطالب یہ ہے کہ جب دل میں شعلہٴ عشق اس حد تک

نہ بھڑک سکا کہ دل بل کر خاک ہو جاتا تو دل کی ناکامی پر جی جل گیا۔  
تمثال میں تیری ہے وہ شوخی کہ بصدِ فوق آئینہ باندازِ گلِ آغوشِ کشا ہے  
فرماتے ہیں۔ تیری تصویر میں بھی ایسی شوخی کوٹ کوٹ کر بھردی گئی ہے کہ اس پر جو آئینہ  
لگا یا گیا ہے وہ پھول کی طرح شوق ہم آغوشی میں آغوش کشا ہو گیا ہے۔

قمری کفِ خاکستر و لیلِ قفسِ رنگ اے نالہ نشانِ جگر سوختہ کیا ہے  
فرماتے ہیں۔ قمری جو ایک کفِ خاکستر سے زیادہ ہستی نہیں رکھتی اور لیلِ جو ایک قفسِ  
رنگ کے سوا وقعت نہیں پاسکتی گر ان کے بولنے اور چکنے سے عالم میں ایک دھوم مچ  
گئی ہے اور سب نے جان لیا ہے کہ قمری سرو کی شیدا ہے اور لیلِ پھول کی عاشق ہو گیا  
جگر سوختہ یعنی عشق کا نشان ان کے ناموں سے ملا ہے۔ میرزا صاحب نے اس شعر میں  
لفظ (اے) کو (جز) کی جگہ استعمال کیا ہے۔

خونے تری افسردہ کیا دھشتِ دل کو معشوقِ وبے حوصلگی طرفہ بلا ہے  
فرماتے ہیں۔ لگا دھشت کے موقع پر تیری کم تو جی اور اغماض کی عادت نے جوشِ عشق  
کو کم کر دیا معشوق بن کر ایسا کم حوصلہ ہونا ایک نئی مصیبت کا سامنا ہے۔

مجبوری و دعویٰ گرفتاریِ کلفت دستِ نہ سنگ آمد و پیمانِ وفا ہے  
فرماتے ہیں۔ عشق بے اختیار ہی شے ہے۔ یعنی ارادے کے ساتھ پیدا نہیں کیا جاسکتا۔  
عشق پیدا ہو جانے کے بعد گرفتاریِ عشق کا دعویٰ کرنا ایک ایسی بات ہے جیسے  
کسی کا ہاتھ ایک بھاری پتھر کے نیچے دب گیا ہے اور وہ یہ کہے کہ میں نے اس پتھر سے  
وفا کا عہد باندھا ہے۔ میں کبھی اپنا ہاتھ پتھر کے نیچے سے نہ کھینچوں گا سوا لاکھ پتھر کے  
نیچے سے ہاتھ کھینچ لینا اسکان سے باہر ہے۔

معلوم ہوا حالِ شہیدانِ گزشتہ تیغِ ستم آئینہ تصویرِ نمسا ہے  
فرماتے ہیں۔ تیرے تلوار کھینچنے اور قتل پر آمادہ ہو جانے سے ہم کو شہیدانِ گزشتہ کا



حال معلوم ہو گیا تیری تیغ ستم آئینہ تصویر نما ہے یعنی جس طرح بیکیسی کے عالم میں تو ہم کو  
 نقل کرنا چاہتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ تو نے اسی طرح اور مظلوموں کے بھی گلے کاٹے ہوئے۔  
 اسے پر تو خورشید جانا تابا دھو بھی سایہ کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہے  
 یہ شرمیرزا صائب کے نشر وں کا ایک ابدار نشر ہے۔ خدا بخشنے حضرت اُستاد دی مولانا  
 حاکمی اس شرکی شرح میں خود تحریر فرماتے ہیں۔ یہ خطاب ہے آفتاب حقیقت کی طرت  
 کتاب ہے کہ جیسا سایہ متم بوجہ ہے اور فی الواقع اس کی کچھ ہستی نہیں ہے۔ اسی طرح  
 ہم بھی اس دھوکے میں پڑے ہیں۔ اگر آفتاب حقیقت کی کوئی جھلکی ہم پر لمبہ انگن ہو جائے  
 تو یہ دھوکہ جاتا رہے اور ہم فنا فی اللہ ہو جائیں اس لئے کہ جہاں آفتاب چمکا اور سایہ  
 کا نور ہوا۔

ناکر وہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد یا رب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے  
 یعنی جو گناہ ہم نے کئے ہیں اگر ان کی سزا طنی ضرور ہے تو جو گناہ بسبب عدم قدرت کے ہم نہیں  
 کر سکے اور ان کی حسرت دل میں رہ گئی ان کی داد بھی ملنی چاہئے (از یادگار غائب)  
 بیگانگی خلق سے بے دل نہ ہو غائب کوئی نہیں تیرا تو مری جان خدا ہے  
 دلاتے ہیں۔ اسے غائب لوگوں کی کم توجہی سے تو بے دل کیوں ہوتا ہے۔ اگر دنیا میں کوئی تیرا  
 معاون و مددگار نہیں ہے تو نہ ہو خدا تو ہے۔

غزل  
 منظور تھی یہ شکل تجلی کو نور کی قسمت کھلی ترے قد و رخ سے ظہور کی  
 نعمت میں ہے۔ فرماتے ہیں۔ تجلی انہی کو تیری نورانی صورت ظاہر ہونا منظور تھا۔ گویا تیرے  
 قد و رخ کے حسن و دلکشی سے ظہور کی قسمت کھل گئی۔

اک خونچکاں کفن میں کروڑوں شافہیں پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی  
 یہ شعر حقیقت و مجاز دونوں پہلو رکھتا ہے مگر بہ نسبت مجاز کے حقیقت پر زیادہ مہیاں

ہے۔ (از یادگار غالب) میرزا کے خشتروں میں کا ایک خشتیہ شعر بھی ہے۔

واعظ نہ تم یہو نہ کسی کو پلا سکو کیا بات ہے تمہاری شراب ظہور کی  
 فرماتے ہیں۔ اسے داعظ نہ تم خود پی سکتے ہو اور نہ کسی کو پلا سکتے ہو اور تعریف اس شہد  
 کے ساتھ کرتے ہو تو معلوم ہوا تمہاری شراب ظہور صرف خیالی شراب ہے جس کے بیان  
 سے اپنا دل خوش کر لیتے ہو۔ نئی قسم کی شوخی برقی ہے اور بہت مزے کا شعر کہا ہے۔  
 لڑتا ہے مجھ سے حشر میں قاتل کہ کیوں اٹھا گویا ابھی سنی نہیں آواز صویر کی  
 فرماتے ہیں۔ مجھ سے میرا قاتل حشر میں لڑتا ہے کہ تو بغیر میرے حکم کے کیوں زندہ ہو گیا یعنی  
 میں نے تجھ کو قتل کیا تھا میں اٹھتا تو اٹھتا اور سلامتی سے تھاقا کا یہ حال ہے گویا ابھی  
 تک صویر کی آواز بھی نہیں سنی ہے۔

آمد بہار کی ہے جو بیل ہے نغمہ سنج اڑتی سی اک خبر ہے زبانی طہور کی  
 فرماتے ہیں۔ بیل کی نغمہ سنجی بے سبب نہیں ہے معلوم ایسا ہوتا ہے کہ بہار اب آنے والی ہے  
 اگرچہ کامل یقین تو ہو نہیں سکتا اس لئے کہ ایک اڑتی سی خبر سنی گئی ہے اور وہ بھی کی خبر  
 کہ زبان سے نہیں بلکہ طہور کی زبان سے۔

گو واں نہیں پہ واں کے نکالے تھے تو ہیں کعبہ سے ان جنوں کو بھی نسبت دور کی  
 فرماتے ہیں یہ تو ہم نے مانا کہ اب خانہ کعبہ میں بت نہیں ہیں مگر کبھی پہلے تو وہاں تھے اور  
 نکال دیئے گئے ہیں اس لئے ان جنوں کو کعبہ سے ایک دور کی نسبت ہے۔

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہ صویر کی  
 کیا خوب شعر کہا ہے۔ فرماتے ہیں۔ یہ تو کوئی ضروری بات نہیں ہے کہ ہر شخص کو حضرت سہیلیؑ  
 کی طرح جواب صاف ہی مل جائے۔ ممکن ہے کہ ہماری درخواست منظور ہو اور جلوہ دیدار  
 دکھا دیا جائے۔ پھر کہوں نہ ہم کوہ طور کی سیر کریں۔

گرمی سہی کلام میں لیکن نہ اس قدر کی جس سے بات اس نے شکایت ضروری

فرماتے ہیں۔ شوخ زبانی اور حاضر جوابی کوئی بُری بات نہیں ہے اگر حد اعتدال سے تجاوز نہ کر جائے۔ وہاں تو یہ حال ہے کہ وہ جس سے بات کرتے ہیں وہ شوخ زبانی کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ عجب گرم شعر کہا ہے۔

غائب گر اس سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی  
اس شعر سے میرزا کی کمال شوخی طبع ظاہر ہوتی ہے۔ یہ غزل اس زمانہ میں کہیں جبکہ بہادر شاہ  
مرحوم کا ارادہ حج کو جانے کا تھا۔ میرزا اس سفر میں بادشاہ کے ساتھ جانے کا کمال اشتیاق  
ظاہر کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس کے لئے مکت ماننے ہیں مگر مکت یہ ماننے ہیں کہ حج کا ثواب  
حضور کی نذر کروں گا اور سفر حج کا وہ اشتیاق اور اصرار ہے کہ وہ ثواب کی یہ بے قدری۔ (راز  
یادگار غائب)

### غزل

غم کھانے میں بودا دل ناکام بہت ہے یہ رنج کہ کم ہے مئے گلخام بہت ہے  
فرماتے ہیں۔ رنج و غم سننے میں دل ناکام اس قدر بودا اور کمزور ثابت ہوا ہے کہ اس نمونی سی  
بات کا انسوؤں کو کج شراب گلرنگ تھوڑی مقدار میں باقی رہ گئی ہے اس کے حق میں غم کا  
ایک پہاڑ ہی گیا ہے۔

کہتے ہوئے سانی سے حیا آتی ہے ورنہ ہے یوں کہ مجھے درویش جام بہت ہے  
یعنی قناعت کا تو یہ حال ہے کہ شراب کی تلپھٹ بھی میرے لئے کافی ہے۔ مگر اس  
خیال سے کہ سانی مجھے ذلیل اور کم ہمت اور قانع نہ سمجھے۔ اس پر یہ بات ظاہر نہیں  
ہونے دیتا۔ (راز یادگار غائب)

نے تیر کہاں میں نہ صیاد کہیں میں گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے  
یعنی جو شخص گمنامی اور کس پرہیزی کی حالت میں ہوتا ہے اس کا کوئی دشمن اور بدخواہ  
نہیں ہوتا ساری خرابیاں شہرت، اقتدار اور نام و نمود کے ساتھ وابستہ ہیں۔ (راز  
یادگار غائب)

کیا زہد کو مانوں کہ نہ ہو گریہ ریائی یا دِ اِش عمل کی طمع خام بہت ہے  
 فرماتے ہیں۔ میں اس زہد و تقویٰ اور عبادت کا قائل نہیں ہوں جس کے اخام میں  
 جنت کی اُمید اور جود کے ملنے کی توقع شامل ہو۔

ہیں اہل خرد کس دُشِ خاص پہ نازاں پابستگی رسمِ ورہ عام بہت ہے  
 فرماتے ہیں۔ کون سی رسم و راہ خاص ہے جس پر عقلمند لوگ ناز کرتے ہیں۔ حالانکہ  
 یہ لوگ عامیانہ رسموں کی پابندی سب سے زیادہ بڑھ چڑھ کر کرتے ہیں۔ اور لطف  
 یہ ہے کہ پھر دُشِ خاص برتنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔

زمرم ہی یہ چھوڑ دیجھے کیا طوفِ حرم آلودہ یہ مے جامہٴ احرام بہت ہے  
 فرماتے ہیں۔ مجھ کو تو چاہ زمرم ہی پر چھوڑ دو کہ میں میٹھا ہوا اپنے دامن سے شراب  
 کے دھبے دھوتا رہوں مجھ کو طوافِ خانہ کعبہ سے کیا ثواب حاصل ہو سکتا ہے جب کہ  
 میرا جامہٴ احرام شراب میں آلودہ ہے۔

ہے تھر کہ اب کبھی نہ بنے بات کہ ان کو انکار نہیں اور مجھے ابرام بہت ہے  
 فرماتے ہیں۔ اگر اب بھی میری مراد پوری نہ ہو تو ستم ہے۔ ان کو وصل سے انکار نہیں  
 اور مجھ کو بے انتہا اضرار ہے۔

خوں ہو کے جگر آنکھ سے پیکانیں آ مرگ رہنے دے مجھے یاں کہ ابھی کام بہت ہے  
 فرماتے ہیں۔ اہل ابتدائے عشق میں کیوں مجھ سے مرنے کا تقاضا کرتی ہے ابھی مجھ کو محبت  
 کے کوچر میں پڑا رہنے دے جگر کا خون ہونا آنکھوں سے بہنا، میرا کوچہ و بازار میں رسوا  
 ہونا اور اسی قسم کی بہت سی ذلتیں اور مصیبتیں مجھ کو اٹھانی باقی ہیں۔ ان سب کاموں  
 کو انجام دے لوں تو پھر مرنے کا ارادہ کروں۔

ہوگا کوئی ایسا بھی کہ غائب کو نہ جانے شاعر تو وہ اچھا ہے یہ بدنام بہت ہے  
 فرماتے ہیں۔ کوئی ایسا ہی بد نصیب شخص ہوگا جو غائب کو نہ پہچانتا ہو۔ جس قدر روزہ اچھا

شاعر نے اتنا ہی مشہور بھی ہے۔

## غزل

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے جوشِ تہج سے بزمِ چراغاں کئے ہوئے  
فرتے ہیں۔ بہت ہی دن ہو گئے یار کی مہاندازی نہیں کی اور شرابِ آتشیں پیالوں میں  
بھر کر اپنے عزیز مہماں کے سامنے نہیں رکھی جس سے بزمِ چراغاں کا لطف حاصل ہو۔  
یعنی ایک ایک جام ایک ایک چراغ کا کام دے۔

کڑا ہوں جمع پھر جگر تختِ تخت کو عرصہ ہوا ہے دعوتِ خرگاں کئے ہوئے  
فرتے ہیں۔ پھر بیٹھا ہوا ان جگر کے ٹکڑوں کو چین رہا ہوں جن کو پہلے بھی خرگاہی  
یار کے رو بردیش کر چکا ہوں۔

یہ وضعِ احتیاط سے نہ کئے لگا ہے دم برسوں ہوئے ہیں چاکِ گریباں کئے ہوئے  
فرتے ہیں۔ پھر ضبطِ جنوں سے دم ٹھٹھے لگا ہے۔ برسوں ہوئے کہ گریباں کو چاک ہی  
نہیں کیا۔

پھر گرمِ نالہ لکے شرابِ رے نفس مدت ہوئی ہے سیرِ چراغاں کئے ہوئے  
فرتے ہیں۔ پھر یہی جی چاہتا ہے کہ پہلے کی طرح ایسے نائے کروں کہ جن سے شرابِ رے  
لگیں مدت ہو گئی چراغاں کا تماشا دیکھے ہوئے۔

پھر پریشِ جراحتِ دل کو چلا ہے عشق سامانِ صد ہزارِ نمکداں کئے ہوئے  
فرتے ہیں۔ پھر خورِ عشقِ زخمِ دل پر نمک چھڑکنے کے لئے سامانِ ہم ہنچا رہا ہے۔  
پھر بھر رہا ہے خامہِ خرگاں بخونِ دل سازِ چنِ طرازیِ داماں کئے ہوئے  
فرتے ہیں۔ میں نے خامہِ خرگاں کو پھر خونِ دل میں اس غرض سے ڈبو دیا ہے کہ صفحہ  
داسی پر گلکاریاں کروں۔

باہمدگر ہوئے ہیں دلِ دیدہ پھر رقیب نظارہ و خیال کا سامان کئے ہوئے

فرماتے ہیں۔ آپس میں پھر دل و دیدہ رقیب بن گئے ہیں۔ دل نے جمالِ یار کی خیالی تصویر کھینچی ہے اور آنکھ نے نظارہ روئے نگار کی حسرتِ ظاہر کی ہے۔

دل پھر طوان کوئے ملامت کو جائے ہے پندار کا صنم کدہ ویراں کئے ہوئے  
فرماتے ہیں۔ پھر دل نے کوچہ ملامت کے طوان کرنے کی خواہش ظاہر کی ہے غور خود داری کے بُتِ خانہ کو توڑ ڈالا ہے۔

پھر شوق کر رہا ہے خریدار کی طلب عرضِ متلع عقلِ دلِ جاں کئے ہوئے  
فرماتے ہیں۔ پھر شوق کسی خریدارِ معشوق کو ڈھونڈ رہا ہے اور اس نے معنی شوقِ دل نے متلع عقل و دل و جان کی دوکان لگائی ہے مطلب یہ ہے کہ پھر کوئی معشوق خریدار بن کر ہمے عقل و دل و جان کا سودا کرے۔

دوڑے ہے پھر ہر ایک گلِ لالہ پر خیال صد گلستاں نگاہ کا ساماں کئے ہوئے  
فرماتے ہیں۔ پھر خیالِ مینوں کی ظرت دوڑنے لگا ہے۔ نگاہ میں سینکڑوں باغوں کا ساماں فراہم کئے ہوئے۔

پھر چاہتا ہوں نامہ دلدار کھولنا جانِ نذر و لغریٰ عنوان کئے ہوئے  
فرماتے ہیں۔ میں پھر یار کا خط کھولنا چاہتا ہوں۔ اس نے جو افاضہ پر میرا نام و پتہ لکھا ہے وہ دلغریب ہے کہ میں اس کو جانِ نذر کرنی چاہتا ہوں۔

مانگے ہے پھر کسی کو لبِ یام پر ہوس زلفِ سیاہِ سُرخ پہ پریشاں کئے ہوئے  
فرماتے ہیں۔ پھر میری آرزو ہے کہ کوئی معشوقِ سیاہ زلفیں چہرے پر پریشاں کئے ہوئے کوٹھے پر سے مجھ کو جھانک رہا ہو۔

چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو سُرمدے تیز دشنہ مرغاں کئے ہوئے  
فرماتے ہیں۔ مجھ کو آرزو ہے کہ پھر کوئی میرے مقابلہ میں مرغاں کی چھری کو سُرمدے سے تیز کئے ہوئے آجائے۔

اک نو بہار ناز کو تاک ہے پھر نگاہ چہرہ فروغ مے سے گلستاں کئے ہوئے  
 فرماتے ہیں۔ پھر ایک نو بہار ناز کو نظر تاک رہی ہے اور یہ چاہتی ہے کہ چہرہ کو فروغ مے سے  
 باغ کا ہسر بنا کر سامنے آجائے۔

پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے ہیں سر زیر بار منتِ دریاں کئے ہوئے  
 فرماتے ہیں۔ پھر جی میں یہ بات سمائی ہے کہ کسی مستوق کے دروازہ پر دربان کا احسان  
 سر پہ لئے ہوئے پڑے ہیں۔

جی ڈھونڈتا ہر پھر وہی فرصت کے رات دن بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کئے ہوئے  
 فرماتے ہیں۔ پھر یہ جی چاہتا ہے کہ گزرے ہوئے زمانہ کی طرح ایسی فرصت مل جائے کہ  
 رات دن تصورِ یار کے خاموش بیٹھے رہیں۔

غالب ہمیشہ چھپر کہ پھر جوشِ اشک سے بیٹھے ہیں ہم تہیہ طوفاں کئے ہوئے  
 فرماتے ہیں۔ اے غالب ہم کو نہ شا کہ ہم پھر جوشِ اشک سے طوفاں برپا کرنے کا ارادہ  
 کئے ہوئے بیٹھے ہیں۔

### غزل

نورِ امان ہے بیدار دوست جاں کئے رہی نہ طرزِ ستم کوئی آسماں کے لئے  
 فرماتے ہیں ظلم و دست ہمارے حق میں بہت مبارک ثابت ہوا، اس لئے کہ ظلم و ستم  
 کے جتنے طریقے تھے وہ سب بہت بے گئے۔ گویا جتنے ظلم تھے وہ ختم ہو گئے، اب نئی  
 طرزِ ستم آسماں ایجاد نہیں کر سکتا، پھر ظلم کرے تو کیونکر کرے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کے  
 ستم سے کہ آسماں کے ظلم سے غم بھر کے لئے محفوظ ہو گئے۔

بلا سے گرمزہ یار تشنہ بخوں ہے رکیں کچھ اپنی بھی مرگانِ خم چمکاں کیلئے  
 فرماتے ہیں۔ میں کیا کروں، اگر مرزہ یار ابھی اور خون کی پیاسی ہے میں اس کے حقہ کے  
 موافق خون دل اس کو پلا چکا۔ اب جس قدر خون دل میں باقی ہے وہ میری مرزہ

خون نشاں کا حصہ ہے۔

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں شش خلق لے خضر نہ تم کہ چور بنے عمر جاوداں کے لئے  
نئی طرح کی خوشی ہے۔ حضرت خضر علیہ السلام سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں کہ دیکھئے زندگی  
اس کا نام ہے کہ ہم دنیا میں رہ کر لوگوں سے ملے چلتے رہتے ہیں۔ آپ نے اگر عمر جاوداں  
حاصل کر بھی لی تو اس سے کیا فائدہ ہوا۔ لوگوں کی نگاہوں سے تو آپ پوشیدہ رہتے ہیں۔  
ایسی حیاتِ جاوداں کس کام کی جس کی بدولت چشمِ خلافت سے پوشیدہ رہنا پڑے۔  
رہا بلا میں بھی میں مبتلائے آفتِ رشک بلائے جاں ہوا داتیری اک جہاں کیلئے  
فرماتے ہیں۔ کاش میں کیلا مبتلائے بلا ہوتا۔ تیری ادا اگر بلا تھی تو صرف میرے واسطے ہوتی۔  
بلائے رشک سے تو چھٹکارا حاصل ہوتا۔ ستم یہ ہے کہ تیری ادا ساری دنیا کی بلائے جان  
قرار پا گئی ہے۔

فلکے دور رکھ اس مجھے کہ میں ہی نہیں دراز دستی قاتل کے استیاء کے لئے  
فرماتے ہیں۔ اے فلک تو نے مجھ کو اس قاتل سے کیوں دور رکھ چھوڑا ہے۔ ایک میں ہی  
تو اس کے ستم و جور کے لئے مخصوص نہیں ہو گیا ہوں۔ اور وہ پر بھی تو اس کی دراز دستی کا  
استیاء ہوتا ہے۔ یہ کیا ضرور ہے کہ وہ مجھ کو دیکھتے ہی قتل کر ڈالے۔

مثال یہ مری کوشش کی ہو کہ مرغِ اسیر کرے قفس میں فراہم خس آخیاں کے لئے  
اس سے زیادہ کوشش کی سختی کسی پیرایہ میں برائی نہیں ہو سکتی (از یادگار غائب)  
گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت لے اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے یا سبائے  
اُردو و غزل میں ایسے بیخِ اشعار شاید دوسری چار اور نکلیں گے۔ مولانا آزاد جو مرزا کی طرز کو  
نام رکھتے تھے وہ بھی اس شعر کے اندازِ بیان پر پروا نہ تھے۔ ہم نے مقدمہ میں بھی اس شعر  
پر مارک کیا ہے یہاں اس کی ایک اور خوبی کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔ جو واقعہ میرزا  
نے اس شعر میں بیان کیا ہے اس میں وہ باتوں کی تصریح کرنی ضرور تھی۔ ایک یہ کہ پاسبان



نے قائل کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ دوسرے یہ کہ قائل پاسبان سے چاہتا کیا تھا۔ سو یہ دونوں باتیں بہ صراحت بیان نہیں کی گئیں، صرف کتا یہ میں ادا کی گئی ہیں مگر صراحت زیادہ وضوح کے ساتھ فوراً سمجھ میں آجاتی ہیں۔ پہلی بات پر لفظ شامت اور دوسری پر قدم لینا صرف دلالت کرتا ہے، اس کے سوا روزمرہ کی نشست اور الفاظ کی بندش اور ایک وسیع خیال کو دوسروں میں ایسی خوبی سے ادا کرنا کہ نشر میں بھی اس طرح ادا کرنا مشکل ہے۔ یہ سب باتیں نہایت تعریف کے قابل ہیں۔ (از یادگار غالب)

بقدر شوق نہیں ظرافت تنگناے غزل کچھ اور چاہئے وسعت مئے بیاں کے لئے  
فرماتے ہیں غزل کا میدان تنگ میرے شوق بیاں کے واسطے کافی نہیں ہے۔ مجھ کو اس سے بہت زیادہ وسیع میدان درکار ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہاں سے غزل سرائی چھوڑ کر مرج سرائی شروع کرتا ہوں۔

دیباے خلق کو بھی تا اسے نظر نہ گئے۔ بنا ہے عیش تجلِ حسینِ خاں کے لئے  
یہ چند شعر نواب فرخ آباد کی مرج میں لکھے ہیں جنہوں نے میرزا کو نہایت اشتیاق کے ساتھ فرخ آباد میں بلایا تھا مگر غالباً میرزا کا دہاں جانا نہیں ہوا۔ فرماتے ہیں۔ عیش اور مخلوق کو بھی اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا ہے اور وہ صرف اس غرض سے کہ میرے ممد مرج کو نظر نہ لگ جائے درحقیقت میں تو عیش صرف تجلِ حسینِ خاں کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔

زباں پہ بار خدایا یہ کس کا نام آیا کہ میرے لفظ نے بوسے مری زباں کے لئے  
فرماتے ہیں۔ اُمی میری زباں پر کس با اقبال شخص کا نام آگیا ہے کہ جس کے اثر سے میرے لفظ نے میری زباں کو چوم لیا ہے۔

تفسیر دوست دیں اور معینِ ملت و ملک بنا ہے چرخ بریں جس کی آستان کے لئے  
فرماتے ہیں۔ وہ تفسیر دولت و دیں بھی ہے اور معینِ ملت و ملک بھی اور وہ ایسا شخص ہے کہ چرخ بریں اس کے آستانہ کے واسطے بنایا گیا ہے۔



# قصائد

سازیمتہ نہیں فیضِ چمن سے بیکار سایہ لالہ بے داغ سویلے بہار  
فرماتے ہیں چمن میں ایک خاک کا ذرہ بھی ایسا نہیں ہے جو حسنِ بہار سے فیضیاب نہ ہوا ہو۔  
یہاں تک کہ سایہ لالہ بے داغ بھی دلِ بہار کے لئے سویلہ کا حکم رکھتا ہے اگر لالہ کو داغدار  
کہا جاتا تو اس کا داغ سویلہ سمجھا جاتا اس لئے لالہ بے داغ کہا ہے کہ اس کا ساتھ سویلہ کا کام  
دے سکے۔

مستی بادِ صبا سے ہے معرضِ سبزہ ریزہ شیشے سے جو ہر تیغِ کُسمار  
تیغِ کوہ۔ قلعہ کوہ کو کہتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔ بادِ صبا اس قدر مست ہو گئی ہے کہ اس کی تاثیر  
سے وہ سبزہ جو جو ہر تیغِ کُسمار سمجھا جاتا تھا، ریزہ مینائے سے بن گیا ہے شیشہ کی کہیں  
خشل درگ میں ہری گھاس سے مشابہت رکھتی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ سبزہ کُسمار یہ  
مطلب ظاہر کر رہا ہے کہ بادِ صبا کی کشتی سے جو ہر تیغِ کُسمار ریزہ مینائے بن گیا ہے۔  
سبزہ جامِ زمرد کی طرح داغِ پلنگ تازہ ہے ریشہ نارنج صفت، دے شرار  
نرتاتے ہیں۔ چیتے کے داغ جو سیاہ ہوا کرتے ہیں، ہمارے اثر سے جامِ زمرد کی طرح سبز  
ہو گئے ہیں اور شرار ریشہ نارنج کی طرح تروتازہ ہو گیا ہے۔ دونوں تشبیہیں نہایت بدیع  
و نادر واقع ہوئی ہیں۔

مستی ابر سے گلچینِ طرب ہے حسرت کہ اس کی غوش میں ممکن ہے دو عالم کا فشار  
فرماتے ہیں۔ ابر کی مستانہ خرامی سے حسرت بھی غلچینِ طرب ہے یعنی اس طرب انداز کیفیت  
سے دونوں جہان کے غموں کا خاتمہ نظر آ رہا ہے۔

کوہ و صحرا ہمہ معمور ہی شوقِ لبیکل راہ خوابیدہ ہوئی خندہ نگل سے بیدار  
 راہ خوابیدہ وہ رستہ جس پر لوگوں کی آمد و رفت مدت سے نہ تھی اور سنسان پڑا ہوا  
 تھلا فرماتے ہیں۔ کوہ و صحرا تمام عند لیبان خوشنوا کے چیموں سے معمور ہو گئے ہیں اور  
 غنیموں کے چٹکنے کی آوازوں سے سوئے ہوئے رستے بیدار ہو گئے ہیں۔ یعنی ان پر  
 لوگ حماشاے بہار کے لئے چلنے پھرنے لگے۔

سوئے ہے فیض ہوا صورتِ مژگانِ تیمم سرِ نوشتِ دو جہاں ابر بیک سطرِ غبار  
 فرماتے ہیں۔ باد بہاری سے ہر چیز کو ایسی سیرابی حاصل ہو گئی ہے کہ ایک سطر جو خطِ غبار  
 میں لکھی ہوئی ہو، سرِ نوشتِ ابر بلکہ دو صد ابر تکھی جاتی ہے۔ پھر اس سطرِ غبار کو مژگانِ  
 تیمم سے تشبیہ دے کر یہ ظاہر کیا ہے کہ جس طرح کسی تیمم پکے کی مژگانِ خاک آلود ایک  
 سطرِ خطِ غبار ہو یعنی جس کی سرِ نوشت میں ساہا سال کا رونا لکھا ہو، وہ بھی فیض  
 باد بہاراں سے سرور اندوز ہو گئی ہے۔

کاٹ کر پھینکے ناخن تو باندازِ ہلال قوتِ نامیہ اس کو بھی نہ چھوڑے بیکار  
 فرماتے ہیں۔ آج کل ناخن بھی اگر تراش کر پھینک دیا جائے تو اس کو بھی قوتِ ہلال  
 کی طرح بڑھاتے بڑھاتے بدر کمال بنا دے۔

کفِ ہر خاک بگردوں شد قمری پرواز دامِ ہر کاغذِ آتش زدہ طاؤسِ شکار  
 فرماتے ہیں۔ بہار نے ہر چیز میں جان ڈال دی ہے یہاں تک کہ شعلے بھر خاکِ قمری بن گئی  
 ہے اور ہر شعلہ آتش طاؤس بن گیا ہے۔ قمری کا رنگِ خاک کا رنگ ہوا ہے اس لئے کفِ  
 خاک سے قمری کا بن جانا ثابت کیا ہے اور کاغذ جو جل کر خشک ہو جاتا ہے اس کا  
 اس کو دامِ طاؤس سے تشبیہ دی ہے۔

میکدہ میں ہوا اگر آرزوئے گلِ چینی بھول جائیک قبحِ بادہ بطقِ گلزار  
 فرماتے ہیں۔ اگر تجھ کو یہ نصاب ہے کہ میکدہ میں بیٹھا ہوا بھول چٹا کرے تو نیک کام کر اور

وہ کام یہ ہے کہ ایک جام شراب طاق گلزار پر رکھ کر بھول جا۔ تھوڑے دن کے بعد باغ میں اسی طرح ایک شراب خانہ پیدا ہو جائے گا۔ جس طرح ایک بیج سے ایک درخت پیدا ہو کر سینکڑوں شاخیں نکال لاتا ہے۔ گویا ایک جام شراب شراب خانہ کا ثمر ہے جو دیوار باغ کے طاق پر رکھ دینے سے باغ میں سیخانہ پیدا کر دے گا۔

موج گل ڈھونڈو بہ خلوت مکدہ غنچہ باغ گم کرے گوشہ میخانہ میں گر تو دستار فرمائے ہیں۔ اگر توفیق کی حالت میں شراب خانہ کے کسی کونے میں اپنی پگڑی رکھ کر بھول جائے تو غنچہ باغ کے خلوت خانہ میں اس کو جا کر ڈھونڈو وہ موج گل بن گئی ہے تجھ کو مل جائے گی اور تجھ پر ہوائے بہاراں کی اعجاز نمائی ظاہر ہو جائے گی۔

کھینچے گرمائی اندیشہ چمن کی تصویر کھینچے سبز مثل خطِ نو فیز ہو خطِ پرکار فرماتے ہیں۔ اگر مصویر فکر چمن کی تصویر کھینچے تو سبز خط کی طرح پرکار کی کھینچی ہوئی سبز ہو جائے۔

سے کی ہے پے زمزمہ رحمت شاہ طوطی سبزہ کسار نے پیدا منقار فرماتے ہیں۔ منقبت سرائی کے لئے لعل سے طوطی سبزہ کسار نے زبان پیدا کر لی ہے۔ لعل بھی پاڑ میں پیدا ہوتا ہے اور سبزہ زار بھی پہاڑ پر۔

وہ شہنشاہ کہ جس کے پے تعمیر سرا چشم جبریل ہوئی قالب خشت دیوار فرماتے ہیں۔ وہ شہنشاہ جس کی تعمیر محل کے لئے حضرت جبریلؑ کی آسمانہ اینٹیں بنانے کا سانچہ بن گئی ہے۔

فلک العرش سجوم خم دوش مزدور رشتہ رفیض ازل ساز طناب سحر فرماتے ہیں۔ اس کے نصیر کے واسطے آسمان ہنقم دوش مزدور کی طرح خم ہو گیا ہے اور رفیض ازل اس کے سحر کا وہ موت ہے جس سے سحر دیوار کا سیدھا چپن دیکھتا ہے۔

سبز کا نہ چمن، نہ ایک خطِ پشت لبِ بام رفت بہت صد عارف یک لوح حصار  
سبز کا نہ چمن۔ نو آسمانوں سے ٹراوے۔ فرماتے ہیں۔ نو آسمانوں کی بلندی اور اس کا بام قصر  
برابر ہے۔ دوسرے مصرع میں کہتے ہیں۔ سو عارفوں کی بلندی بہت اور اس کے قصر کی  
چار دیواری مساوات کا درجہ رکھتی ہے۔

واں کی خاشاک سے حاصل ہو جسے ایک پرکاش وہ رہے مروضہ بالِ بیری سے بیزار  
فرماتے ہیں۔ وہاں کی خس و خاشاک سے جس کو ایک پرکاش بھی میسر آجائے وہ تمام عمر بال و پری  
کے پھلے سے بیزار ہے۔

خاک صحرائے بخت جو ہر سیرِ عرفا چشم نقشِ قدم آئینہ بخت بیدار  
فرماتے ہیں۔ صحرائے بخت کی خاک عارفوں کی سیر کا جوہر ہے اور چشم نقشِ قدم بخت بیدار  
کا آئینہ ہے۔ مطلب یہ ہے اہل عرفان خاکِ بخت کو موجبِ فخر سمجھتے ہیں اور سفرِ بخت  
کے وقت اپنے نقشِ پا میں بخت بیدار کی صورت مشاہدہ کر لیتے ہیں۔

ذرا اس گرد کا خورشید کو آئینہ ناز گرد اس دشت کی امید کو احرام بہار  
فرماتے ہیں۔ وہاں کی خاک کا ذرا آفتاب کے لئے فخر و ناز کے آئینہ کا حکم رکھتا ہے۔  
آئینہ ناز وہ آئینہ جس میں منہ دیکھنا باعثِ فخر و ناز ہو اور وہاں کے جنگل کی خاک  
امید کے لئے فصلِ بہار کا جامہ احرام ہے۔

آفرینش کو بے واں سے طلبِ سستی ناز عرض خمیازہ ایجاد ہے ہر موجِ غبار  
فرماتے ہیں۔ وہاں سے آفرینش کو سستی و ناز و فخر کی طلب ہے۔ گویا موجِ غبار انگڑائی  
ہے ایجاد کی۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح نشہ کے استدار کے وقت انگڑائی آتی ہے اسی طرح  
وہاں کی موجِ غبار بلند ہو کر ستاتی ہے کہ خراب فخر و ناز کا نشہ اُتر گیا ہے۔ پھر اس کی  
طلب میں انگڑائیاں لی جا رہی ہیں۔ گویا وہ سرزمین ایسی ہے کہ پیدا کر کے آفرینش کو  
بھی بار بار اس پر فخر و ناز ہوتا ہے۔

## مطلع ثانی

فیض سے تیرے ہواے شمع شبستان بہار دل پروانہ چراغان پر بلبل گلزار  
 فرماتے ہیں۔ اس شمع شبستان بہار تیرے فیض سے پروانہ کا دل چراغاں بن گیا ہے اور  
 پر بلبل گلزار ہو گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ سب کی دلی مزا میں تجھی سے حاصل ہوتی ہیں۔  
 فخر گل طاؤس کرے آئینہ خانہ پروانہ ذوق میں جلوہ کے تیرے یہ ہوائے دیدار  
 فرماتے ہیں۔ طاؤس کی طرح سارا آئینہ خانہ اُڑنے لگے تو کیا عجب ہے تیرے جلوہ کے  
 ذوق اور تیرے دیدار کے شوق نے اس کو بے لگا دیے ہیں۔

تیری اولاد کے غم سے ہر بروئے گردوں سلک اختر میں مہ نو مشرہ گوہر بار  
 فرماتے ہیں۔ تیری اولاد کے غم سے آسمان پر سلک اختر میں مہ نو مشرہ گوہر بار بن گیا ہے۔  
 مطلب یہ ہے کہ اس غم میں رونے سے آنسوؤں کو موتیوں کا رتبہ مل جاتا ہے۔

ہم عبادت کو ترا نقش قدم مہر نماز ہم ریاضت کو تیرے حوصلہ سے استفہار  
 فرماتے ہیں۔ تیرا نقش قدم عبادت کے واسطے سجدہ گاہ کا حکم رکھتا ہے اور ریاضت  
 کے لئے تیرا حوصلہ پشت پناہ کا کام دیتا ہے۔

مرح میں تیری نہاں زمزمہ نعت نبی جام سے تیرے عیاں بادہ جوش اسرار  
 فرماتے ہیں۔ تیری مرح میں زمزمہ نعت نبی پوشیدہ ہے۔ گویا جس نے تیری مرح مکھی  
 اس نے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مرح مکھی۔ اور جس نے تیرا جام محبت پی لیا وہ گویا  
 بادہ اسرار سے بخود و سرشار ہو گیا۔

جو ہر دست دعا آئینہ یعنی تاثیر یک طرفہ نازش مرگان و دگر سو غم خار  
 فرماتے ہیں۔ تیرے دست دعا کا ایک ادنیٰ جوہر یہ ہے کہ وہ تاثیر کا آئینہ ہے، یعنی  
 ادھر ہاتھ دعا کے لئے اُٹھے اور اُدھر دست بستہ اثر سلنے آ موجود ہوا۔ ایک طرف تو

مزرگان کو بوجہ احکام ریز ہونے کے جو دُعا قبول ہونے کا ذریعہ ہے فخر و ناز ہے ۔  
 دوسری طرف جو ہر تاثیر خارجِ حسرت کے واسطے موجبِ رنج و حال ہے ۔ یعنی جب دُعا  
 قبول ہو گئی تو حسرت پامال ہو گئی ۔

مردمک سے ہو عزا خانہ و اقبال نگاہ خاک در کی ترے جو چشم نہ ہوا آئینہ دار  
 فرماتے ہیں ۔ جو آنکھ تیرے خاک در کی آئینہ دار نہ ہو یعنی خادم و فرمانبردار نہ ہو اس کی  
 نظر سعادت و اقبال کا عزا خانہ بن جائے اور اس کی مردمک سیاہ سوگ نشینوں  
 میں شمار کی جائے ۔

دُشمنِ آلِ نبی کو یہ طرب خانہ دہر عرضِ خمیاڑہ سیلاب ہو طاق دیدار  
 فرماتے ہیں ۔ آلِ نبی کے دُشمن کو اس طرب خانہ دُنیا کی ایک ایک محراب اور ایک ایک  
 طاق موجِ سیلاب بن کر ڈبو دے ۔

دیدہ تا دلِ اسد آئینہ یک پر تو شوق فیض معنی سے خطِ ساغرِ راقم سرشار  
 فرماتے ہیں ۔ آنکھ سے لگتا دلِ تمک اے اسد پر تو شوق کا آئینہ دار بن جائے اور فیض  
 معنی سے خطِ ساغرِ راقم سرشار ہو جائے ۔

## قصیدہ دیگر

دہر مجھ جلوہ کینائی معشوق نہیں ہم کہاں ہوتے اگر حُسن نہ ہوتا خود میں  
 فرماتے ہیں ۔ اس دُنیا کا وجود جلوہ کینائی معشوق کا آئینہ ہے ۔ اگر حُسن کو اپنے دیدار  
 کی طلب نہ ہوتی تو ہم کہاں سے ہوتے ۔ گویا ہم کو آئینہ بنا کر جمال بے مثال دیکھا ہے  
 یہ شعر تمام و کمال تصنیف کے ایک مسئلہ سے تعلق رکھتا ہے ۔

بے دلی ہلے تماشا کہ نہ عبرت نہ ذوق بیکسی ہائے تمنّا کہ دُنیا ہے نہ دیں



فرماتے ہیں۔ افسوس ہے ہم نے ایسی بے دلی کے ساتھ اس دُنیا کے ناپائیدار کے تماشے دیکھے کہ جس سے نہ عبرت حاصل ہوئی نہ لذت ملی اور حنا ایسی جیسی کی حالت میں رہی کہ جس سے نہ دین ہی ملا نہ کچھ دُنیا کا ہی فائدہ حاصل ہو سکا بطلب یہ ہے کہ دُنیا کے تماشے سے اگر انسان کو عبرت حاصل ہو تو دین کا فائدہ ہے اور اگر اس کے دیکھنے سے لطف ہو تو دُنیا کے مزے ہیں۔ ہماری بے دلی نے اور ہماری بے دماغی نے ان دونوں فائدوں سے ہم کو محروم رکھا۔

ہرزہ ہے نغمہ زیر و بم و ہستی و عدم لغو ہے آئینہ رُفِرق جنون و تمکین فرماتے ہیں۔ وجود باری تعالیٰ کے سوا کسی دوسری شے کے وجود و عدم کی نسبت گفتگو کرنی یا جنون و تمکین کے متعلق کوئی فرق ثابت کرنا لغو و بے فائدہ ہے۔

نقش معنی ہمہ خمیا زہ عرض صورت سخن حق ہمہ پیمانا نہ رذوق تحسین فرماتے ہیں۔ جو لوگ معنی شناسی کے مدعی ہیں ان کو صرف ظاہر داری منظور ہے اور جو لوگ حق گوئی کے دعوے دار ہیں ان کو فقط اپنی تحسین و ستائش سُنی مقصود ہے۔ معنی شناسی ایسی ہونی چاہئے جس میں ظاہر داری کا میل نہ پایا جائے اور حق گوئی اس کا نام ہے جس میں اپنی کوئی غرض مخفی نہ ہو۔

لا ف دانش غلط و نفع عبادت معلوم کُر دیک ساغر غفلت چہ دُنیا و چہ دین فرماتے ہیں۔ جو آدمی دُنیاوی معاملات میں غفلت کی کا دعویٰ کرتا ہے وہ غلطی پر ہے اور جو کوئی دین کے معاملات میں عبادت سے نفع کی اُمید رکھتا ہے۔ اس کا خیال بجا ہے، واقعی بات تو یہ ہے کہ دین و دُنیا دونوں غفلت کی بدولت خراب ہیں۔ اور اس کی مثال یہ ہے کہ جس طرح شراب کی تلچھٹ اعتبار کے قابل نہیں ہوتی اسی طرح سے دین و دُنیا ساغر غفلت میں نہ نشیں ہیں۔

مثل مضمون و نابا رہدست تسلیم صورت نقش قدم خاک بفرق تمکین

فرماتے ہیں۔ دُنیا ایسی جگہ ہے کہ یہاں تسلیم و رضا جیسی قابلِ قدر دولت بیکار اور بے فائدہ ثابت ہوتی ہے اور اسی طرح وقار و تمکین سے مثل نقشِ قدمِ وقت و رسوائی حاصل ہوتی ہے یعنی جس طرح نقشِ قدمِ خاک بسر ہوتا ہے۔ وہ عشقِ بے ربطی شیرازہ اجزا حواس و صلِ زنگارِ رُخِ آئینہٴ حسنِ یقین فرماتے ہیں۔ ہوشیار لوگوں کے نزدیک اس زمانہ میں دیوانگی و بے خودی کا نام عشق رکھ لیا گیا ہے اور اصحابِ اہل یقین کی نظروں میں آئینہٴ یقین کا زنگار و وصلِ معشوق ہے۔ اگر آئینہٴ یقین بجلی ہوتا تو معشوق کا جلوہ خود اپنی ذات میں نظر آتا اور پھر اس سے کبھی سفارت نہ ہوتی۔

کو کہیں گرسنہ مزدور طرب گاہِ قریب بے ستوں آئینہٴ خوابِ گرانِ شیریں فرماتے ہیں۔ فریاد کے عشق کو ہم عشقِ کامل تسلیم نہیں کرتے وہ صرف خسرو کے محل کا ایک مزدور تھا۔ اس کے جذبِ محبت کا شیریں پر کچھ بھی اثر نہ ہوا گویا کہ وہ بے ستوں شیریں کے خوابِ غفلت کی ایک تصویر سایہ دار ہے جس پر پتھر کاٹتے کاٹتے کو کہیں تیشہ سے اپنا سر بھونکر مر گیا۔

کس نے دیکھا نفسِ اہلِ فنا آتشِ خیز کس نے پایا اثرِ مالہٴ مہملےٴ حزیں فرماتے ہیں۔ اس زمانہ میں نفسِ اہلِ وفا کو آگ لگا دیتے ہوئے کس نے دیکھا ہے۔ اور کس نے درد مندوں کی فریادیں اثر پایا ہے مطلب یہ ہے کہ اب اہلِ وفا کی آہ میں گرمی ہے نہ ٹوٹے ہوئے دلوں کے مالہ میں اثر ہے۔

سامعِ زمزمہٴ اہلِ جہاں ہوں لیکن نہ سروِ برگِ تالش نہ دماغِ نفیس یہاں زمزمہ کا لفظ طنزاً بجائے ہرزہ سرائی استعمال ہوا ہے۔ فرماتے ہیں اہلِ جہاں جو کچھ ہرزہ سرائی کرتے ہیں، مجبوراً میں بھی سن لیتا ہوں۔ مجھ سے نہ تو ان کی تعریف کی جاسکتی ہے اور نہ ان کی مذمت کرتا ہوں۔

کس قدر ہرزہ سرا ہوں کہ عیاذ باللہ ایک قلم خارجِ آداب و قار و تحمکیں  
یہ شعر گریز کا ہے۔ اہل دنیا کی تافہی کی نسبت لکھتے لکھتے فرماتے ہیں کہ خدا کی پناہ  
میں کس قدر ہرزہ سرا ہو گیا ہوں۔ میں نے جو باتیں اوپر بیان کی ہیں وہ ایک قلم خارجِ  
آداب و وقار و کمکیں تھیں۔

نقشِ لاجول لکھاے خامہِ بزمِ انحریر یا علی عرض کرے فطرت و سواس میں  
فرماتے ہیں۔ اے قلمِ بزمِ انحریر کے رفیع کرنے کو لاجول کا تنوید لکھ اور فطرت و سواس کے  
رفع کرنے کو یا علی کا وظیفہ پڑھ۔

منظہر فیضِ خدا جان و دل ختمِ رسل قبلہ آلِ نبیؐ کعبہ اہلبیت اہلبقین  
فرماتے ہیں۔ وہ فیضِ خدا کا ظاہر کرنے والا ہے اور خاتمِ رسل کا جان و دل ہے  
اور وہ قبلہ آلِ نبیؐ ہے اور کعبہ اہلبیت اہلبقین۔

ہو وہ سرمایہٴ ایجاد جہاں گرم خرام ہر کفِ خاک ہواں گروہِ تصورِ بریں  
فرماتے ہیں۔ وہ باعثِ نازشِ ایجاد عالم جہاں سرگرم ہواں ہواں کی ہر کفِ خاک  
گروہِ زمین بن جائے۔

جلوہ پرواز ہو نقشِ قدم اسکا جس جا وہ کفِ خاک سے ناموسِ دُعا کی امیں  
فرماتے ہیں۔ اس کا نقشِ قدم جس جگہ جلوہ پرواز ہو جائے ان کے قدموں کے اثر سے  
اس کفِ خاک سے دونوں جہان کی عزت و آبرو و محال ہو۔

نسبتِ نام سے اسکی جو یہ رُتبہ کہ ہے ایداً پشتِ فلک خم شدہ ناز زمین  
فرماتے ہیں۔ اس کے نام کی نسبت سے زمین کو یہ رُتبہ حاصل ہو گیا ہے کہ ابد تک پشتِ  
فلک نازشِ زمین سے خم رہے گی۔ مطلب یہ ہے کہ حضرت علیؑ کی کثیتِ ابتراب ہے  
اور تراب مٹی کو کہتے ہیں۔ اس سبب سے زمین نازاں ہے۔

فیضِ خلق اسکا ہی شامل ہو کہ ہوتا ہو سدا بوسے گل سے نفسِ بادِ صبا عطر آگس

فرماتے ہیں۔ بوسے گل سے جو بادِ صبا مسطر ہو رہی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ پھولوں کو میرے مددِ وح نے خلق کا فیض پہنچایا ہے۔

برشِ تیغ کا اسکی ہے جہاں میں چرچا قطع ہو جائے نہ سرِ رشتہ را ایجاد کہیں  
فرماتے ہیں۔ میرے مددِ وح کی برشِ شمشیر کا سارے جہاں میں شہرہ ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ  
رشتہ ایجاد اس کی شہرت کے خوف سے قطع ہو جائے۔

کفر سوز اس کا وہ جلوہ ہو کہ جس سے ٹوٹے رنگِ عاشق کی طرح رونقِ تنہا نہ رہیں  
فرماتے ہیں۔ میرے مددِ وح کا جلوہ ایسا کفر سوز واقع ہوا ہے کہ جس سے رنگِ عاشق کی  
طرح بُتِ غائبہ میں بھی شکستہ ہو جاتا ہے۔

جہاں پناہ دل و جاں فیضِ رسانا شاہا و صبیٰ ختمِ رسل تو ہے بفتوائے یقین  
فرماتے ہیں۔ اے جان کے پناہ دینے والے اور دل و جاں کو فیض پہنچانے والے ختمِ رسل  
کا مددِ وحی تو ہی ہے اور اس کا فتویٰ یقین تک پہنچ گیا ہے۔

جسمِ اظہر کو ترے دوشِ بیکبر منبر نامِ نامی کو ترے ناھیدِ عرشِ نگین  
فرماتے ہیں۔ تیرے جسمِ اظہر کے لئے دوشِ بیکبر منبر ہے اور تیرے نامِ نامی کا نگین  
عرش کی پیشانی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تو نے دوشِ بیکبر پر چڑھ کر کعبہ کے بُت  
ٹوڑے ہیں اور تیرا نام عرشِ معلیٰ کی پیشانی پر لکھا ہوا ہے۔

کس سے تمکنتِ تری صحرِ بغیر از واجب شعلہ شمع مگر شمع پہ باندھے آئیں  
فرماتے ہیں۔ تیری مددِ خدا تعالیٰ کے سوا کون کر سکتا ہے اس لئے کہ تیری ذات کو  
فنا فی اللہ ہو جانے کے سبب سے ایسا ربطِ محال ہو گیا ہے جیسا شمع کو شعلہ سے  
محال ہے یعنی شعلہ ہی سے شمع کو زینتِ محال ہوتی ہے۔

آستانِ پر ہے ترے جو ہر آئینہ سنگ راقمِ بندگی حضرتِ جبریل امین  
فرماتے ہیں۔ تیرے آستان پر جبریل امین نے جو سجدے کئے ہیں وہ سنگِ آستان پر

اسی طرح بویا ہوئے ہیں جس طرح آئینہ میں جو ہر ظاہر ہو جاتے ہیں۔ گویا حضرت جبریلؑ کے سجدوں کے نشان تیرے سنگ آستان پر جو ہر آئینہ کا کام دیتے ہیں۔  
تیرے در کے لئے اسبابِ نثار آمادہ خایکوں کو جو خُدا نے دیئے جانِ دل دیں فرماتے ہیں۔ تیرے دروازے پر تصدق ہونے کے لئے یہ سب آمادہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسانی کو جو جان و دل و دین بخشے ہیں۔

تیری مدحت کیلئے ہیں لہجہ جاں کلام و زبان تیری تسلیم کو ہیں لوح و قلم دستِ جنیں فرماتے ہیں۔ تیری مدح سرائی کے لئے دل و جان کام و زبان بن گئے ہیں۔ اور تیرے آداب بجالانے کو لوح و قلم دست و جنیں ہو گئے ہیں۔

کس سے ہو سکتی ہے مداحیِ ممدوحِ خدا کس سے ہو سکتی ہے آرائشِ فرد و جن کیں فرماتے ہیں۔ اس کی مداحی کس سے ہو سکتی ہے جو ممدوحِ خدا ہو اور سوا خُدا کے فرد و جن برپا کی آرائش کس سے ہو سکتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تیرے مدح کے واسطے بہشت بریں آمادہ کی جاتی ہے۔

جنسِ بازارِ معاصی اسد اللہ اسد کہ سوا تیرے کوئی اس کا خریدار نہیں فرماتے ہیں۔ جس کا نام اسد اللہ اور خُلقِ اسد ہے وہ بازارِ معاصی کی ایک جنس ہے اور گنہگار کا حامی اور خریدار تیرے سوا کوئی نہیں ہے۔

شوخیِ عرضِ مطالب میں ہو گستاخِ طلب ہے تیرے حوصلہِ فضل پر از بسکہ یقین فرماتے ہیں۔ مطالبِ مدح کا بیان جو اس قدر شوخ و طع ہے وہ تیرے حوصلے اور بخشش کے یقین کی وجہ سے ہے۔

دے دُعا کو ہری وہ مرتبہ حسن قبول کہ اجابت کے ہر حرت پر سو بار آئیں فرماتے ہیں۔ میری دعا کو ایسا حسن قبول کا مرتبہ عطا فرما دے کہ میرے ایک ایک حرت پر سو سو بار اجابت آئیں گے۔

غمِ شبیر سے ہو سینہ یہاں تک برسوز کہ رہیں خونِ جگر سے مری آنکھیں لگیں  
 فرماتے ہیں حضرت شبیر کے غم سے میرے دل کو اس قدر برسوز کر دے کہ خونِ جگر کے  
 اثر سے مری آنکھیں سُرخ رہنے لگیں۔

طبع کو اُلفتِ دُلّہ میں یہ گرمی شوق کہ جہانِ تنگ چلے اس سے دم اور مجھ سے جہیں  
 فرماتے ہیں۔ تیرے دُلّہ کی محبت میں مجھ کو یہ شوق پیدا ہو جائے کہ جہاں وہ زمین پر  
 قدم رکھے میں اپنی جہیں اُس کے غم کے نیچے فرش کر دوں۔

دل اُلفتِ نسبتِ سینہ تو حیدِ قضا نگاہِ جلوہ پرستِ نفسِ صدق گزین  
 فرماتے ہیں۔ دل میں جوشِ محبت ہو اور سینے میں نورِ عرفانِ نگاہِ جلوہ پرست ہو،  
 اور نفسِ صدق گزین ہو۔

صرف اعدا اثرِ شعلہ دو دو دوزخِ وقفِ احبابِ گل و سنبلِ فردوس بریں  
 فرماتے ہیں۔ تیرے اعدا کے لئے آگ کا شعلہ اور دوزخ کا دُھواں مخصوص ہو جائے  
 اور احباب کے واسطے فردوس بریں کے گل و سنبلِ وقف کر دیئے جائیں۔

## قصیدہ

ہاں میرِ توشنیں ہم اُس کا نام جس کو تو جُھک کے کر رہا ہے سلام  
 فرماتے ہیں۔ اے ہلالِ عید ہم کو اس کا نام بتا دے جس کو تو جُھک کے سلام  
 کر رہا ہے۔

دو دن آیا ہے تو نظر دمِ صبح یہی انداز اور یہی اندام  
 فرماتے ہیں۔ پچھلیں اور پچھلیں کی شب کو صبح کے وقت ہم نے تجھ کو دیکھا تھا،  
 ایسا ہی مازک اندام اور اسی انداز سے ایک جانب جُھکا ہوا تھا۔

بارے دو دن کہاں رہا غائب بندہ عاجز ہے گردشِ ایام  
یہ تو بتا دو دن تک کہاں چھپا رہا اور کہاں غائب ہو گیا تھا۔ بندہ عاجز ہے دنوں  
کی گردش سے ایسا ہوا کرتا ہے۔ بندہ عاجز ہے گردشِ ایام۔ یہ سارا مصرعہ تمثیل ہے۔  
اُڑ کے جاتا کہاں کہ تاروں کا آسماں نے بچھا رکھا تھا دام  
فرماتے ہیں۔ یہ تو ہم جانتے ہیں کہ تو اُڑ کے کیس جابھی نہیں سکتا تھا، اس لئے کہ آسماں  
نے تاروں کا جال بچھا رکھا تھا۔

مرحبا اے سرورِ خاصِ خاص جبذا اے نشاطِ عام عوام  
فرماتے ہیں۔ مرحبا اے خاص الخاص لوگوں کے سرور پہنچانے والے، اور جبذا  
اے تمام و کمال لوگوں کو نشاط بخشنے والے۔

عذر میں تین دن نہ آنے کے لئے کیا ہے عید کا پیغام  
فرماتے ہیں۔ تین دن نظر نہ آنے کے عذر میں عید کا پیغام لے کر آیا ہے تاکہ تجھ سے  
غیر حاضر رہنے کی باز پرس نہ ہو۔

اُس کو بھولا نہ چاہئے گنا صبح جو جائے اور آئے شام  
فرماتے ہیں۔ اُس کو بھولا نہیں سکتے جو صبح کا بھولا شام کو آجائے یعنی چھبیسویں  
شائیسویں کی صبح کو چاند نکل کر بھرا تیس یا تیس کی شام کو نظر آتا ہے۔

ایک میں کیا کہ سب نے جان لیا تیرا آغاز اور ترا انجام  
فرماتے ہیں۔ ایک میں ہی نہیں۔ یہ تو سارے زمانے کو معلوم ہو گیا ہے کہ تو بد رے  
گھٹے گھٹتے بالکل مٹ جاتا ہے اور پھر نئے سرے تیرا آغاز ہو کر تو کمال کے درجہ  
کو پہنچ جاتا ہے یعنی بد رہن جاتا ہے۔

رازِ دل مجھ سے کیوں چھپاتا ہے مجھ کو سمجھا ہے کیا کیوں تمام  
فرماتے ہیں۔ تو مجھ سے اپنا راز دل کیوں چھپاتا ہے۔ کیا تو نے مجھ کو کوئی غماز

سمجھا ہے۔

جانتا ہوں کہ آج دنیا میں ایک ہی ہے اُسید گاہِ انام  
فرماتے ہیں۔ یہ میں جانتا ہوں کہ آج سارے جہاں میں ایک ہی بارگاہِ اسی ہے کہ  
جہاں سے لوگ مُرادیں پاتے ہیں۔

میں نے مانا کہ تو ہے حلقہٴ گوش غائب اُس کا مگر نہیں ہے غلام  
فرماتے ہیں۔ یہ میں نے مانا کہ تو اُس کا حلقہٴ گوش غلام ہے تو کیا غائب اُس کا غلام  
نہیں ہے۔

جانتا ہوں کہ جانتا ہے تو تب کہا ہے بطورِ استفہام  
فرماتے ہیں۔ میں یہ جانتا ہوں کہ تو بھی اس بات سے واقف ہے کہ مجھ کو بھی اس کی  
غلامی کا فخر حاصل ہے۔ اسی وجہ سے میں نے بطورِ استفہام انکاری سے تجھ سے دریافت  
کیا ہے۔

مہرتاباں کو ہو تو ہوا اے ماہِ قُرب ہر روزہ برسبیلِ دوام  
فرماتے ہیں مہرتاباں کو ممدوح کی بارگاہ سے قُرب ہر روزہ ہمیشہ کے لئے حاصل ہو  
تو ہوا لیکن اے ماہ۔

تجھ کو کیا پایہِ روشناسی کا جُز بتقریبِ عیدِ ماہِ صیام  
تجھ کو یہ رُتبہٴ جُز عید کے کس دن حاصل ہو سکتا ہے۔

جانتا ہوں کہ اس کے فیض سے تو پھر بنا چاہتا ہے ماہِ تمام  
فرماتے ہیں۔ تو تو اپنے بخل سے میرے ممدوح کا نام بھی مجھ کو نہ بتاتا تھا میں تجھ کو  
یہ بتائے دیتا ہوں کہ تو پھر اس کے فیض سے ماہِ کامل بنا چاہتا ہے۔ اب تو سمجھ گیا  
ہوگا کہ تجھ سے زیادہ میری وہاں رسائی ہے۔

ماہِ بنِ ماہتاب بن میں کون مجھ کو کیا بانٹ دے گا تو انعام



فرماتے ہیں۔ ماہ بن۔ ماہتاب بن۔ میں کون ہوں جو تجھ پر رشک کروں۔ مجھ کو کیا تو اپنا انعام بانٹ دے گا۔ جو تجھ کو تیری قسمت سے ملے گا وہ تیرے ہی پاس رہے گا۔ اس شعر کا بیان ندرت سے خالی نہیں ہے۔ اگرچہ یہ سارا قصیدہ سیزا صاحب نے ایسی زبان میں لکھا ہے کہ جس پر قیامت تک اُردو زبان فخر کرے گی۔

میرا اپنا جُدا معاملہ ہے اور کے لین دین سے کیا کام فرماتے ہیں۔ کہیں یہ خیال نہ کرنا کہ مجھ کو تجھ پر رشک آتا ہے اور میں عید کے انعام سے محروم ہی رہ جاؤں گا۔ نہیں یہ بات نہیں ہے۔ تجھ کو تیری حیثیت سے موافق انعام ملے گا اور مجھ کو میرے رُتبے کے قابل خلعت و جواہر عطا ہوگا۔

بے مجھے آرزوئے بخشش خاص گر تجھے ہے اُمیدِ رحمتِ عام فرماتے ہیں۔ میں بخشش خاص کا تمنا ہی ہوں۔ اگر تجھ کو اُمیدِ رحمتِ عام ہے۔ جو کہ بخشے گا تجھ کو فروغِ کیا نہ دے گا مجھے مے گلِ فام فرماتے ہیں۔ جو مدد و رحمت کو ایسی روشنی بخشے گا جو ضیاءِ بخش عالم ہوگی۔ کیا مجھ کو شیشہ کی لال پری جو چاندنی رات کو اور زیادہ روشن کر دے گی نہ دے گا۔ جبکہ چودہ منازلِ فلکی کر چکی قطعِ تیری تیزیِ گام فرماتے ہیں۔ جب تو تیز رفتاری کے ساتھ آسمان کی چودہ منزلیں طے کرے گا اور چودھویں رات کا ماہِ کامل بن جائے گا۔

تیرے پر تو سے ہوں فروغِ پذیر کوئے مشکوے و صحنِ منظرِ بام اور تیرے پر تو سے کوچے اور محلِ سرا اور درِ بام پر چاندنی پھیل جائے گی تو دیکھنا میرے ہاتھ میں لبریز اپنی صورت کا اک بلوریں جام اس میرے ہاتھ میں بھی ایک جامِ بلوریں سے انگور سے چمکتا ہوا تیری شکل کا روشن اور مشور ہوگا۔

پھر غزل کی روش پہ چل نکلا تو سن طبع چاہتا تھا لگام  
فرماتے ہیں: جام شراب اور شبِ ماہ کا ذکر آتے ہی پھر غزل سرائی میں نے شروع کر دی  
گویا تو سن طبع باگ کا اشارہ چاہتا تھا۔ اشارہ پاتے ہی چل نکلا۔

### غزل

زہرِ غم کر چکا تھا میرا کام تجھ کو کس نے کہا کہ ہو بدنام  
فرماتے ہیں: میرے حق میں تو غم ستم قاتل ثابت ہو ہی چکا تھا، تجھ کو کس کیوں تو  
نے میرے قتل کرنے کی صلاح دی ناحق ایک تیر لگا کر بدنام ہوا۔

ہے پھر کیوں میں پئے جاؤں غم سے جب ہو گئی ہوزیت حرام  
فرماتے ہیں: حرام تو شراب بھی ہے اور غم سے زیت بھی حرام ہے پھر میں کیوں نہ شراب  
پیوں اس سے کسی قدر غم غلط تو ہو جاتا ہے اگر شراب کو حرام جان کر شراب پیئے  
سے پرہیز کرتا ہوں تو غم زیت حرام کئے دیتا ہے۔ لاجواب شعر لکھا ہے۔ نئی قسم کی  
شوخی ہے۔

بوسہ کیسا یہی غنیمت ہے کہ نہ سمجھیں وہ لذتِ دشنام  
فرماتے ہیں: بوسہ تو کب وہ دیتا ہے۔ ہم تو اسی بات کو غنیمت سمجھتے ہوئے ہیں کہ  
اس کو یہ معلوم نہیں کہ گالیاں کھانے میں بھی ہم کو لطف حاصل ہوتا ہے۔ اگر یہ معلوم  
ہو جائے تو وہ اپنے منہ سے گالیاں بھی نہ دے۔

کعبہ میں جا بجائیں گے ناقوس اب تو باندھا ہے دیر میں حرام  
فرماتے ہیں: جس طرح بجائے کعبہ کے دیر میں احرام باندھ لیا ہے اسی طرح ایک نہ ایک  
دن دیر کے بدلے کعبہ میں جا کر ناقوس بھونکیں گے۔

اس قدح کا ہے ذورِ بچہ کو نقد چرخ نے لی جو جسے گردشِ دام  
فرماتے ہیں: بچہ کو وہ جامِ عرفان نصیب ہے جس شراب معرفت سے بخود ہو کر آسمان

رقص کر رہا ہے۔

بوسہ دینے میں ان کو ہے انکار دل کے لینے میں جن کو تھا ابرام  
فرماتے ہیں تعجب کی بات ہے کہ بوسہ کے دینے میں ان کو انکار ہے جن کو دل لینے میں  
ضد کرنے کی عادت تھی۔

چھپرے مابوں کہ ان کو غصہ آئے کیوں رکھیں ورنہ غالب پنا نام  
بالکل نئی شوخی میرزا صاحب نے اس مقطع میں برتی ہے۔ فرماتے ہیں۔ میں نے تو صرت  
چھپرے کی غرض سے کہ ان کو غصہ آئے اور وہ مجھ کو بُرا بھلا کہنا شروع کر دیں میں نے  
اپنا نام غالب رکھ لیا ہے۔ ورنہ میں تو ان کے سُسن دُکُش سے مغلوب ہو چکا ہوں،  
غالب کیونکر بن سکتا ہوں۔

کہہ چکا میں تو سب کچھ اچھے کہ اے پری چہرہ پیک تیز خرام  
یہاں سے پھر ماہ تو کی جانب منی اطاب ہو کر فرماتے ہیں۔ میں تو سب کچھ کہہ چکا۔ اب  
اے پری چہرہ پیک تیز خرام تو بتا کہ تو کیا کہتا ہے۔

کون ہے جس کے در پہ ناصیہ سا ہیں مہ و مہر و زہرہ و بہرام  
بہرام فلک مرجح کو کہتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔ وہ کون ہے جس کے در پہ ناصیہ سا  
مہ و مہر و زہرہ و بہرام ہیں۔

تو نہیں جانتا تو مجھ سے سُن نام شاہنشاہ بلند مقام  
فرماتے ہیں۔ تو اگر نہیں جانتا تو مجھ سے سُن میرے خمنشاہ و بلند مقام کا نام۔  
قبلہ چشم و دل بہادر شاہ مظہر ذوالجلال والا کرام  
فرماتے ہیں۔ وہ دل و چشم کے قبلہ ہیں۔ یعنی چشم اُمید ان ہی کو دیکھتی ہے اور دل تمناؤں  
انہیں کی طرف رجوع کرتا ہے۔ اُن کا اسم گرامی بہادر شاہ ہے اور وہ مظہر  
ذوالجلال والا کرام ہیں۔

شہسوارِ طریقہ اسلام نو بہارِ حدیقہ اسلام

اور یہ دونوں صفتیں ان میں پائی جاتی ہیں۔

جس کا ہر فعل صورتِ اعجاز جس کا ہر قول معنی الہام

اور وہ بادشاہِ ایسا ہے کہ جس کا ہر فعل اعجازِ نما ہے اور جس کا ہر قول الہام ثابت ہوتا ہے۔

بزم میں میزبان قیصر و جم رزم میں استاد رستم و سام

فرماتے ہیں۔ بزم میں وہ قیصر و جم کا میزبان ہے اور رزم میں رستم و سام کا استاد ہے۔ گویا قیصر و جم اس سے فیض پاتے ہیں اور رستم و سام اس سے جنگ کے طریقے سیکھتے ہیں۔

اے ترا لطفِ زندگی افزا اے ترا عہدِ فرخی فرجام

یہاں سے مدحِ حاضر شروع ہو گئی ہے۔ باقی شعر کا مطلب صاف ہے۔

چشم بد دور خسروانہ شکوہ لوحش اللہ عارفانہ کلام

فرماتے ہیں۔ اُٹھا تجھ کو نظر بد سے بچائے۔ تیری خسروانہ شان آنکھوں میں کبھی جاتی ہے اور ماشار اللہ تیرا عارفانہ کلام دلوں میں گھر کر لیتا ہے۔

جانِ نثاروں میں تیرے قیصر و جم جرمِ خواروں میں تیرے مخدِ جا

فرماتے ہیں۔ تیرے جانِ نثاروں میں قیصر و جم بھی شمار کیا جاتا ہے اور تیرے جرمِ خواروں میں ہمیشہ بھی داخل ہے۔

وارثِ ملک جانتے ہیں تجھے ایرج و تور و خسرو و بہرام

فرماتے ہیں۔ یہ سب بادشاہِ جن کا سہرہ شانی میں نام یا گیا ہے تجھ کو وارثِ ملک جانتے ہیں۔

زورِ بازو میں مانتے ہیں تجھے گویو و گورد و وزیر و ربام

مصرعہ شانی میں زور آور اور مشہور پہلوانوں کا نام یا گیا ہے۔

قطعہ

مرحبا موشگافی ناوک آفریں آبداری صمصام  
تیر کو تیرے تیر غیر ہدف تیغ کو تیری تیغ خضم نیام  
دونوں شعر دست و گریباں ہیں اور لغت و نشر مرتب فرماتے ہیں تیرا تیر ایسا بل  
کی کمال کھینچنے والا ہے کہ دشمن کا تیر گویا کا نشانہ ہے۔ اور تیری خمیر اس قدر  
آبدار ہے گویا دشمن کی تلوار اس کا نیام ہے مطلب یہ ہے کہ تیرا تیر دشمن کے تیر کو  
نشانہ کی طرح اڑا دیتا ہے اور تیری تلوار دشمن کی تلوار میں نیام کی طرح اتر جاتی ہے۔

قطعہ

رعد کا کہہ رہی ہے کیا دم بند برق کو دے رہا ہے کیا الزام  
تیرے فیل گراں جسد کی صدا تیرے رخس ٹبک عنان کا فرام  
فرماتے ہیں۔ رعد کا دم بند کر رہی ہے۔ تیرے فیل خلک شکوہ کی چنگھاڑ اور بجلی کو  
الزام دے رہا ہے۔ تیرے رخس ٹبک عنان کا فرام یعنی بجلی سے کتا ہے کہ تو ایسی  
سُست رفتار ہے کہ میرے ساتھ دس قدم بھی نہیں چل سکتی۔

قطعہ

فن صورت گری میں تیرا گرز گر نہ رکھتا ہو دستگاہ تمام  
اس کے مضروب کے سرو تن سے کیوں نمایاں ہو صورتِ ادغام  
فرماتے ہیں۔ تیرے گرز کو سوری و صورت گری آتی ہے اور اس فن میں مکمل حاصل  
ہے۔ وہ ایک ضرب میں دشمن کے سرو تن کو اس طرح ملا دیتا ہے کہ ادغام کی تصور  
آنکھوں کے رو برو کھینچ جاتی ہے۔

صفحہ ہائے لیبائی و ایام

جب ازل میں رقم پذیر ہوئے صفحہ ہائے لیبائی و ایام  
فرماتے ہیں۔ ازل کے دن جو احکام رات اور دن کے اوراق پر رقم ہوئے تھے۔

اور ان اوراق میں بجلک قضا مجملًا مندرج ہوئے احکام وہ نکل طور پر رقم ہوئے تھے۔ ان احکام کی تفصیل ابدالآباد تک ہوتی رہے گی۔

ان ہی احکام کی تفصیل میں یہ حکم بھی مندرج ہوئے تھے کہ لکھ دیا تھا شاید وہ کج عاشق کش لکھ دیا عاشقوں کو دشمن کام مشوقوں کو عاشق کش لکھ دیا اور عاشقوں کو دشمن کام لکھ دیا۔ دشمن کام وہ شخص جو دشمنوں کے حسب مراد خستہ و دل شکستہ ناکام و نامراد ہو۔

آسمان کو کہا گیا کہ کہیں گنبد تیز گرد نیلی قام آسمان کی نسبت یہ حکم نافذ ہوا کہ لوگ اس کو گنبد تیز گرد نیلی قام کے نام سے مشہور کریں۔

حکم ناطق لکھا گیا کہ لکھیں خال کو دانہ اور زلف کو دام اسی کے ساتھ یہ حکم نافذ ہوا کہ لوگ اس کو گنبد تیز گرد نیلی قام کے نام سے مشہور کریں۔

آتش و آب باد و خاک نے لی وضع سوز و کم ورم و آرام فرماتے ہیں۔ آگ پانی۔ ہوا۔ خاک کے حصے میں یہ باتیں آئیں کہ ان کی وضع سے سوز و غم ورم و آرام ظاہر ہو رہا ہے۔ یعنی آگ کو سوز دیا گیا۔ پانی کو نمی عطا ہوئی۔ ہوا کو بھاننا پھرنالہ اور خاک کو آرام بخشا گیا۔

مہر رخشاں کا نام خسرو روز ماہ تاباں کا اسم شمعہ شام فرماتے ہیں۔ مہر رخشاں کو خسرو روز کا خطاب عطا ہوا اور ماہ تاباں کا دام کو توال شام قرار پایا۔

تیری توقع سلطنت کو بھی دی بدستور صورت ارقام فرماتے ہیں۔ تیرے فرمان سلطنت کو حسب ضابطہ صورت ارقام عطا ہوئی۔ دستہ فارسی میں وزیر کو بھی کہتے ہیں۔

کاتب حکم نے بموجب حکم اس رقم کو دیا طراز دوام  
فرماتے ہیں۔ کاتب قدرت نے تیرے واسطے فرمان سلطنت لکھ کر اس پر دوام  
دولت کا طغہ بنا دیا۔

بے ازل سے روائی آغاز ہو ابد تک رسائی انجام  
یہ شعر دعائیہ ہے۔ روائی امکان و جواز کے معنی پر استعمال ہوتا ہے۔ باقی شعر  
کے معنی صاف ہیں۔ میرزا صاحب کا یہ قصیدہ ان کے کمال شاعری کا ایک زبردست  
کارنامہ ہے۔ تئو برس پہلے اردو زبان میں ایسی تشبیب اور ایسی مدح لکھنی جس کا  
جواب آج تک بھی کوئی نہیں لکھ سکا۔ کارے دار کا مصداق ہے۔

## قصیدہ

صبح دم دروازہ خاور کھلا مہر عالمتاب کا منظر کھلا  
فرماتے ہیں۔ صبح ہو گئی اور مشرق کا دروازہ کھل گیا۔ یعنی جس درپچہ سے مہر عالمتاب  
کا جلوہ نظر آتا ہے وہ منظر ظاہر ہو گیا۔

خسرو انجم کے آیا صرت میں شب کو تھا گنجینہ گوہر کھلا  
فرماتے ہیں خسرو انجم اپنی آفتاب کی ضیاء میں سارے چھپ گئے۔ گویا خورشید تاباں  
نے گنج گوہر کو صرت کر دیا۔

وہ بھی تھی اک سیمیا کی سی نمود صبح کو راز مہ و اختر کھلا  
سیمیا وہ فن ہے جس کے ذریعہ سے اشکال دہی و غیر دہی نظر آتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔  
مہ و اختر جورات کو نظر آ رہے تھے۔ صبح ہو جانے پر سیمیا کی اشکال کی طرح نظر سے  
پوشیدہ ہو گئے۔

ہیں کو ایک کچھ نظر آتے ہیں کچھ دیتے ہیں دھوکہ یہ باز گیر کھلا  
فرماتے ہیں۔ ستاروں کی اصل و حقیقت کچھ اور ہے اور نظر کچھ اور طریقہ پر آتے ہیں  
گویا یہ ایسی قسم کے باز گیر ہیں جو کھلا ہوا دھوکہ دیتے ہیں۔

سطح گردوں پر چڑا تھارات کو موتیوں کا ہر طرف زیور کھلا  
فرماتے ہیں۔ سطح گردوں پر رات کو ستارے نہ تھے بلکہ مشوق کا زیور تھا جو موتیوں  
سے بنایا گیا تھا اور وہ قدر و قیمت میں ستاروں سے بہتر تھا۔ یہاں تشبیہ نے ستاروں کو  
آفتاب روز سے زیادہ چمکا دیا ہے۔

صبح آیا جانب مشرق نظر اک بھکار آتشیں رخ۔ سر کھلا  
فرماتے ہیں۔ شب کو تو آسمان پر یہ کیفیتیں نظر آرہی تھیں اور صبح کو یہ دیکھا کہ ایک  
مشوق آتشیں رخسار بہنہ سرمانے موجود ہے۔

تھی نظر بندی کیا جب ردِ بحر بادہ گل رنگ کا ساغر کھلا  
فرماتے ہیں۔ وہ بھکار آتشیں رخسار گویا ایک جادو کا پتلا تھا۔ جب ہم نے ردِ بحر  
کا عمل پڑھا تو یہ ثابت ہوا کہ بادہ گل رنگ کا ساغر ہے۔

لا کے ساتی نے صبحی کے لئے رکھ دیا ہے ایک جام زر کھلا  
اور اس ساغر کو ساتی نے صبحی کے واسطے لاکر رکھ دیا ہے جو ایک سونے کے جام  
کی شکل میں بنیر سر پوش کے نظر آرہا ہے۔

بزم سلطانی ہوئی آراستہ کعبہ امن و اماں کا در کھلا  
تشبیہ ختم ہوئی۔ گر بزم میں فرماتے ہیں کہ اس تمہید میں صبح کا بیان صرف اس غرض  
سے کیا گیا تھا کہ جب صبح ہوگئی تو بزم سلطانی آراستہ ہوگئی گویا امن اماں کے کعبہ کا  
دروازہ کھل گیا۔

تاج زرین مہر تاباں سے ہوا خسرو آفاق کے منہ پر کھلا



نُٹھ پر کھلنا۔ محاورہ ہے۔ اس کے معنی زیب دینے کے ہیں۔ فرماتے ہیں۔ مہرتاباں کا تاجِ نرین اتنا زینبدہ نہ تھا جتنا بادشاہِ عالم کا تاجِ نرین بادشاہ کے نُٹھ پر زیب دیتا ہے۔

شاہِ روشنِ دل بہادر شہِ کرم رازِ ہستی اُس پہ سرتا سر کھلا  
فرماتے ہیں۔ میرا بادشاہ بہادر شاہِ روشنِ دل ہے اور روشنِ دلی کی دلیل یہ ہے کہ ہستی کا راز اس پر تمام و کمال کھل گیا ہے۔

وہ کہ جسکی صورتِ نکوین میں مقصود نہ خج و ہفت اختر کھلا  
فرماتے ہیں۔ وہ ذاتِ متودہ صفاتِ ایسی ہے کہ جس کی نکوین میں نورِ آسمانوں اور صاف ستاروں کا مقصدِ تخلیق ظاہر ہوتا ہے۔ قدیم اُستادوں کے ہاں اعلانِ نور بعدِ صافیت زیادہ عیب نہ سمجھا جاتا تھا۔

وہ کہ جس کے ناخنِ تاویل سے عقدہٗ احکامِ پیغمبر کھلا  
فرماتے ہیں۔ وہ ایسا بادشاہ ہے کہ اس کی تاویل کے ناخن سے عقدہٗ احکامِ پیغمبر کھل گیا ہے۔ ناخنِ تاویل اور عقدہٗ احکام دونوں استعارے ہیں۔

پہلے دارا کا نکل آیا ہے نام اُس کے سرنگوں کا جب دفتر کھلا  
فرماتے ہیں۔ پہلے دارا کا نام نکلا ہے۔ جب اس کی فوج کے سرنگوں کا دفتر کھولا گیا ہے۔ مشہور ہے کہ دارا کے پاس بے انتہا فوج تھی اور سرنگ کے معنی بڑا فوج یا مقدمۃ الجیش لشکر کے ہیں۔

رہنما سوں کی جہاں فرست ہے واں لکھا ہے چہرہٗ قیصر کھلا  
فرماتے ہیں۔ اُس کے رہنما سوں کی یعنی والوں کی جہاں فرست رقم ہے وہاں چہرہٗ قیصر یعنی حلیہٗ قیصر واضح طور پر لکھا ہوا ہے۔ مدح میں یہ دونوں شہرے مثل ہیں اور دونوں بادشاہوں کی خصوصیت الٰہی کے صفات کی وجہ سے لازمی اور ضروری

تھی۔ اگر ان کی جگہ کوئی اور نام مثل سکندر یا فیصلہ رقم کر دیے جاتے تو یہ دونوں شرابے بلند درجوں سے گر جاتے۔

قطع

تو سن شہ میں ہے وہ خوبی کہ جب تھان سے وہ غیرت صرصر کھلا  
نقش یا کی صورتیں وہ دلفریب تو کہے بُت خانہ آڈر کھلا

فرماتے ہیں۔ تو سن شہ میں وہ خوبیاں ہیں کہ جب تھان سے وہ غیرت صرصر یعنی ہوا سے زیادہ چالاک گھوڑا کھلتا ہے تو اس کے نقش پائیں ایسی دلفریب شکلیں پیدا ہو جاتی ہیں جن کے دیکھنے سے ثابت ہوتا ہے کہ آڈر بُت تراش کا بُت خانہ سامنے نمودار ہو گیا ہے۔

مجھ پر فیض تربیت سے شاہ کی منصب مہر و مہر و محور کھلا

فرماتے ہیں۔ بادشاہ کی تربیت سے مجھ کو یہ علم حاصل ہو گیا ہے کہ آفتاب کا منصب اور ماہ کا عہدہ اور محور کی حقیقت مجھ پر منکشف ہو گئی ہے۔ محور اس لیر کو کہتے ہیں جو گرہ متحرک کے درمیان میں یعنی گرہ قطبیس کے بیچ میں سوہوم ہوتی ہے۔

لاکھ عقدے ہیں تھے لیکن ہر ایک میری حد و نفع سے باہر کھلا

فرماتے ہیں۔ میری لاکھوں مشکلیں جن کا حل ہونا میری استطاعت و قدرت سے باہر تھا وہ آسانی سے حل ہو گئیں۔

تھا دل وابستہ قفل بے کلید کس نے کھولا، اب کھلا، کیونکر کھلا

فرماتے ہیں۔ میرا دل وابستہ تو ایک ایسا قفل تھا کہ جس میں کوئی نہی ہی نہیں لگتی تھی۔ مجھ کو حیرت ہے کہ اس قفل کو کس نے کھولا اور یہ کب کھلا اور یہ کس طرح کھل گیا۔

باغ معنی کی دکھاؤں گا بہار مجھ سے گر شاہ سخن گستر کھلا

کھلنے کے معنی بنے تکلف ہو کر باتیں کرنے کے ہیں مگر یہاں اس کے دوسرے معنی لئے گئے

گئے ہیں فرماتے ہیں۔ باغِ معنی کی بہار دکھاؤں گا۔ اگر بادشاہ نے میرے حال پر نگاہ  
توجہ فرمائی۔

ہو جہاں گرم غزلِ خوانی نفس لوگ جانیں طلبہٴ عنبر کھلا  
فرماتے ہیں۔ میراجی چاہتا ہے کہ اس موقع پر میں ایک غزل بھی سنائی شروع کر دوں  
اور میرے مضامین کی خوشبو سے لوگوں کو یہ عطران گزرے کہ عنبر کا ڈبہ کھول دیا گیا ہے۔  
کنج میں بیٹھا رہوں یوں پر کھلا کاش کے ہوتا قفس کا در کھلا  
فرماتے ہیں۔ افسوس ہے کنجِ قفس میں اس طرح سے میں پر کھلا ہوا بیٹھا رہوں۔ کاش  
قفس کی کھڑکی کھلی ہوئی ہوتی اور میں اُڑ جاتا۔

ہم پکاریں در گھٹے یوں کون جائے یار کا دروازہ یا میں گر کھلا  
فرماتے ہیں۔ ہمارا اعزاز یہ چاہتا ہے کہ ہم یار کے دروازے پر جا کر آوازیں دیں اور  
ہمارے واسطے دروازہ کھولا جائے۔ اسی حالت میں ہمارے جانے کا لطف ہے۔  
یوں ہماری بلا جاتی ہے کہ اس کا دروازہ کھلا ہوا دیکھ کر ہم جا کر شریکِ صحبت ہو جائیں۔  
اس طرح عام لوگ جاتے ہیں۔

ہم کہتے ہیں اس راز داری پر گھنڈ دوست کا ہے راز دشمن پر کھلا  
فرماتے ہیں۔ افسوس ہے ہم کو ایسی راز داری پر گھنڈ ہے اور ہم بھی سمجھتے ہیں کہ سوا  
ہمارے کوئی شخص راز دوست سے آگاہ نہیں ہے حالانکہ دوست کا راز دشمن پر  
کھل گیا ہے۔ نف ہے ہماری راز داری پر۔

واقعی دل پر کھلا لگتا تھا داغ زخم لیکن داغ سے بہتر کھلا  
فرماتے ہیں۔ کہ سچی بات تو یہ ہے کہ دل پر داغ بہت ہی زہر دیتا تھا لیکن زخم  
داغ سے بھی زہینہ ثابت ہوا۔ علاوہ ازیں زخم کا کھلنا ایک دوسرے معنی بھی دیتا  
ہے جس کا لطف اس لطفِ معنی سے بالاتر ہے۔

ہاتھ سے رکھ دی کبتوں نے گمان کب کمرے غمزہ کا خنجر کھلا  
 ہر دو جو خود گمان سے مشابہ اس کو گناہ رکنا اور غمزہ جس کو خنجر سے نشید دی جاتی  
 ہے اس کو خنجر گناہ لکھنا میرزا صاحب کی جذباتِ طبع کی دلیل ہے۔ مطلب شعر کا صاف  
 ہے یعنی ہر دے یاد اور غمزہ دوست ہر وقت ہمارے قتل کے درپے رہتے ہیں۔

مفت کا کس کو بُرا ہے بد رتہ رہروی میں پردہ رہبر کھلا  
 بد رتہ کے معنی رہبر اور نگہبان قافلہ کے ہیں۔ فرماتے ہیں مفت کا رہبر کس کو بُرا معلوم  
 ہوتا ہے باوجودیکہ رہروی میں رہبر کا بھرم کھل گیا۔ یعنی ہم نے یہ جان لیا کہ وہ آشنائے  
 منزل مراد ہے لیکن پھر بھی ایک آدمی تو ساتھ ملنے کے لئے بغیر داسوں کا مل گیا نہ بُرا  
 سوز دل کا کیا کرے بارانِ اشک آگ بھڑکی سینہ اگر دم بھر کھلا

فرماتے ہیں۔ بارانِ اشک سوز دل کیونکر کھجھا سکتا ہے۔ جب یہ حالت ہو کہ اگر سینہ پر شا  
 دم بھر کے واسطے بند ہو جاتا ہے تو آگ بھڑکنے لگتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ رونے سے  
 دل کی پیش تھمی رہتی ہے۔ ادھر آنسو بند ہوئے اور ادھر دل میں شعلہ بھڑکا۔

نامہ کے ساتھ آگیا پیغامِ مرگ رہ گیا خطِ میری چھاتی پر کھلا  
 شادی مرگ ہو جانے کو کس سادگی کے ساتھ بیان کیا ہے کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔  
 میرزا صاحب کے نقشروں میں کا نشتر ہے۔

دیکھو غالب سے گرا لکھا کوئی ہے ولی پوشیدہ اور کافر کھلا  
 فرماتے ہیں۔ خبردار اگر کوئی غالب سے اُٹھے گا تو وہ اُس کے دوست کیسے رہے گا۔

پھر ہوا مدحت طرازی کا خیال پھر وہ خورشید کا دفتر کھلا  
 فرماتے ہیں۔ پھر مدح سلطان کی طرتِ طبیعت رجوع ہوئی اور مدح کے شرکینے شروع  
 کئے اور ایک ایک شعر چاند سورج کا مقابلہ کر رہا ہے۔

خامہ نے پائی طبیعت سے مدد بادباں کے اُٹھتے ہی نگر کھلا

فرماتے ہیں۔ فلم اٹھاتے ہی طبیعت شرگونی کی طرت۔ جوع ہو گئی۔ گویا ادھر جہاز کا ننگ اٹھایا اور اُدھر باویاں کھل گئی۔ بحرِ مہنی میں کشیِ سخنِ رواں ہو گئی۔

مدح سے مدح کی دیکھی تشکوہ غرض سے یاں رتبہ جو ہر کھلا

فرماتے ہیں۔ یہاں مدح سے مدح کی خان و سلوہ ظاہر ہو گئی۔ گویا عرض سے جو ہر کا رتبہ کھل گیا۔ جو ہر کا نظریاں دُربے بہا سے بھی زیادہ قیمتی ہے۔

مہر کا نیا پر خ پتھر کھا گیا بادشہ کا رایت شکر کھلا

فرماتے ہیں۔ آفتابِ نشانِ شکر کے رُعب و داب سے لرزاں ہو گیا اور آسمان کو پتھر آنے لگے۔

بادشہ کا نام لیتا ہے خطیب اب علو پایہ منبر کھلا

فرماتے ہیں۔ منبر کا رتبہ اس سبب سے بلند ہے کہ اس پر خطیب بادشاہ کا نام خطبہ میں پڑھتا ہے۔

سگہ شہ کا ہوا ہے روشناس اب عیار آبروئے زر کھلا

فرماتے ہیں۔ زر و سیم کی آبرو اس وجہ سے کی جاتی ہے کہ اس پر بادشاہ کا سگہ ہے۔

شاہ کے آگے دھرا ہے آئینہ اب مالِ سنی اسکندر کھلا

فرماتے ہیں۔ شاہ کے روبرو آئینہ رکھا ہوا ہے۔ اتنے برسوں کے بعد جاگر سکندر کی کوشش

کا نتیجہ ظاہر ہوا ہے یعنی اس نے اسی آئینہ داری کی تمنا میں آئینہ بنایا تھا۔

ملک کے وارث کو دیکھا فاختی اب فریبِ طفل و سنجر کھلا

فرماتے ہیں۔ ملک کا وارث خاص میرا ممدوح ہونا چاہئے تھا۔ اب کہیں جا کر حق بقدر

رسید کا موقع ہاتھ آیا ہے۔ طفل اور سنجر جو بادشاہ بن بیٹھے تھے وہ ان کا فریب تھا،

جواب کھل گیا۔

جو سکے کیا مدح ہاں اک نام ہے دفترِ مدح جہاں داور کھلا

فرماتے ہیں۔ خوش نصیبی سے میرا نام اس کے مدد و محوں میں مشہور ہو گیا ہے اور لوگ جانتے ہیں کہ اس نے دفتر کے دفتر بادشاہ کی مدح میں رقم کر دیئے ہیں، لیکن جیسی مدح۔ تم ہونی چاہئے تھی وہ مجھ سے رقم نہ ہو سکی۔

فکر اچھی پرستائش ناتمام عجز و اعجاز ستائش گر گھٹلا  
فرماتے ہیں۔ فکر تو اچھی ہے لیکن مدح ناتمام ہے وہ پوری پوری ادا نہیں ہو سکی اعجاز مدح کا عجز ظاہر ہو گیا۔ فکر کے کمال نہ ہونے سے اعجاز بیانی کا دعویٰ کرنا اور مدح کے ناتمام رہ جانے سے عجز کا اظہار کرنا یہ دونوں باتیں اس شعر میں ایسی بدیع اور نادر اس خوبی کے ساتھ ادا ہوئی ہیں کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔

جانتا ہوں خط لوح ازل تم یہ اسے خاقان نام آور گھٹلا  
فرماتے ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ تم پر لوح ازل کا حال واضح اور منکشف ہے اس لئے یقین ہے کہ میرا حال بھی تم سے پوشیدہ نہ ہوگا۔ اس صورت میں مجھ کو کیا ضرورت ہے کہ میں عرض حال کروں۔

تم کرو صاحبقرانی جب تلک ہے طلسم روز و شب کا در گھٹلا  
فرماتے ہیں۔ خدا کرے تم اس وقت تک صاحبقرانی کرتے رہو جب تک طلسم روز و شب کا دروازہ گھٹلا ہوا ہے۔ صاحبقران قانع اور جلیل القدر بادشاہ کو کہتے ہیں۔ لفظی معنی صاحبقران کے یہ ہیں کہ وہ بادشاہ جو قرآن عظمیٰ کے وقت پیدا ہو۔

## مثنوی

ہاں دلِ درد مند زمزمہ ساز کیوں نہ کھولے دیرِ خزینہ راز  
فرماتے ہیں۔ اے دلِ درد مند اے ہاں اے دلِ زمزمہ ساز تو کیوں نہ کھولے دیرِ خزینہ راز۔

خامہ کا صفحہ پر رواں ہونا شاخ گُل کا بے گلفشاں ہونا  
 فرماتے ہیں نکر سخن کے دفت خامہ کا صفحہ کاغذ پر چلنا بینہ ایسا ہے جیسے شاخ گُل  
 سے ہمارے موسم میں پتھوؤں کا جھڑنا۔

مجھ سے کیا پوچھتا ہے کیا لکھئے نکتہ ہائے خرد فزا لکھئے  
 اپنے دل سے کہتے ہیں کہ تو مجھ سے یہ کیا دریافت کرتا ہے کہ کیا لکھنا چاہئے عقل  
 بڑھانے والے نکات لکھنے چاہئیں۔

بارے آسوں کا کچھ یہاں ہو جائے خامہ نخل رطب فشاں ہو جائے  
 پھر سوچ کر جواب دیتے ہیں کہ آسوں کی کچھ تعریف لکھنی چاہئے اور ایسی خوبی کے ساتھ  
 لکھنی چاہئے کہ خامہ نخل رطب فشاں کا مد مقابل بن جائے یعنی بہت ہی شیریں  
 مضامین رقم ہوں۔

آم کا کون مرد میدان ہے ثمر و شاخ گوئے چوگاں ہے  
 فرماتے ہیں۔ آم کا کون مرد میدان یعنی مد مقابل کون ہے۔ ثمر و شاخ گوئے و  
 چوگاں کا حکم رکھتے ہیں۔

تاک کے جی میں کیوں ہے ارماں آئے یہ گوئے اور یہ میدان  
 فرماتے ہیں۔ انگور کی پیل کے جی میں کیوں ارمان باقی رہے۔ میدان کارزار میں  
 آم سے چوگاں بازی کرے۔

آم نے آگے پیش جائے خاک پھوڑتا ہے جلے پھوڑے تاک  
 فرماتے ہیں۔ آم کے آگے پیش تو خاک بھی نہیں جاتی۔ ابھی اپنے جلے ہوئے دل  
 کے پھوڑے تاک انگور پھوڑ رہا ہے۔

نہ چلا جب کسی طرح مقدور بادۂ ناب بن گیا انگور  
 فرماتے ہیں۔ جب کسی طرح آم کا مقابلہ نہ کر سکا تو انگور بار کر شراب ناب بن گیا۔

یہ بھی ناچار حجتی کا جینا ہے شرم سے پانی پانی ہونا ہے  
 فرماتے ہیں۔ انگور کا بادہ ناب بن جانا گویا شرمندگی سے باقی پانی ہو جانا ہے اور  
 مجبوری سے انگور اپنی جان کھوتا ہے۔

مجھ سے پوچھو تمہیں خبر کیا ہے آم کے آگے نیشکر کیا ہے  
 فرماتے ہیں۔ مجھ سے پوچھو، تم ابھی اس کی حقیقت سے خبردار نہیں ہو۔ آم کے سامنے  
 نیشکر ایک بے قدر چیز ہے۔

نہ نکل اس میں شلخ دگر نہ بار جب خزاں آئے تب ہوا سکی بہار  
 فرماتے ہیں۔ نکلے میں نہ بھول آتا ہے نہ اس میں شاخیں ہیں نہ پتے ہیں نہ پھل ہیں اور ان  
 سب سے زیادہ بُرائی کی بات یہ ہے کہ خزاں کا موسم اس کی بہار کا زمانہ ہے۔

اور دوڑائیے قیاس کہاں جان شیریں میں یہ ٹھاس کہاں  
 فرماتے ہیں۔ اور کہاں قیاس دوڑا کر آم کی شیرینی کا جواب پیدا کیا جائے۔ جان کو شیریں  
 بیان کیا جاتا ہے، مگر اس میں ایسی ٹھاس کہاں ہوتی ہے۔

جان میں ہوتی گر یہ شیرینی کو کہن باوجود غم گینتی  
 فرماتے ہیں۔ اگر جاں میں ایسی شیرینی ہوتی تو کو کہن یعنی فریاد باوجود غم گینے ہونے کے۔

جان دینے میں اُس کو کیا جان پردہ یوں سل فے نہ سکتا جان  
 جان دینے میں اُس کو کیسے رونگٹا اور بے مثل زمانہ فرض کر لیا جائے تو کبھی وہ اس  
 آسانی سے جان نہ دے سکتا۔ یعنی اگر جان میں شیرینی ہوتی تو وہ اس آسانی سے جان

نہ دیتا۔  
 نظر آتا ہے یوں مجھے یہ ثمر کہ دوا خانہ ازل میں مگر  
 مجھ کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ثمر یعنی آم دوا خانہ ازل کا بنایا ہوا ہے اور یہ اس طرح  
 بنایا گیا ہے کہ



آتش گل پہ قند کا ہے قوام شیرے کے تار کا ہے ریشہ نام  
 آتش گل پر قند کا قوام پکا یا گیا ہے اور شیرے کے تار کا نام ریشہ رکھ دیا ہے۔  
 یا یہ ہو گا کہ فرط راحت سے باغبانوں نے باغ جنت سے  
 یا یہ بات ہو گی کہ جوش محبت سے باغبانوں نے باغ جنت سے۔

انگلیں کے حکم رب انناس بھر کے بھیجے ہیں سر بمہر گلاس  
 شہد کہ خدا تعالیٰ کے حکم کے گلاسوں میں بھر کر اور ان پر مہر لگا کر دُنیا میں بھیج دیا ہے۔  
 یا لگا کر خضر نے شاخ نبات مدتوں تک دیا ہے آب حیات  
 یا یہ بات ہے کہ خضر نے شاخ نبات لگائی ہے اور مدت تک اس میں آب حیات دیا ہے۔  
 تب ہوا ہے خمر شاں یہ نخل ہم کہاں ورنہ اور کہاں یہ نخل  
 جب جا کر کہیں یہ درخت پھیل لایا ہے ورنہ ہم کہاں اور یہ نخل کہیں۔

تھا ترنج زر ایک خسرو پاس رنگ کا زر دیر کہاں بوباس  
 آم کو دیکھتا اگر اک بار پھینک دیتا طلّائے دستِ افشا  
 بیان کیا جاتا ہے کہ خسرو پرویز کے پاس اس قسم کا کنڈی تھا کہ ہاتھ سے دبا کر جو چیز  
 اس کی چاہتے تھے بنالیتے تھے۔ پرویز نے اسی کا ترنج بنوایا تھا۔ کھانے کے وقت وہ  
 ترنج دسترخوان پر رکھ دیا جاتا تھا۔ اس کے بعد کسریٰ نے اسی کو سونے کا ساگ بنوایا  
 اور دسترخوان کی زینت اور آرائش کا اس سے کام لیا۔ دست افشاں اسی واسطے میرزا صاحب  
 کہتے ہیں کہ وہ سونا سوم کی طرح دبائے سے دب جایا کرتا تھا۔ باقی دونوں شعروں کے  
 معنی صاف ہیں۔

رونق کا رگاہ برگ و نوا نازش دو دمان آب و ہوا  
 برگ و نوا سامان کے معنی پر بھی استعمال ہوتا ہے اور برگ کا لفظ درخت کے ساتھ ہیں  
 بھی مناسب رکھتا ہے اور نوا سے طائران خوش الحان کی آواز بھی مراد ہے۔

رہرو راہِ خلد کا توشہ! طوبی و سدرہ کا جگر گوشہ  
 فرماتے ہیں۔ آم رہرو راہِ خلد کا توشہ بھی ہے اور طوبی و سدرہ کا جگر گوشہ بھی  
 ہے مراد یہ ہے کہ آم کھاتے کھاتے اگر انسان مر بھی جائے تو سیدھا جنت میں  
 پہنچ جاتا ہے اور طوبی اور سدرہ بھی دائرہ امنہ کو عزیز رکھتے ہیں۔  
 صاحبِ شلخ و برگ بارے آم ناز پروردہ بہار ہے آم  
 فرماتے ہیں۔ آم بڑا ساز و سامان رکھنے والا پھل ہے اور بہار نے بڑے نازوں سے  
 اس کو پالا ہے۔ مصرعہ ثانی کی داد کچھ اہل زبان ہی دے سکتے ہیں۔

خاص وہ آم جو نہ ارزاں ہو نو بر نخل باغِ سلطان ہو  
 یہ دو باغِ باغِ سلطان مشہور تھے جن میں ایک باغ کا نام باغِ حیات بخش تھا اور  
 دوسرے باغ کا نام متاب باغ تھا۔ باغِ حیات بخش قلعہ معلیٰ کے اندر تھا اور  
 متاب باغ زیرِ فیصل کھائی کے اوپر واقع تھا۔ ان باغوں کا آم سلاطین اور بیگمات  
 کے علاوہ کسی کو کھانا نصیب نہ ہوتا تھا۔ ان باغوں میں بہت سے درخت ابو ظفر  
 بہادر شاہ آخر بادشاہِ دہلی کے ہاتھ کے لگائے ہوئے تھے۔ میرزا صاحب اس شعر میں  
 انھیں آموں کی نسبت نو بر نخل باغِ سلطان خطاب کر کے لکھتے ہیں۔

وہ کہ ہے والی ولایت عہدِ عدل سے اس کپ حمایتِ عہد  
 فرماتے ہیں۔ وہ بادشاہ کہ ولایت عہد ویمان کا وارث ہے اور اسی کے عدل اور  
 انصاف سے زمانہ و وقت کی حمایت ہے۔

فخر دیں عز و شان جاہ و جلال زینتِ طینت و جمال و کمال  
 فرماتے ہیں۔ میرے مدد و رح کی ذات والا صفات دین کے واسطے باعثِ فخر و عزت اور  
 جاہ و جلال کی شان اس سے بڑھ گئی ہے اور نیک طینتی کی وہ زینت ہے اور کمال  
 کے واسطے وہ جمال کا حکم رکھتا ہے۔

کار فرمائے دین و دولت و بخت چہرہ آرا کے تاج و سند و تخت  
فرماتے ہیں۔ دین و دولت و بخت کا وہ بادشاہ ہے اور تاج و سند و تخت کی عزت میں  
اُس نے اضافہ کر دیا ہے۔

سایہ اُس کا ہماں کا سایہ ہے خلق پر وہ خدا کا سایہ ہے  
فرماتے ہیں۔ اس کے سایہ میں جو شخص آجائے وہ بادشاہ بن جائے اور مخلوق  
کے سر پر وہ ظل اللہ کا حکم رکھتا ہے۔

اے مفیض وجود سایہ و نور جب تک بے غم و سایہ و نور  
اس خداوند بندہ پرور کو وارث گنج و تخت و افسر کو  
شاد و دشا دشا دماں رکھیو اور غالب پہ مہرباں رکھیو  
یہ تینوں شرط عاریہ ہیں اور مطلب ان کا صاف ہے۔

## قطعات

اے شہنشاہِ فلک منظرِ بے مثل و نظیر اے جہاندارِ کرم شیوہ بے شبہ و عیال  
فرماتے ہیں۔ اے شہنشاہِ فلک مرتبہ تو بے مثل اور بے نظیر ہے۔ دوسرے مصرع میں  
کہتے ہیں۔ اے بادشاہ تیری عادت کرم کرنے کی ہے اور اس میں کچھ شک نہیں کہ  
تو عادل زمانہ ہے۔

پاؤں سے تیرے ملے فرقِ اراوت اور گنج فرق سے تیرے کرے کسبِ سعادت اکیس  
فرماتے ہیں تخت شاہی تیرے قدموں سے اپنا سر اراوت کرتا رہتا ہے۔ اور تیرے ہر قدم  
سے تاج شاہی سعادت حاصل کرتا رہتا ہے۔

تیرا انداز سخن شانہ زلفِ الہام تیری رفتارِ قلم جنبشِ بالِ جبریل  
 فرماتے ہیں۔ تیری گفتار میں یہ اعجاز ہے کہ الہامی دقیق باتوں کو اُلجھی ہوئی زلفوں کی  
 طرح سلجھا دیتی ہے اور تیرے قلم کی رفتار بازوئے جبریل کی جنبش بھی جاتی ہے۔  
 تجھ سے عالم یہ کھلا رابطہ قربِ کلیم تجھ سے دنیا میں کچھا مادہ بذلِ خلیل  
 فرماتے ہیں جن لوگوں نے قربِ کلیم اور بذلِ خلیل کی کیفیت صرف کانوں سے سُنی تھی  
 آنکھوں سے نہ دیکھی تھی انھوں نے تیری وجہ سے اپنی آنکھوں سے دیکھ لی کہ تیری  
 ذات میں یہ دونوں صفتیں نظر آتی ہیں۔

بہ سخنِ اوجِ درہ مرتبہ معنی و لفظ بکرمِ دارغ نہ ناصیہ قلم و نیل  
 فرماتے ہیں۔ تیرے کلام سے معنی و لفظ کا رتبہ بلند ہو جاتا ہے اور تیرے کرم سے یعنی  
 تیرے جود و بخشش سے دریائے قلم و دریائے نیل شربا جاتے ہیں۔

تا ترے وقت میں ہو عیش و طرب کی تو قیر تا ترے عہد میں ہو سنج و الم کی تغلیل  
 ماہ نے چھوڑ دیا ثور سے جانا باہر زہرہ نے ترک کیا حوت کے کرنا تحویل  
 فرماتے ہیں۔ اس لئے کہ تیرے وقت میں عیش و طرب کی ترقی ہو۔ ماہ نے برج ثور سے  
 باہر نکلنا چھوڑ دیا ہے۔ اور اس واسطے کہ تیرے زمانہ میں سنج و الم کم ہو جائے زہرہ  
 نے برج حوت میں داخل ہونا ترک کر دیا ہے۔

تیری دانش میری اصلاحِ مفاسد کی رہی تیری بخشش میری انباجِ مقاصد کی کفیل  
 تیرا اقبالِ ترحم مرے جینے کی نوید! تیرا اندازِ تغافل مرے مرنے کی دلیل  
 یہاں اقبال کے معنی انتفاع کرنے کے ہیں۔ باقی دونوں شعروں کا مطلب صاف ہے۔  
 بختِ ناساز نے چاہا کہ نہ دے مجھ کو اماں چرخِ گھیا ز نے تاکا کہ کرے مجھ کو ذلیل  
 فرماتے ہیں۔ میری یہ نصیبی یہ چاہتی ہے کہ مجھ کو کہیں امن و امان میسر نہ آئے اور آسمان کی  
 گردشیں یہ چاہتی ہیں کہ مجھ کو ذلیل کریں۔

پچھنے ڈالی ہے سرِ رشتہ، اوقات میں گناٹھ پہلے ٹھونکی ہے بُنی ناخنِ تدبیر میں کیل  
مطلب یہ ہے کہ پہلے ناخنِ تدبیر کو ناقابلِ عقدہ کشائی کر دیا گیا ہے اس کے بعد سرِ رشتہ  
اوقات میں گرہ لگائی ہے۔

تپشِ دل نہیں بے رابطہ، خوفِ عظیم کششِ دم نہیں بے ضابطہ، جزِ ثقیل  
فرماتے ہیں۔ تپشِ دل خوفِ عظیم سے خالی نہیں ہے۔ میرے واسطے سانس لینا بھی جزِ ثقیل  
سے کم نہیں ہے۔

دُرُ معنی سے مرا صفحہ لقا کی دارِ وحی غم گیتی سے مرا سینہ عمر کی زنبیل  
فرماتے ہیں معنی کے سوتیوں سے میرا کاغذِ تحریر لقا کی دارِ وحی بن گیا ہے (بیان کیا جاتا  
ہے کہ لقا دارِ وحی کے بالوں میں موتی پرویا کرتا تھا) اور دُنیا کے غموں سے میرا سینہ  
عمر و عیار کی زنبیل بن گیا ہے۔ عمر و عیار کی زنبیل کی نسبت داستانِ گو بیان کرتے  
ہیں کہ ساری دُنیا کی چیزیں اس میں رہتی تھیں۔ یہاں تک کہ زنبیل عمر بجائے خود ایک  
دوسری دُنیا تھی۔ گویا میرے سینہ میں غم گیتی کی اسی طرح سمائی ہے جس طرح عمر و عیار  
کی زنبیل میں اشیاءِ عالم کی۔

فکرِ میری گہرا اندوزِ اشاراتِ کثیر کلکِ میری رقم آموزِ عباراتِ قلیل  
فرماتے ہیں۔ میں نے اپنی عبارتِ قلیل میں اشاراتِ کثیر ادا کر دیے ہیں۔ مطلب یہ ہے  
گو میں نے اپنا مختصر حال عرض کیا ہے اور وہ بھی صاف صاف بیان نہیں کیا لیکن  
پھر بھی اشاراتِ کثیر اس میں ایسے موجود ہیں جس سے میری مصیبتوں کا حال تمام و  
کمال مفصل و مشرَحِ بہ پہ سمجھ سکتے ہیں۔

میرے اہمام پہ ہوتی تو صدقِ توضیح میرے اجمال سے کرتی ہر تراشِ تفصیل  
فرماتے ہیں۔ میں ایسا جادو بیان شاعر ہوں کہ میرا مبہم حال بیان کیا ہوا توضیح سے  
بڑھ کر ظاہر ہوتا ہے اور میرے بمل بیان سے تفصیل بڑی ٹپک رہی ہے مطلب یہ ہے کہ

میری عبارت کے الفاظ قلیل میں اور معنی کثیر۔  
 نیک ہوتی مری حالت تو نہ دیتا تعجیل جمع ہوتی مری خاطر تو نہ کرتا تعجیل  
 فرماتے ہیں۔ اگر مجھ کو مصائب کا سامنا نہ ہوا ہوتا تو میں حضور کو تکلیف نہ دیتا اور مصائب  
 سے میرا دل اگر پریشان نہ ہو جاتا تو میں زود طلبی کو کام میں نہ لاتا۔  
 قبلہ کوئی مکاں خستہ نوازی میں یہ دیر کعبہ امن و امان عقیدہ کشائی میں یہ حاصل  
 سارے قطعہ کا لب لباب یہ شعر ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ معنی صاف۔

قطعہ

گئے وہ دن کہ نادانستہ غمزدگی و فدا داری کیا کرتے تھے تم تقریر ہم خاموش تے تھے  
 یہاں تقریر کرنا بیان کرنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے جو فارسی محاورہ تقریر گردن  
 کا ترجمہ ہے۔ فرماتے ہیں۔ وہ دن تو گزر گئے کہ تم ناخبر بہ کاری سے غیروں کی  
 وفاداری کی تعریف بیان کیا کرتے تھے اور ہم خاموش بیٹھے ہوئے سنا کرتے تھے  
 اور اپنے دل میں جلا کرتے تھے۔

بس اب بگڑے یہ کیا شرمندگی جانے و دل جاؤ قسم لو ہم سے گریہ بھی کہیں کیوں ہم کہتے تھے  
 فرماتے ہیں۔ بس اب اس سے بگڑ گئی ہے، تو ہم سے تم کیوں شرمندگی کی وجہ سے نہیں لے  
 آؤں جاؤ۔ ہم قسم کھاتے ہیں کہ تم سے یہ بات بھی نہ کہیں گے۔ کیوں ہم نہ کہتے تھے کہ  
 یہ لوگ بے وفا ہیں، تم سے بے وفائی کریں گے۔

قطعہ

کلمتہ کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں اک تیر میرے سینہ پہ مارا کہ ہائے ہائے  
 وہ سبزہ زار ہائے مطر کہ ہے غضب وہ نازیں بیتان خود آرا کہ ہائے ہائے  
 صبر آزما وہ اُن کی نگاہیں کہ حفت نظر طاقت رُبا وہ اُن کا اشارا کہ ہائے ہائے

وہ میوہ ہائے تازہ و شیریں کہ واہ واہ وہ بادہ ہائے ناب گوار کہ ہائے ہائے  
حرف نظر کے معنی چشم بد دور کے ہیں۔ باقی شرفیات ہیں۔

## مدح ڈلی

بے جو صاحب کف دست پہ چکنی ڈلی زریب دیتا ہے اسے جس قدر اچھا کئے  
اس قطعہ کی نسبت حضرت استاذی مولوی خواجہ الطاف حسین صاحب حالی  
یا دھکار غائب میں تحریر فرماتے ہیں <sup>۱۸۷۷ء</sup> میں جبکہ نواب ضیاء الدین احمد خاں مرحوم  
مکلتہ گئے ہوئے تھے مولوی محمد عالم مرحوم نے جو مکلتہ کے ایک دیرینہ سال فاضل تھے  
نواب صاحب سے بیان کیا کہ جس زمانہ میں میرزا صاحب یہاں آئے ہوئے تھے  
ایک مجلس میں جہاں مرزا بھی موجود تھے اور میں بھی حاضر تھا شعرا کا ذکر ہو رہا تھا اس  
مجلس میں ایک صاحب نے فیضی کی بہت تعریف کی۔ میرزا نے کہا فیضی کو میسا لوگ سمجھتے  
ہیں ویسا نہیں ہے۔ اس پر بات بڑھی اس شخص نے کہا۔ فیضی جب پہلی ہی بار اکبر کے  
روبرو گیا تھا اس نے دعائیہ شعروں کا قصیدہ اُسی وقت ارتجالاً کہہ کر پڑھا تھا  
میرزا بولے اب بھی اللہ کے بندے ایسے موجود ہیں کہ دو چار سونہیں تو دو چار شعر  
ہر موقع پر برداشتہ کر سکتے ہیں۔ مخاطب نے حیب میں سے ایک چکنی ڈلی نکالی تجلی  
پر رکھی اور میرزا سے درخواست کی کہ اس ڈلی پر کچھ ارشاد ہو۔ میرزا نے <sup>۱۸۷۷ء</sup> شعر  
کا قطعہ اسی وقت سوزوں کر کے پڑھ دیا۔ وہ یہی قطعہ ہے۔

خامہ انگشت بدنیاں کہ اسے کیا لکھے ناطقہ سرگر بیاں کہ اسے کیا کہے  
فرماتے ہیں۔ خامہ انگشت بدنیاں یعنی حیرت میں مبتلا ہے کہ اس چکنی ڈلی  
کو میں کیا لکھوں اور ناطقہ سرگر بیاں یعنی فکر و تشویش میں پھنسا ہوا ہے کہ اس کو  
کیا کہنا چاہئے۔

مہر مکتوب عزیزان گرامی لکھئے حُر زبازوئے شکرِ فاں خود آرا کئے  
فرماتے ہیں۔ اس کو کسی کے نامہ شوق کی مہر سے مشابہ لکھنا چاہئے یا کسی معشوق  
شوخ و خنک کے بازو کا تویذ سمجھنا چاہئے۔

مسی آلودہ سراگشتِ حسیناں لکھئے داغِ طرفِ جگر عاشقِ شیدا کئے  
چھٹکلیا کے پاس کی انگلی سے عورتیں سی ملا کرتی ہیں۔ اور مسی کے رنگ سے انگلی  
کی پور مسوختی رنگ کی ہو جاتی ہے۔ فرماتے ہیں۔ حسینوں کی مسی آلود پور اس کو لکھنا  
چاہئے یا داغِ جگر عاشقِ شیدا قرار دینا مناسب ہے۔

خاتمِ دستِ سلیمان کے مشابہ لکھئے سرِ پستانِ بریزاد سے مانا کئے  
فرماتے ہیں۔ ایک تشبیہ تو اس کی یہ ہے کہ خاتمِ دستِ سلیمان اس کو لکھا جائے  
اور دوسری تشبیہ یہ ہے کہ پستانِ بریزاد کی بھٹنی کہا جائے۔

اخترِ سوختہ قیس سے نسبت دیجئے خالِ مشکیں رُرخِ دلکش لبیاں کئے  
یا اس کو قیس کے اخترِ سوختہ سے نسبت دیجی چاہئے یا خالِ مشکیں جو رُرخِ لبیاں  
پر تھا وہ اس کو سمجھنا چاہئے

حجرِ الاسودِ دیوارِ حرم کیجئے فرضِ نافہ آہوئے بیابانِ فتن کا کئے  
یا اس کو حجرِ الاسودِ فرض کرنا چاہئے یا آہوئے فتن کا نافہ کہنا چاہئے۔  
وضع میں اس کو اگر سمجھئے قافِ یاقِ رنگ میں سبزہ نوخیزِ مسیحا کئے  
یہ شغریات ہے۔

صومعہ میں اسے ٹھہرایئے گر مہرِ نماز میکدے میں اسے خشتِ خمِ صہا کئے  
فرماتے ہیں۔ عبادتِ خانہ میں اس کو سجدہ نماز کا رتبہ حاصل ہے تو یہی خانہ میں  
خشتِ پائے سرِ خم کا رتبہ رکھتی ہے۔

کیوں اسے قفلِ دل گنجِ محبت لکھئے کیوں اسے نقطہ پر کارِ تمنا کئے



کیوں اسے گویا ناب تصور کیجئے کیوں اسے مردک دیدہ عنقا کیئے  
 کیوں اسے تلمہ پیرا بن لیلیٰ کیئے کیوں اسے نقش پے ناقہ رسلا کیئے  
 فارسی میں نغمہ گھنڈی کے معنی پر استعمال ہوتا ہے اور میرزا صاحب نے اسی  
 معنی پر نغمہ کا لفظ ہوتا ہے۔

بندہ پرور کے کف دست کو دل کیجئے فرض اور اس چکنی سپاری کو سویدا کیئے

نہ بوجہ اسکی حقیقت حضور والا نے مجھے جو بھیجی ہے بیسن کی روغنی روٹی  
 نہ نکھاتے گیسوں نکھاتے نہ خلد سے باہر جو کھاتے حضرت آدم یہ بیسنی روٹی  
 جب بادشاہ کوئی عمدہ چیز کو اسے تھے تو اکثر مصاحبین اور اہل دربار کے لئے بطور  
 اولوش کے بھیجا کرتے تھے۔ اس کے شکر یہ میں کبھی کبھی میرزا کوئی قطعہ یا رباعی بادشاہ  
 کے حضور میں گزارتے تھے یہ قطعہ بھی اسی قبیل کا ہے جس وقت چوہدار شاہی یہ  
 اولوش لے کر آیا ایک باہرکار رہنے والا طالب علم جو میرزا سے کچھ پڑھا کرتا تھا موجود  
 تھا، چوہدار کے چلے جانے کے بعد اس نے متعجب ہو کر پوچھا کہ بیسنی روٹی ایسی  
 کیا نادر چیز ہے کہ بادشاہ کی سرکار سے بطور اولوش کے تقسیم ہوتی ہے۔ میرزا نے  
 کہا، ارے احمق چناوہ چیز ہے کہ اس نے ایک دفعہ جناب الہی میں فریاد کی تھی کہ دنیا  
 میں مجھ پر بڑے ظلم ہوتے ہیں مجھے دلتے ہیں پیستے ہیں بھونتے ہیں پکاتے ہیں۔ اور  
 مجھ سے سینکڑوں چیزیں کھانے کی بنا کر کھاتے ہیں جیسا مجھ پر ظلم ہوتا ہے ایسا کسی پر  
 نہیں ہوتا۔ وہاں سے حکم ہوا کہ اسے چنے تیری خیر اسی میں ہے کہ ہمارے سامنے سے  
 چلا جائے۔ ورنہ ہمارا بھی یہی جی چاہتا ہے کہ تجھ کو کھا جائیں۔ (از یادگار غالب)

خوش ہواے بخت کہ ہر آج ترے سر سہرا  
 بانددہ شہزادے جوان بختہ کے سر پر سہرا

یہ وہی سہرا ہے جس کے جواب میں اُستاد ذوق نے بھی سہرا لکھا ہے اور مقلد میں جوٹ کی ہے۔ یا یوں سمجھنا چاہیے کہ جوٹ کا جواب دیا ہے معنی صاف ہیں۔ کیا ہی اس چاند سے گھٹے پہ بچھا لگتا ہو ہے ترے حسنِ دل افروز کا زیور سہرا فرماتے ہیں کس قدر اس چاند سے چہرہ پر اچھا معلوم ہوتا ہے گویا سہرا تب حسنِ دلاؤیز کے واسطے زیور کا کام دے رہا ہے۔

سر پہ چڑھنا تھے بھیتا ہی رائے طرفِ کلاہ مجھ کو ڈر ہے کہ چھینے ترا نمبر سہرا فرماتے ہیں۔ اے گوشہ کلاہ تجھ کو یہ سرفرازی مبارک ہو کہ تو نوحشاہ کے سر تک پہنچ گیا ہے مگر مجھ کو یہ خوف ہے کہ تیرے درجہ اور مرتبہ کو سہرا چھینیں نہ لے۔ ناؤ بھر کر ہی پروئے گئے ہوں گے موتی ورنہ کیوں لائے ہیں کشتی میں لگا کر سہرا میرزا صاحب کی نزاکت معنی اس شعر میں اپنی آب و تاب دکھا رہی ہے مطلب صاف ہے اور کوئی بات شرح مطلب نہیں۔

سات دریا کے فراہم کئے ہوئے موتی تب بنا ہوگا اس انداز کا گز بھر سہرا گویا سہرے میں اتنے موتی پروئے گئے ہیں کہ جب تک ہفت قلم کے گومرآباد جمع نہ کئے جائیں اُس وقت تک گز بھر کی لڑی بھی سرے کی نہیں بن سکتی۔

رُخ پہ دولہا کے جو گرمی سے سینہ چمکا ہے رگ ابر گھر بار سراسر سہرا فرماتے ہیں۔ دولہا کے رُخ پر گرمی سے پسینے کے قطرے جمع ہو گئے ہیں۔ اُن کے دیکھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے گویا ابر نساں بار موتی برسا رہا ہے، سرے کی لڑی نہیں ہے بلکہ رگ ابر ہے۔

یہ بھی اکبے ادبی تھی کہ قبلے بڑھ جائے رہ گیا آن کے دامن کے برابر سہرا جی میں اترا میں نہ موتی کہ میں ہیں اکبہ چیز چاہئے پٹھانوں کا بھی ایک مکر سہرا یہ دونوں شر صاف ہیں معنی میں کسی قسم کی دقت نہیں ہے۔

جبکہ اپنے میں سماویں نہ خوشی کے مارے، گوندھے پھولوں کا بھلا پھر کوئی کیونکر سہرا  
 کھیل کا کھلنا گویا قبائے نکل کا جوشِ سترت سے چاک ہو جانا ہے۔ ایسی صورت  
 میں بہرے کا گوندھا جانا دشوار ہو گیا ہے۔

مُرخ روشن کی دمک گوہر غلطاں کی چمک کیوں نہ دکھلائے فروغِ نہ و اختر سہرا  
 مُرخ روشن کو فروغِ ماہ سے اور گوہر غلطاں کو ستاروں کی چمک سے تعبیر کیا ہے  
 باقی شعر کا مطلب صاف ہے۔

تارِ ریشم کا نہیں ہے یہ رگِ ابرہہ سہرا لائے گاتاب گر انباری گوہر سہرا  
 فرماتے ہیں۔ یہ ریشم کا تار نہیں ہے رگِ ابرہہ سہرا ہے۔ ریشم کا تار اتنے بُرے بُرے  
 موتیوں کو کب سنبھال سکتا ہے۔

ہم سخنِ فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں دیکھیں اس سہرے سے کدے کوئی بڑھ کر سہرا  
 نوابِ زینت محل کو بادشاہ کے مزاج میں بہت دخل تھا۔ میرزا جواں بخت  
 ان کے بیٹے تھے اور باوجودیکہ بہت مُرشد نادوں سے چھوٹے تھے، مگر بیگم کی خاطر  
 سے ان کی وسیعہ کی لے کو شش کر رہے تھے۔ ان کی شادی کا موقعہ آیا۔ بڑی  
 دھوم دھام کے سامان ہوئے بیگم کی ایما سے غالب مرحوم نے یہ سہرا کہہ کر زہرِ تنگوار  
 کاغذ پر لکھ کر ایک سونے کی کشتی میں رکھ کر بڑے تکلف کے ساتھ حضور میں گزارا۔  
 جب سہرے کو ملاحظہ فرمایا تو مقطع کو دیکھ کر حضور کو بھی خیال بلکہ ٹال ہوا۔  
 استاد مرحوم جو حسبِ معمول حضور میں گئے تو وہ سہرا دیا کہ استاد اسے تو دیکھو۔ انھوں نے  
 پڑھا اور بموجبِ عادت کے غرض کی پیر و مُرشد دُرست بادشاہ نے کہا تم بھی ایک  
 سہرا کہو۔ غرض کی بہت خوب۔ پھر فرمایا کہ ابھی لکھ دو، اور کہا مقطع کو بھی دیکھا عرض  
 کی حضور دیکھا۔ غرض بیٹھ گئے اور عرض کیا۔

اے جواں بخت مبارک تجھے سر پر سہرا آج ہے یمن و سعادت کا ترے سر سہرا

آج وہ دن ہے کہ لائے دُرِ انجم سے فلک  
 تابشِ حسن سے مانند شعلہٴ خورشید  
 وہ کئے صلی علیٰ یہ کئے سبحان اللہ  
 تابنے اور بنی میں رہے اخلاصِ بہم  
 دھوم ہے گلشنِ آفاق میں اس سرے کی  
 روئے فرخ پہ جو ہیں تیرے برستے انوار  
 ایک کو ایک پہ تزیں ہے دم آرائش  
 ایک گہری نہیں صد کانِ گہریں چھوڑا  
 پھرتی خوشبو سے ہوا ترائی ہوئی باد بہار  
 سر پہ طرہ ہے مزین تو گلے میں بدھی  
 رونمائی میں تجھے دے مہ و خورشیدِ فلک  
 کثرتِ تارِ نظر سے ہے تماشا یوں کے  
 دُرِ خوش آبِ مضامین سے بنا کر لایا  
 جن کو دعویٰ ہو سخن کا یہ سدا و اُن کو  
 اربابِ نشاطِ حضور میں لازم تھیں اسی وقت انھیں ملا اور شہر کی گلی گلی کو چہ کوچہ  
 میں پھیل گیا۔ میرزا بڑے ادا شناس تھے سمجھے کہ کیا تھا کچھ اور ہو گیا کچھ اور۔ یہ  
 قطعہ لکھ کر حضور میں گزارنا، سب طرف تفریض ہوئیں رازِ خمس العلماء، مولانا آزاد  
 مولف آبِ حیات و دیوانِ ذوق وغیرہ۔

## قطعہ معذرت

منظور ہے گزارش احوال واقعی اپنا بیان حسن طبیعت نہیں مجھے  
فرماتے ہیں۔ واقعی حال گزارش کرنا چاہتا ہوں۔ مجھ کو اپنے حسن طبیعت کا  
بیان کرنا منظور نہیں ہے۔

موتِ پشت سے ہے پیشہ آبِ پیہ گری کچھ شاعری ذریعہ عزت نہیں مجھے  
فرماتے ہیں۔ اہل سیف کی عزت و توقیر اہل قلم کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہوتی  
ہے اور میرا موروثی پیشہ سپہ گری ہے اور یہی میرا باعث عزت ہے۔ کچھ شاعری کو میں  
اپنی عزت کا سبب نہیں سمجھتا۔

آزادہ روہوں اور مرا مسلک صلح نکل ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے  
فرماتے ہیں۔ میں آزاد و روش کا انسان ہوں اور میرا طریقہ صلح نکل ہے۔ میں کبھی  
کسی سے عداوت نہیں رکھتا۔

کیا کم ہے یہ شرف کہ ظفر کا غلام ہوں مانا کہ جاہ و منصب و ثروت نہیں مجھے  
فرماتے ہیں۔ یہ شرف میرے لئے کیا کم ہے کہ میں ظفر کا غلام ہوں۔ پھر کیا دیوانہ ہوں  
کہ شاعری کو عزت کا ذریعہ سمجھوں۔ اس بات کو میں مانتا ہوں کہ اور غلاموں کی طرح  
مجھ کو ثروت و منصب حاصل نہیں ہے۔ نہ ہو۔ مجھ کو کچھ اس کا افسوس بھی نہیں۔

استاد شہ سے ہو مجھے پر خاش کا خیال یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے  
اس شعر کا مطلب صاف ہے۔

جامِ جاں نما ہے شہنشاہ کا ضمیر سو گند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے  
میں کون اور رنجیتہ ہاں اس سے مدعا جز انبساط خاطر حضرت نہیں مجھے  
فرماتے ہیں۔ مجھ کو رنجیتہ گوئی سے کیا واسطہ۔ اردو شعر کہاں، میں کہاں۔ مجھ کو

اگر بے توقاری زبان میں شمرنے کا شوق ہے۔ یہ تو صرف حضور کے خوش کرنے کا  
 رُود میں غزل وغیرہ لکھ لیا کرتا ہوں۔ چنانچہ  
 سہرا لکھا گیا ز رہ امتثال امر دیکھا کہ چارہ غیر اطاعت نہیں مجھے  
 حضور کے حکم سے سہرا میں نے لکھا ہے جب یہ دیکھا کہ سوائے اطاعت کے یعنی  
 حکم بجا لانے کے مجھے چارہ ہی نہیں ہے۔

مقطع میں آپ کی ہے سخن گسترانہ بات مقصود اس سے قطع محبت نہیں مجھے  
 فرماتے ہیں۔ اس سہرے کا قطع جو میں نے یہ لکھا ہے۔

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں دیکھیں اس سہرے سے کہ کوئی بہتر سہرا  
 یہ ایک شاعرانہ بات ہے۔ اس سے میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں دوستانہ مرام  
 قطع کر دوں۔

روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیہ سودا نہیں جنوں نہیں وحشت نہیں مجھے  
 فرماتے ہیں۔ میں نے اگر کسی پر چوٹ کی ہو تو کالامتھ ہو میں دیوانہ نہیں ہوں۔

مجھ کو جنون نہیں ہے میں انسان ہوں۔ ذی عقل ہوں۔ وحشی جانور نہیں ہوں۔  
 قسمت بُری سہی طبیعت بُری نہیں ہے شکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے  
 فرماتے ہیں۔ میں بہر قسمت ہوں۔ بہر طینت نہیں ہوں۔ یہ شکر کی بات ہے کہ مجھ کو  
 کسی بات کی شکایت نہیں ہے۔

صادق ہوں اپنے قول میں غالبؔ کو گواہ کتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے  
 فرماتے ہیں۔ اے غالب میں تھدا کو گواہ کر کے کتا ہوں کہ میں صادق القول شخص  
 ہوں اور میں جو کچھ کتا ہوں یعنی کہہ رہا ہوں وہ سچ کہہ رہا ہوں مجھ کو جھوٹ کی  
 عادت نہیں ہے۔

## مدح

نصرت الملک بہادر مجھے بتلا کہ مجھے تجھ سے جو اتنی ارادت ہے تو کس بات ہے  
 فرماتے ہیں۔ اے نصرت الملک بہادر مجھ کو جو تجھ سے اس قدر ارادت ہے۔ میں  
 حیران ہوں کہ یہ کس وجہ سے ہے یعنی انعام و احسان کی وجہ سے جو ارادت ہوا کرتی ہے  
 اس میں روحانی تعلق خاطر کی جھلک نہیں ہوا کرتی۔ محبت قلبی دوسری شے ہے اور  
 بغیر احسان مندی کے قدرتی طور سے دل میں پیدا ہو جایا کرتی ہے عجیب بلیغ شعر  
 لکھا ہے جس کی تعریف نہیں ہو سکتی۔

گرچہ تو وہ ہے کہ ہنگامہ اگر گرم کرے رونقِ بزمِ مہر تری ذات ہے  
 فرماتے ہیں۔ اگرچہ تو وہ ہے کہ اگر دربار آراستہ کرے تو بزمِ مہر کو بھی تیری  
 ذات سے رونقِ حاصل ہو جائے۔

اور میں ہر دل اگر جی میں بھی غور کروں غیر کیا خود مجھے نصرت مری اوقات سے  
 فرماتے ہیں۔ تیری خوبیوں کا موازنہ جب اپنی ذات سے کرتا ہوں تو سمجھ لیتا ہوں  
 کہ مجھ سانگ آفرینش تیرے لطف و عنایت کا سزاوار نہیں ہے۔ غیر تو غیر مجھ کو  
 خود اپنی اوقات سے نصرت پیدا ہو گئی ہے۔

خستگی کا ہو بھلا جس کے سبب سے دستِ نسبت اک گوہِ مرے دل کو تے ہات سے  
 فرماتے ہیں۔ میری خستہ دلی کا بھلا ہو جس کے سبب سے سرِ دست تیری  
 دترہ نوازی کی بدولت مجھ کو بھی تجھ سے ایک شکر گزاری کا تعلق پیدا ہو گیا ہے۔  
 مطلب یہ ہے کہ مصیبت زدہ شخص ہوں اور تو مصیبت زدہ آدمیوں کی امداد  
 کا فخر کر رہے۔

ہاتھ میں تیرے لیے تو سنِ دولت کی عنایت یہ دُعا شام و سحر قاضیِ حاجات ہے

فرماتے ہیں تیرے دستِ نبردست میں تو سن دولت کی باگ رہے صبح و شام  
 قاضی الحاجات کی درگاہ میں یہ دعا کیا کرتا ہوں۔  
 تو سکندر رہے مرا فخر ہے، ملنا تیرا، گو شرفِ خضر کی بھی مجھ کو ملاقات ہے  
 تو میرا سکندر رہے۔ مجھ کو تجھ سے مل کر فخرِ حال ہوتا ہے اگرچہ حضرت خضر کی بھی ملاقات  
 سے مجھ کو شرفِ حال ہوتا ہے۔ یہ اشارہ خضر و سکندر کے مشہور قصہ کی طرف ہے۔  
 اس پہ گزرے نہ گماں ریا و ریا کارِ زنا، غائبِ خاکِ نشیں اہلِ خرابات سے ہے  
 فرماتے ہیں۔ تمکاری و ریاکاری کے واسطے اہلِ اصلاح و تقویٰ مخصوص ہیں۔ غائبِ  
 خاکِ نشیں زندانِ خرابات سے ہے جن کا ظاہر و باطن یکساں ہوتا ہے قریب و دُور  
 جانتے ہی نہیں۔

قطعہ

ہے چہارِ شنبہ آخرِ ماہِ صفر چلو رکھ دیں جن میں بھر کے نئے مشکبوی ناند  
 فرماتے ہیں سچ آخری چہارِ شنبہ ہے۔ سبزہ روزِ نہ کے لے باہم مل کر احباب  
 آتے ہیں۔ ہم بھی جن میں سے مشکبوی ناند بھر کر رکھ دیں۔  
 جو آئے جامِ بھر کے پئے اور ہو کے مست سبزے کو روندتا پھر پھولوں گے بچا  
 جو شخص آئے ایک جامِ بھر کے پی لے اور مست ہو کے سبزے کو روندے اور  
 پھولوں پر سے کود جائے۔

غائب یہ کیا یاں ہے بجز مدحِ بادشاہ بھاتی نہیں اب مجھے کوئی نوشتِ خواہ  
 فرماتے ہیں۔ اے غائب اس قطعہ کی تشبیہ میں تو فضول باتیں کیا لکھ رہا ہے۔  
 تشبیہ کو چھوڑ کر فوراً مدح کی طرف متوجہ ہو جلد مجھ کو بجز مدحِ بادشاہ کے اور  
 کوئی بات پسند نہیں آتی۔  
 جیتے ہیں سونے روپے کے چھلے حضور میں ہے جن کے آگے یکم و نہر ہر ماہ ماند



فرماتے ہیں۔ آج کے دن بادشاہ کے دربار میں سونے چاندی کے چھپتے، عمل سے دم کئے ہوئے پانی میں بچھا کر تقسیم کئے جاتے ہیں اور وہ چھپتے ایسے آب و تاب کے ہوتے ہیں کہ جن کے سامنے مہر و ماہ کا یوم و زہر بھی چمک دمک نہیں دکھاسکتا۔ دھوپ کا سُٹری رنگ مانا گیا ہے اور چاندی کا سفید۔ چنانچہ کسی شاعر کا مصرع ہے۔ ع

چاندنی چاندی کا پتر دھوپ سونے کا ورق

یوں سمجھئے کہ بیچ سے خالی کئے ہوئے لاکھوں ہی آفتاب ہیں اور بیشمار چاند فرماتے ہیں۔ ان سونے چاندی کے پھٹوں کو یہ سمجھنا چاہئے کہ اگر بیچ سے خالی نہ ہوتے تو گریبا لاکھوں آفتاب اور بے شمار چاند تھے۔

## در مدح شاہ

اے شاہِ جاگیر، جہاں بخش، جہاں بخش، جہاں بخش، ہر دم تجھے صد گونہ بشارت میرزا صاحب نے اس شعر میں بادشاہ کی تین صفتیں بیان کی ہیں۔ پہلی صفت جہانگیری، دوسری صفت جہاں بخشی، تیسری صفت جہانزاری۔ فرماتے ہیں۔ یہ صفیں نبی کو اسی وجہ سے حاصل ہو گئی ہیں کہ تجھے ہر کام کرنے کے لئے غیب سے بشارت ہو جاتی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ تیرا ہر ارادہ پورا ہو جاتا ہے اور کسی کام میں ناکامی کا دخل نہیں ہوتا۔

جو عقدہ دشوار کہ کوشش سے نہ وا ہو تو وا کرے اس عقدے کو سو دیکھی ہر اشارت فرماتے ہیں۔ تیرے اقل سے ایک اشارے سے وہ مشکل حل ہو جاتی ہے جو برسوں کی کوشش سے بھی حل نہیں ہو سکتی۔

مکمل ہے کہ خضر سکندر سے ترا ذکر اگر لب کو نہ دے چشمہ حیوان سے طہارت فرماتے ہیں۔ لیکن نہیں ہے کہ حضرت خضر سکندر سے تیرے عز و جاہ کا ذکر فرمائیں اور

پہلے آب حیات سے کلیاں نہ کر لیں۔

آنحضرت کو سلیمان کی وزارت شرف تھا ہے فخر سلیمان جو کہ تیری وزارت فرماتے ہیں۔ آنحضرت کو حضرت سلیمان کا وزیر بن کر شرف حاصل ہو گیا تھا۔ اگر حضرت سلیمان تیری وزارت کا کام انجام دیں تو ان کے لئے باعثِ فخر ہے۔

ہے نقشِ مریدی تیرا فرمانِ الہی! ہے داغِ غلامی ترا تو قیغِ امارت فرماتے ہیں۔ تجھ سے ارادت رکھنی اور تیری فرمانبرداری حکمِ الہی کے سواتی ہے اور جس کو تیرا داغِ غلامی نصیب ہو گیا اس کو گویا میری کی سند حاصل ہو گئی۔

تو آب سے گر سلب کرے طاقتِ سیلاں تو آگ سے گر دفع کرے تابِ شرارت ڈھونڈے نہ ملے موجبِ دریا میں روانی باقی نہ رہے آتشِ سوزاں میں حرارت لطف و شہرتِ مقرب ہے۔ یعنی اگر تو یانی سے اس کے بسنے کی طاقت کو سلب کرے تو موجبِ دریا میں روانی باقی نہ رہے۔ اور اگر تو اس آگ سے اس کی گرمی کو دفع کر دینا چاہے تو جلتی ہوئی آگ میں گرمی باقی نہ رہے۔

ہے گرچہ مجھے نکتہ سرائی میں تو غل ہے گرچہ مجھے کھر طرازی میں مہارت کیونکر نہ کروں مح کو میں ختمِ دُعا پر قاصر ہے ستائش میں تیری میری عبارت فرماتے ہیں۔ باوجودِ دیکھ میں بہت متشاق شاعر ہوں اور بہت بڑے مضمون کو

تھوڑی عبارت اور کم لفظوں میں ادا کر سکنے پر قادر ہوں لیکن تیرے اوصاف بیان کرنے میں میں بھی قاصر ہو جاتا ہوں۔ اس لئے مجبور ہو کر مح کو دُعا پر ختم کرنا ہوتا۔

نورِ روزِ آج اور وہ دن ہے کہ ہو گئیں نظارِ گی صنعتِ حقِ اہلِ بصارت فرماتے ہیں۔ آج جشنِ نورِ روز کا دربار ہے اور تماشاخانے چشمِ بصیرت سے اللہ تعالیٰ کی صنعتِ تخلیق کو دیکھ رہے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تیرے چہرہ انور کی زیارت سے مشغول ہوئے ہیں۔

تجھ کو شرفِ مہر جہاں تابِ مبارک غالب کو ترے عقیدہِ عالی کی زیارت  
فرماتے ہیں۔ تجھ کو شرفِ آفتابِ مبارک ہو اور غالب کو تیری زیارت۔

قطعہ  
افطارِ صوم کی کچھ اگر دستگاہ ہو اس شخص کو ضرور ہے روزہ رکھا کرے  
جس پاس روزہ کھول کے کھانے کو کچھ نہ ہو روزہ اگر نہ کھائے تو ناچار کیا کرے  
میرزا ایک خط میں لکھتے ہیں کہ یہ قطعہ بھی رمضان کے مہینے میں بادشاہ کے حضور  
میں پڑھا گیا تھا جس کو سن کر بادشاہ اور شہام مصاحبین جو دریا میں موجود تھے  
بے اختیار ہنس پڑے (از یادگار غالب)

قطعہ

یہ وہ قطعہ ہے جو میرزا نے بادشاہ کے حضور میں اس درخواست سے گزرا نا  
تھا کہ ان کی تنخواہ جو ششماہی گزرنے پر اٹھی چھ مہینے کی ملا کرتی تھی وہ ماہ ماہ  
ملا کرے، چنانچہ اس درخواست کے موافق تنخواہ ملنے لگی تھی (از یادگار غالب)  
اے شہنشاہِ آسماں اور نگ  
تھامیں اک ہینوائے گوشہ نشین  
تم نے مجھ کو جو آبرو بخشی!  
کہ ہوا مجھ سا ذرہ ناچیز  
گر یہ از روئے تنگ بے ہنری  
کہ گزائے کہ میں کہوں خاکی  
شاد ہوں لیکن اپنے جی میں کہ ہوں  
خانہ زاد اور مرید اور مداح  
بادشاہ کی ملازمت سے پہلے بھی میرزا کی آمد و رفت قطعہ میں جاری تھی۔

اور مدحیہ قصیدے برابر بادشاہ کے ہاں گزرتے تھے اور خلعت پاتے تھے۔

بارے نوکر بھی ہو گیا صد شکر  
نہ کہوں آپ سے تو کس سے کہوں  
پیرو مرشد اگرچہ مجھ کو نہیں  
کچھ تو جاڑے میں جاسے آخر  
کیوں نہ درکار ہو مجھے پوشش  
کچھ خریدا نہیں ہے اب کے سال  
رات کو آگ اور دن کو دھوپ  
آگ تاپے کہاں تلک انسان !  
دھوپ کی تابش آگ کی گرمی  
میری تنخواہ جو مقرر ہے  
رسم ہے مُردہ کی چھ ماہی ایک  
مجھ کو دیکھو تو ہوں بقیہ حیات  
بسکہ لیتا ہوں ہر مہینے قرض  
میری تنخواہ میں تمہائی کا  
آج مجھ سا نہیں زمانے میں  
رزم کی داستان گر سُنئے  
بزم کا التزام گر کیجئے  
ظلم ہے گر نہ دو سُن کی داد  
آپ کا بندہ اور پھروں ننگا  
میری تنخواہ کیجئے ماہ ب ماہ

نسبتیں ہو گئیں مشخص چار  
مدعاے ضروری الاظہار  
ذوق آرائش سرود و ستار  
تا نہ دے باد زمہریر آزار  
جسم رکھتا ہوں ہے اگرچہ نزار  
کچھ بنایا نہیں ہے اب کی بار  
بھاڑ میں جاکیں ایسے لیل و نہار  
دھوپ کھلے کہاں تلک جاندار  
وقتِ رہتا عذابِ انار  
اُس کے ملنے کا ہے عجب ہنار  
خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار  
اور چھ ماہی ہو سال میں دو بار  
اور رہتی سے سود کی تکرار  
ہو گیا ہے شریک سا ہوکار  
شاعرِ نفز گوئے خوش گفتار  
ہے زباں میری تیغ جو ہر دار  
ہے قلم میرا ابر گوہر بار  
قہر ہے گر کرو نہ مجھ کو پیار  
آپ کا نوکر اور کھاؤں اُدھار  
تا نہ ہو مجھ کو زندگی دُشوار

ختم کرتا ہوں اب دُعا پہ کلام  
شاعری سے نہیں مجھے سرودگار

شاعری سے مراد یہاں صنعت شاعرانہ ہے۔ چونکہ یہ قطعہ میرزا نے اپنی خاص طرز کے خلاف بہت سیدھا سادہ لکھا ہے تو دُعا بھی ایسی ہی سیدھی سادی ہے جس میں کسی طرح کی صنعت شاعرانہ نہیں ہے (از یادگار غالب)

تم سلامت رہو ہزار برس ہزار برس کے ہوں دن پچاس ہزار

قطعہ

سیہ گلیم ہوں لازم ہے میرا نام نہ لے جہاں میں جو کوئی فتح و ظفر کا طالب ہے  
ہوا نہ غلبہ میسر کبھی کسی پہ مجھے کہ جو شریک ہو میرا شریک غالب ہے  
شریک غالب اس شریک کو کہتے ہیں جس کا حصہ دوسرے شریکوں سے  
غالب ہو۔ شریک غالب کے لفظ میں جو لطف ہے وہ ظاہر ہے (از یادگار غالب)

قطعہ

سہل تھا سہل لے یہ سخت مشکل پڑی مجھ پہ کیا گزری گی اتنے روز حاضر ہی ہوئے  
تین دن سہل سے پہلے تین دن سہل کے بعد تین سہل تین بریدیں یہ سب کے دن ہوئے  
ایک شعر میں سہل کے دن تمام دنوں کی تفصیل جن میں حکیم چلے پھرنے کو  
منع کرتے ہیں کس عمدگی سے بیان کی ہے۔ یہ قطعہ دربار کی غیر حاضری کے عذر میں لکھا  
ہے۔ (از یادگار غالب)

قطعہ رتاریک

خجستہ انجمن طوئے میرزا جعفر کہ جس کا دیکھے سے سب کا ہوا ہے جی محفوظ

ہوئی ہوا ایسے ہی فرخندہ سال میں غالب نہ کیوں ہو مادہ سال عیسوی مخطوطا  
۱۸۵۳ء

طوائف کے سنی بیاہ کے ہیں۔ شاہزادہ میرزا جعفر کی تاریخ لکھی ہے۔ مادہ مخطوط  
۱۸۵۳ء نو نکلتا ہے

## ایشا

ہوئی جب میرزا جعفر کی شادی ہوا بزم طرب میں قصہ ناہید  
کہا غالب سے تلیخ اسکی کیا ہے تو بولا "انشر ارجش حبشید"

منشہ

## قطعہ

گو ایک بادشاہ کے سب خانہ زاد ہیں دربار دار لوگ بہم آشنا نہیں  
کانوں پہ ہاتھ رکھتے ہیں کہ تے ہوئے سلام اس سے ہے یہ مراد کہ ہم آشنا نہیں  
بادشاہ کے دربار کا یہ ادب تھا کہ آپس میں جو وہاں ایک دوسرے کو سلام کہتے  
تھے تو ماتھے پر ہاتھ رکھنے کی جگہ دیا یا ہاتھ دائیں کان پر رکھ لیتے تھے، چونکہ اردو  
محاورہ میں کانوں پر ہاتھ دھرنے کے یہ معنی ہیں کہ ہم آشنا نہیں۔ اس سے میرزا نے  
اس کو اس پیرایہ میں بیان کیا ہے (از یادگار غالب)

## رباعیات

بعد از اتمام بزم عید اطفال آیام جوانی رہے ساغر کش حال  
آپہنچے ہیں تا سواد اقلیم عدم اے عمر گزشتہ یک قدم استقبال  
اس رباعی میں میرزا صاحب نے عمر گزشتہ کو واپس پلٹ آنے کی ہدایت

فرمائی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اسے عمر گزشتہ تو جہاں ہے۔ اسی اقلیم کے قُرب و جوار میں ہم بھی آپہنچے ہیں۔ ہمارے استقبال کے لئے ایک قدم تو بھی واپس چلی کہ شاید تیرے واپس آنے سے دو چار دن کے لئے شباب رفتہ بھی واپس آجائے۔

### رباعی

شبِ لعلِ مُخِ عرقِ نشاں کا غم تھا کیا شرح کروں کہ طرفہ تر عالم تھا  
رویا میں ہزار آنکھ سے صبح تلک ہر قطرۂ اشک دیدہ کُہ نم تھا  
فرماتے ہیں۔ رات کے وقت مجھ کو اس کی ٹریفیں اور مُخِ عرقِ نشاں یاد آ کر  
کچھ ایسی پریشانی پیدا ہو گئی تھی کہ بے اختیار آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور  
چونکہ زلف اور مُخ کا تصور تھا، اس لئے آنسو نے آنکھ کی سیاہی اور سفیدی  
پیدا کر لی تھی۔ گویا ہر آنسو میرا ایک آنکھ بن گیا تھا اس لئے ہزاروں آنکھوں سے  
ردِ بار ہا۔

### رباعی

آتش بازی ہے جسے شغلِ اطفال ہے سوزِ جگر کا بھی اسی طور کا حال  
تھا موجدِ عشق بھی قیامت کوئی لڑکوں کے لئے گیا ہے کیا کھیل نکال  
فرماتے ہیں۔ آتش بازی جس طرح بچوں کا کھیل ہے۔ اسی طرح معشوقانِ  
شکر کا سوزِ جگر عاشق کو دلچسپی کا باعث سمجھتے ہیں۔ موجدِ عشق بھی کوئی قیامت  
کا پھلا تھا جو ان معشوقوں کے لئے یہ ایجاد کر گیا ہے۔

### رباعی

دل تھا کہ جو جان درِ تمہید سی بیتابیِ رشک و حسرت دید سی  
ہم اور فسرِ دن اسے تجلیِ افسوس نکھڑا روا نہیں تو نجدِ سی  
فرماتے ہیں۔ کچھ روز پہلے ہمارے پہلو میں دل تھا۔ ہم دل رکھتے تھے جو زندگانی

پر درد کی ہفتیاں برداشت کر لیتے تھے۔ بیابانی خشک کو جھیلا اور زہرا کی حسرت بہا۔  
 انسوؤں کی بات یہ ہے کہ اب ہم ہیں اور افسردگی اور بے دلی۔ اسے تجلی طور پر تیری نگارناہنگی  
 اور محال ہے ترجمید ہی سہی کہ مجھ سے افسردہ دل کو پھر اسی سوز و گداز کی ہوس ہے، گو نگار  
 ہر شے کی محال ہے۔ یعنی معدوم کا اعادہ نہیں ہو سکتا۔ مگر سوز و گداز کا از سر نو پیدا  
 ہو جانا تو ناممکنات سے نہیں ہے۔

### رباعی

ہے خلق حسد قماش لڑنے کے لئے وحشت کدہ تلاش کرنے کے لئے  
 یعنی ہر بار صورت کا غنڈہ باد ملتے ہیں یہ بد معاش لڑنے کے لئے  
 فرماتے ہیں۔ یہ مخلوق جس نے اپنا شمار حسد و بغض کر لیا ہے، رات دن لڑنے  
 رہنے کے لئے پیدا ہوئی ہے اور وحشت کدہ تلاش یعنی تلاش معاش لڑنے کے  
 واسطے ہے۔ ٹٹکلوں اور گڈڑیوں کی طرح یہ بد معاش باہم ملتے ہیں۔ ملنے سے ان کی  
 مُراد اٹلی ہوتی ہے۔ جس طرح ٹٹکل اور گڈڑی آپس میں مل کر لڑتی ہے۔

### رباعی

دل سخت نثرند ہو گیا ہے گویا اس سے گلہ مند ہو گیا ہے گویا  
 پیر پار کے آگے بول سکتے ہی نہیں غالب مُنہ بند ہو گیا ہے گویا  
 فرماتے ہیں۔ دل نہایت غمگین ہو گیا، گویا، اور اس سے گلہ مند ہو گیا ہے۔  
 گویا باوجود ان دونوں باتوں کے یاد کے سامنے طاقت گویا باقی نہیں رہتی۔ گویا  
 غالب کا مُنہ بند ہو گیا ہے۔

### رباعی

دکھ جی کے پسند ہو گیا ہے غالب دل رنگ کر بند ہو گیا ہے غالب  
 واللہ کہ شب کو نیند آتی ہی نہیں سونا سو گند ہو گیا ہے غالب



اکثر دیوانوں میں اس رباعی کا مصرعہ ثانی ترک کرکھ دیا گیا ہے اور اس صورت میں دو حرف وزن سے بڑھ جاتے ہیں۔ باقی رباعی کے معنی صاف ہیں۔

### رباعی

مشکل ہے زبں کلام میرا اے دل سن سن کے اُسے سخنورانِ کامل  
آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمایش گویم مشکل و مگر نہ گویم مشکل  
اس اخیر کے مصرعہ میں دو معنی پیدا ہو گئے ہیں۔ ایک یہ کہ اگر ان کی فرمایش  
پوری کر دوں اور آسان شعر کہوں تو یہ مشکل ہے کہ اپنی طبیعت کے اقتضا کے خلاف  
ہے اور آسان نہ کہوں تو یہ مشکل ہے کہ وہ بڑا مانتے ہیں۔ اور دوسرے معنی یہ ہیں  
کہ اس باب میں صاف صاف بات کہتا ہوں تو سخنورانِ کامل کی نافرمانی و کینہ و دشمنی  
ظاہر کرنی پڑتی ہے اور اگر صاف صاف نہ کہوں تو آپ ملزم ٹھہرتا ہوں۔ پس  
ہر طرح مشکل ہے۔ (از یاد نگار غائب)

### قطعہ

بھیجی ہے جو مجھ کو شاہِ حجاز نے دال بے لطف عنایاتِ شہنشاہ پہ دال  
یہ شاہ پسند دال بے بحث و جدال ہے دولتِ دین و دانش داد کی دال  
بادشاہ کے اہلِ موہج کی دال پکا کرتی تھی جو بادشاہ پسند کہلاتی تھی یہ بائی  
اس کے شکر میں نہیں گئی ہے۔

### رباعی

ہیں شہ میں صفاتِ ذوالجلالی باہم آثارِ جلالی و جمالی باہم  
ہوں شاہ نہ کیوں سا فلِ عالی باہم ہے اب کے شبِ قدر و دیوالی باہم  
فرماتے ہیں۔ دیوالی کی نسبت پرستی مرتبہ سا فل ہے اور شبِ قدر کی عبادت درجہ  
عالی ہے۔

## قطعہ

حق شہ کی بقا سے خلق کو شاد کرے    شاہ شیوع دانش و داد کرے  
یہ دی جو گئی ہے رشتہ عمر میں گانٹھ    ہے صفر کہ افزائش اعداد کرے

## رباعی

اس رشتہ میں لاکھ تار ہوں بلکہ سوا    اتنے ہی برس شمار ہوں بلکہ سوا  
ہر سیکڑہ کو ایک گرہ فرض کریں    ایسی گرہیں ہزار ہوں بلکہ سوا  
یہ دونوں رباعیاں بادشاہ کی ساگرہ کی مبارک باد میں لکھی گئی تھیں۔ دونوں  
بے مثل طریقہ سے۔ دونوں رباعیوں میں ترقی عمر کی دُعائیں دی گئی ہیں۔

## رباعی

کہتے ہیں کہ اب وہ مردم آزار نہیں    عشاق کی پریش سے اسے عار نہیں  
جو ہاتھ کہ ظلم سے اٹھایا ہو گا    کیونکر مانوں کہ اس میں تلوار نہیں  
کسی کام کے ہاتھ اٹھانے کو یا اس کام سے دست بردار ہونا اور دوسرے  
سنی ہاتھ اٹھانے کے ہیں کہ مارنے کے لئے ہاتھ اٹھانا۔

## رباعی

ہم گرچہ بنے سلام کرنے والے    کرتے ہیں درنگ کام کرنے والے  
کہتے ہیں کہیں خدا سے اللہ اللہ    وہ آپ ہیں صبح و شام کرنے والے  
اس رباعی میں میرزا نے غایت درجہ کی شوخی کی ہے جو بالکل اچھوتی اور نئی  
طرح کی ہے۔ کتاب کے ہم ہر چند دربار کے با اختیار لوگوں کو جھک جھک کر سلام  
کرتے ہیں، مگر وہ ہماری کارروائی میں درنگ و سست و سل کرتے ہیں۔ ہم اپنے دل میں  
کہتے ہیں کہ اے خدا ہی سے کہیں۔ پھر یہ خیال آتا ہے کہ اللہ اللہ کر۔ وہ تو آپ ہی صبح

دشام کرنے والے ہیں۔ صبح و شام کرنا لیت و نعل کرنے کو کہتے ہیں۔ چونکہ صبح کو شام کرنا اور شام کو صبح کرنا خدا کا کام ہے تو خدا کی نسبت کہا جاسکتا ہے کہ وہ صبح و شام کرنے والے ہیں مگر شاعر کا اصل مقصود یہی ہے کہ کارروائی و خلق میں جیسی لیت و نعل وہاں ہوتی ہے ایسی کمیں نہیں ہوتی کہ اکثر ساری عمر اسید ہی میں گزر جاتی ہے اور مطلب حاصل نہیں ہوتا (از یادگار غالب)

### رباعی

سامان خور و خواب کہاں سے لاؤں آرام کے اسباب کہاں سے لاؤں  
روزہ مرا ایمان ہے غالب لیکن خستہ زبر و برف آب کہاں سے لاؤں  
یہ رباعی بھی اسی قلم کے ساتھ جس میں روزہ کا مضمون باغدھا ہے۔ دربار  
پیش کی تھی تھی۔

### رباعی

ان یم کے بیجوں کو کوئی کیا جانے بیجے ہیں جو ارغماں شبہ والے  
رگن کر دیوں گے ہم دعا میں توبہ فیروزہ کی تسبیح کے ہیں یہ دانے  
بادشاہ نے یم کے بیجوں کا سان بیجا اس کے شکریہ میں یہ رباعی کہی ہے  
بڑا فیروزہ جو بیضوی شکل کا ہوتا ہے وہ یم کے بیج سے بہت مشابہ ہوتا ہے۔  
(از یادگار غالب)

### رباعی

رقعہ کا جواب کیوں نہ بھیجا تم نے ثاقب حرکت یہ کی ہے بجا تم نے  
حاجی کلو کو دیکے بے وجہ جواب غالب کا پکا دیا کلیجا تم نے  
ایضاً  
اے روشنی دیدہ شہاب الدین خاں کتھا ہے بتاؤ کس طرح سے رہا

ہوتی ہے تراویح سے فرصت کب تک سُنتے ہو تراویح میں کتنا قرآن  
 میرزا صاحب نے یہ دونوں رُباعیاں شباب الدین احمد خلیل المتخلص بِہُجَّتِ  
 خلف نواب ضیاء الدین احمد خاں بہادر المتخلص بہ نیر درخشاں کو لکھ کر بھیجی تھیں۔  
 حضرت قنات میرزا صاحب کے بہت عزیز شاگرد تھے اور فارسی بھی میرزا صاحب  
 سے پڑھی تھی۔ علاوہ شاگردی کے قرابت بھی رکھتے تھے۔ افسوس ہے کہ عہد جوانی  
 میں انتقال فرما گئے۔

تمام شد

—•••—